۱۹۹۴ گل 16

آج

ترتیب: اجمل کمال

گابریئل گارسیا مارکیز — فہمیدہ ریاض — رگھوویر سہائے

ثروت حسین — نیر مسعود — حسن منظر

سید محمد اشرف — اکرام اللہ — مظفر علی سید

سیمون دُ بووار — وجے تینڈولکر

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

آج

جولائی - ستمبر ۱۹۹۳

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۳۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰
فون: ۸۱۱۳۳۷۳

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

منٹو: سنسرشپ کا نشانہ

بہار ۱۹۹۳ کے شمارے میں "آج" کے پڑھنے والوں کو یہ خوش خبری سنائی گئی تھی کہ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کا اردو نصاب مرتب کرنے والوں نے گیارھویں جماعت کے نظرِ ثانی شدہ نصاب "گلزارِ اردو" (حصہ اول) سے پریم چند کو خارج کر دیا ہے اور خواجہ حسن نظامی کے مضمون میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے ہمارے قومی تقاضوں سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اسی نظرِ ثانی شدہ نصاب "گلزارِ اردو" کا حصہ دوم جولائی ۱۹۹۴ میں شائع ہوا ہے جس سے بارھویں جماعت کے طفلانِ قوم کا کام تمام کیا جائے گا۔ اس گلزارِ اردو کی سیر کچھ نئے گلوں سے روشناس کراتی ہے۔

سب سے بڑا اور دل خوش کن انکشاف یہ ہے کہ ہمارا ملک اب فنِ افسانہ نگاری پر عبور رکھنے والے ایسے جغادریوں کے سلسلے میں خود کفیل ہو گیا ہے جو سعادت حسن منٹو تک کے افسانے میں موزوں قطع و برید کرنے پر قادر ہیں۔ منٹو اگر مر نہ گیا ہوتا تو ان بابایانِ اردو کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کر کے دو چار کام کی باتیں سیکھ سکتا تھا۔ کیا عجب کہ اس نے فنِ افسانہ نگاری کے تمام رموز اپنے سینے میں لے کر دفن ہو جانے کو ایسے ہی کسی اندیشے سے ترجیح کے قابل سمجھا ہو۔

اردو کے ان پیشہ ور محسنوں نے منٹو کو کسی نامعلوم سبب سے پس مرگ اعزاز کا مستحق جان کر اس کا ایک شاہکار افسانہ "نیا قانون" مذکورہ گلزار میں شامل کر لیا ہے۔ یہ کم و بیش اتنا ہی بڑا کرشمہ ہے جتنا یہ کہ چودھری محمد حسین نامی ایک مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک کی بے اثری جاتی رہے۔ جس طرح اُن چودھری صاحب کا نام منٹو کے مجموعے "لذتِ سنگ" کے انتساب کا دو بار ہدف بننے کے باعث اردو ادب کی تاریخ میں زندہ ہے، اسی طرح امید ہے کہ ٹیکسٹ بک بورڈ کے ان تنگ حال ملازموں کا نام بھی کم از کم اُس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس نصاب سے طالب علموں کے ذہن کا دف مارنے کا کام جاری ہے۔ اور اس کام کے موقوف ہونے کا مستقبل قریب میں کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

البتہ چودھری محمد حسینوں کی جانب سے سرکاری اعزاز کا مستحق قرار پانے والے پر کچھ شرائط بھی عائد ہوتی ہیں، اور ان شرائط کی پس مرگ تعمیل کراتے ہوئے ان محسن چودھریوں نے "نیا قانون" کے متن میں سے وہ تمام غیر ضروری حصے نکال دیے ہیں جو بارھویں جماعت کے طالب علموں کے لیے مضرِ صحت ہو سکتے تھے۔

اس احسان کے بوجھ سے اردو ادب کے پڑھنے والوں کے سر جھکے ہوئے ہیں، لیکن دو چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے: کیا خواجہ حسن نظامی اور سعادت حسن منٹو کی جسمانی غیر موجودگی کی بدولت تعلیم کا پیشہ کرنے والے ان بوجھ بجھکڑوں کو یہ حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ ان کی تحریروں پر دستِ سنسر دراز کر سکیں؟

دوسرا سوال اُن حضرات سے ہے جن کا خیال ہے کہ سنسرشپ کا قانون ۳۱ دسمبر ۱۹۸۱ کو ختم کر دیا گیا تھا۔ کیا واقعی؟ کیا یہ وہی پُرانا قانون نہیں ہے؟

اجمل کمال

ترتیب

گابریئل گارسیا مارکیز

۷

سفر بخیر، جناب صدر!

فہمیدہ ریاض

۳۲

آدمی کی زندگی

ورلڈ بینک

سول سرونٹ

رگھوویر سہائے

۳۸

بڑھو بڑھو جلدی بڑھو

رام داس   نشے میں دنیا   پیدل آدمی

Scanned with CamScanner

ثروت حسین

۴۴

دن نکلتا ہے   کاٹ دو اس پیڑ کو   کھل اٹھے پھول تم
ہوائے شب کے سامنے   سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملاح   بارشیں
صبح اترتی ہے شہر میں   پتھر کی چیخ   غبارے کی موت
شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے   سیب کے باغ میں خود کلامی
آگ مجھ کو سبز کر

۵۰

ریت

۵۳

آدمی اور بیل

۵۶

پانی کے گیت کا انجام

نیر مسعود

۵۹

پانی کے ماتم دار

حسن منظر

۷۳

بوڑھا گمرچہ

Scanned with CamScanner

سیّد محمد اشرف
۱۱۰
آدمی

۱۱۷
روگ

اکرام اللہ
۱۳۲
پشیمانی

مظفر علی سیّد
۲۰۲
ترجمے کی جدلیات

سیمون ڈُبووار
۲۱۳
ایک محبت کی کہانی (۳)

انتخاب

وِجے تیندولکر
۲۶۱

خاموش! یہ عدالت ہے

گابریئل گارسیا مارکیز

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

سفر بخیر، جنابِ صدر

وہ سنسان باغ میں زرد پتوں کے نیچے ایک چوبی بنچ پر بیٹھا، دونوں ہاتھ اپنی چھڑی کے نقرئی دستے پر رکھے، گرد آلود بطخوں کو تکتے ہوئے، موت کے بارے میں غور کر رہا تھا۔ جب وہ پہلی بار جنیوا آیا تھا تو یہ جھیل پُرسکون اور شفاف تھی، مرغابیاں اتنی مانوس تھیں کہ آ کر ہاتھ پر سے دانہ چگ لیتی تھیں، اور مستاجر عورتیں اپنے آرگنڈی ملبوسوں اور ریشمی چھتریوں کے ساتھ شام چھ بجے کی تصوراتی مخلوقات دکھائی دیتی تھیں۔ اب جہاں تک وہ دیکھ سکتا تھا، واحد ممکن عورت ویران گودی پر پھول بیچ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ باور کرنا مشکل تھا کہ وقت نہ صرف اس کی زندگی میں بلکہ پوری دنیا میں اس قدر تباہی پیدا کرنے پر قادر ہے۔

بھیس بدلے ہوئے نامور لوگوں کے اس شہر میں وہ بھی ایک ایسا ہی شخص تھا جس نے بھیس بدل رکھا تھا۔ وہ گہرے نیلے رنگ کا سوئی جیسی باریک دھاریوں والا سوٹ، بروکیڈ کی واسکٹ اور کسی ریٹائرڈ مجسٹریٹ کا سا اکڑا ہوا ہیٹ پہنے تھا۔ اس کی متکبر مونچھیں کسی بندوقچی کی سی تھیں، آبی مائل سیاہ بالوں میں رومانوی لہریں تھیں، انگلیاں کسی بربط نواز کی سی تھیں، بائیں ہاتھ کی انگوٹھی والی انگلی میں کسی ایسے شخص کی سی پتلی پٹی بندھی ہوئی تھی جس کی بیوی مر چکی ہو، اور آنکھیں مسرت سے لبریز تھیں۔ صرف اس کی جلد کی کسل مندی اس کی صحت کی اصل حالت کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس کی عمر تہتر برس تھی مگر اس کے باوجود اس کی خوش وضعی نمایاں تھی۔ لیکن اس صبح، وہ اپنے آپ کو ہر طرح کی خودنمائی کی دسترس سے باہر محسوس کر رہا تھا۔ جاہ و جلال اور

اقتدار کا زمانہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا تھا، اور اب فقط اس کی موت کا وقت باقی تھا۔

وہ دو عالمی جنگوں کے بعد جنیوا واپس آیا تھا تاکہ اُس درد کی حتمی تشخیص ہو سکے جس کو شناخت کرنے سے مارتینیک کے معالج قاصر رہے تھے۔ اس کا قصد یہاں دو ہفتے سے زیادہ ٹھہرنے کا نہ تھا، لیکن تھکا دینے والے ٹیسٹوں اور ان کے غیر حتمی نتائج میں چھ ہفتے گزر چکے تھے، اور ابھی ان کا اختتام دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انھوں نے اس درد کو اُس کے جگر میں، گردوں میں، لبلبے میں، پروسٹیٹ میں، غرض ہر اُس مقام پر تلاش کیا تھا جہاں وہ نہیں تھا۔ مگر یہ اس اذیت ناک جمعرات سے پہلے کی بات ہے جب اُس نے نیورولوجی کے شعبے میں صبح نو بجے ایک ایسے معالج سے ملاقات کا وقت لیا تھا جو اس کا معائنہ کرنے والے ڈاکٹروں میں سب سے کم معروف تھا۔ اُس کا کمرہ کسی راہب کی کوٹھری سے مشابہ تھا، اور ڈاکٹر خود پستہ قد اور سنجیدہ، اور اپنے داہنے ہاتھ کے ٹوٹے ہوئے انگوٹھے پر پلاسٹر چڑھائے ہوئے تھا۔ اُس کے روشنی بند کرتے ہی اسکرین پر ریڑھ کی ہڈی کا ایک روشن ایکسرے اُبھر آیا، لیکن صدر نے اسے اپنی ہڈی کے طور پر اُس وقت پہچانا جب ڈاکٹر نے ایک سلائی کے ذریعے کمر کے نیچے کے دو مُہروں کے جوڑ کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ کا درد یہاں ہے،" اس نے کہا۔

اُس کے لیے یہ بات اتنی سادہ نہ تھی۔ اس کا درد غیر یقینی اور پُر فریب تھا: کبھی اُسے اپنی داہنی پسلیوں میں محسوس ہوتا اور کبھی پیٹ کے نچلے حصے میں، اور اکثر اوقات اسے، بالکل غیر متوقع طور پر، رانوں کے جوڑ پر، اچانک آ لگنے والی برچھی کی طرح لگتا۔ ڈاکٹر اُس کی بات متاثر ہوئے بغیر سنتا رہا، اور اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی سلائی اسکرین پر بالکل ساکن رہی۔ "یہی وجہ ہے کہ اس کی تشخیص اتنے عرصے تک نہ ہو سکی،" وہ بولا۔ "مگر اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس درد کا مرکز اسی جگہ ہے۔" پھر اس نے اپنی انگلیاں اپنی کنپٹی پر رکھ لیں اور نہایت قطعیت سے کہا: "ویسے، جنابِ صدر، اصل میں تو ہر درد کا مرکز یہاں ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر کا معالجانی انداز اس قدر ڈرامائی تھا کہ اس کا آخری فیصلہ خاصا دردمندانہ معلوم ہوا: صدر کو ایک خطرناک اور ناگزیر آپریشن سے گزرنا ہو گا۔ اُس نے خطرے کے امکان کے بارے میں استفسار کیا، اور ڈاکٹر نے اسے غیر یقینی پن کی دُھند میں لپیٹ دیا۔ "ہم یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے،" اس نے جواب دیا۔

کچھ عرصہ پہلے تک، ڈاکٹر نے وضاحت کی، مہلک حادثات کا امکان بہت زیادہ ہوتا تھا، اور اس سے بھی زیادہ خطرہ کئی قسم اور مختلف شدت کے فالج کا تھا۔ لیکن دونوں جنگوں کے درمیانی عرصے میں ہونے والی طبی ترقی کے باعث یہ خطرات اب ماضی کی بات ہو گئے ہیں۔ "فکر مت کیجیے،" وہ آخر میں بولا۔ "اپنے معاملات کو درست کر کے ہم سے رابطہ قائم کیجیے۔ لیکن یہ مت

Scanned with CamScanner

بھولیے کہ آپریشن جتنی جلد ہو اتنا ہی بہتر ہے۔"

اس بری خبر کا سامنا کرنے کے لیے یہ کوئی اتنی اچھی صبح نہیں تھی، اور باہر کھلی فضا میں تو ہرگز نہیں۔ وہ ہوٹل سے سویرے ہی، اوور کوٹ لیے بغیر، نکل آیا تھا، کیوں کہ اُسے کھڑکی میں سے چمکتی دھوپ دکھائی دی تھی، اور بوسولیل کی سڑک سے، جہاں اسپتال واقع تھا، نپے تُلے قدم رکھتا ہوا، چوری چھپے محبت کرنے والوں کی اِس پناہ گاہ، باغِ انگلستان، میں آ پہنچا تھا۔ وہ گھنٹے بھر سے زیادہ دیر سے یہاں بیٹھا فقط موت کے بارے میں سوچ رہا تھا، کہ خزاں کا آغاز ہو گیا۔ جھیل کا پانی غصیلے سمندر کی لہروں کی طرح تہ و بالا ہونے لگا، اور ہوا کے سرکش جھکڑوں نے مرغابیوں کو خوف زدہ کر دیا اور بے بچے پتوں کو اڑا لے گئے۔ صدر اٹھ کھڑا ہوا، اور پھول بیچنے والی سے خریدنے کے بجائے ڈیزی کا ایک پھول عوامی باغ کی کیاری سے توڑ کر اپنے کاج میں لگا لیا۔ پھول بیچنے والی نے اُسے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا۔

"یہ پھول خدا کی ملکیت نہیں ہیں موسیو،" وہ تنک کر بولی۔ "یہ شہرداری کی ملکیت ہیں۔"

صدر نے اُسے نظرانداز کر دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا، اپنی چھڑی کو بیچ سے پکڑے اور کچھ کچھ دیر بعد ایک آزادہ روی کے ساتھ اُسے ہوا میں گھماتا، آگے چل دیا۔ موں بلاں کے پُل پر ہوا کے اچانک چلنے والے جھکڑوں سے پاگل ہوتے ہوئے وفاقی پرچم ممکنہ تیز رفتاری سے نیچے اتارے جا رہے تھے، اور کف آلود دلکش فوارے کو معمول سے پہلے بند کر دیا گیا تھا۔ صدر کو ساحل پر بنا ہوا کیفے پہچان میں نہ آیا جہاں وہ اکثر جا بیٹھتا تھا، کیوں کہ داخلے کے دروازے کے باہر لگا ہوا سائبان اُتار لیا گیا تھا اور موسمِ گرما میں بیٹھنے کے پھولوں بھرے دالان ذرا دیر پہلے بند کر دیے گئے تھے۔ اندر دن کے وقت روشنیاں جل رہی تھیں اور سازندے موتسارت کی ایک گت بجا رہے تھے جو کسی ہونی کی پیش گوئی سے پُر تھی۔ صدر نے کاؤنٹر پر گاہکوں کے لیے رکھے اخباروں کے ڈھیر میں سے ایک اخبار اٹھا لیا، ہیٹ اور چھڑی کو ریک پر ٹانگ دیا، سب سے تنہا میز پر جا کر سنہری رِم والا پڑھنے کا چشمہ لگا لیا، اور تب اُسے احساس ہوا کہ خزاں کا موسم آ پہنچا ہے۔ اس نے عالمی خبروں کے صفحے سے شروع کیا جس پر اُسے کبھی کبھار امریکی براعظموں کی کوئی خبر دکھائی دے جایا کرتی تھی، اور بیچ کے صفحوں سے گزرتا ہوا پہلے صفحے پر پہنچا؛ ویٹرس نے ایویاں واٹر کی بوتل اس کے پاس لا رکھی جو وہ روز پیتا تھا۔ اپنے معالجوں کے احکام پر عمل کرتے ہوئے اس نے کافی پینے کی عادت تیس سال پہلے ہی ترک کر دی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا: "اگر کبھی مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ میں مرنے والا ہوں تو دوبارہ کافی پینے لگوں گا۔" شاید وہ وقت آ گیا تھا۔

"ایک کافی بھی لے آؤ،" اس نے بے عیب فرانسیسی زبان میں حکم دیا۔ اور، اپنی بات کے دوہرے معنی کو محسوس کیے بغیر، اضافہ کیا: "اطالوی قسم کی، اتنی تیز کہ مُردے کو جگا دے۔"

اس نے کافی، شکر کے بغیر، آہستہ گھونٹ لے لے کر پی، اور پھر پیالی کو طشتری پر الٹ کر رکھ دیا تاکہ کافی کے ذرات کو لکیروں کے ذریعے، اتنے برس بعد، اس کی تقدیر لکھنے کا موقع مل سکے۔ ذائقے کی اس بازیافت نے ذرا دیر کے لیے اسے اس کے غمناک خیالوں سے نکال لیا۔ بے سبب، گویا سحر کی توسیع کے طور پر، اسے محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اس نے بے خیالی کے سے انداز میں ورق پلٹا اور اپنے چشمے کے اوپر سے ایک زرد رو، شیو بڑھائے ہوئے آدمی کو سپورٹس شرٹ اور بھیڑ کی کھال کے استر والی جیکٹ پہنے پایا جو فوراً دوسری طرف دیکھنے لگا تاکہ ان کی نظریں نہ مل سکیں۔

اس کا چہرہ دیکھا بھالا سا تھا۔ وہ دونوں اسپتال کے برآمدے میں کئی بار ایک دوسرے کے پاس سے گزرے تھے؛ ایک آدھ بار، باغ میں مرغابیوں کا نظارہ کرتے ہوئے، اس نے اس شخص کو خیابان والڈ پر موٹر اسکوٹر چلاتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ لیکن اسے کبھی اپنے پہچانے جانے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس نے اس خیال کو بھی مسترد نہیں کیا کہ یہ احساس جلاوطنی میں ستائے جانے کے بہت سے واہموں میں سے ایک ہو سکتا ہے۔

اس نے اطمینان کے ساتھ اخبار پڑھ کر ختم کیا اور اس دوران سازندوں کی چھیڑی ہوئی براہمز کی پُرتکلف لہروں پر بہتا رہا، یہاں تک کہ اسے اپنا درد موسیقی کی دردمندی سے زیادہ شدید محسوس ہونے لگا۔ تب اس نے اپنی چھوٹی سی طلائی گھڑی اور اس کی زنجیر پر نظر ڈالی جسے وہ اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھتا تھا، اور اپنی دوا کی آخری گھونٹ کے ساتھ دوپہر کے وقت کی دو گولیاں کھائیں۔ چشمہ اتارنے سے پہلے اس نے کافی کے ذروں کی ترتیب دی ہوئی اپنی تقدیر پڑھی اور برف جیسی سرد دہشت محسوس کی: اسے ان غیریقینی لکیروں میں تذبذب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ آخرکار اس نے بل ادا کیا، کسی کنجوس کی سی ٹپ چھوڑی، ریک پر سے ہیٹ اور چھڑی اٹھائی، اور اس آدمی کی طرف دیکھے بغیر جو اسے دیکھ رہا تھا، باہر سڑک پر نکل آیا۔ وہ مسرور چال سے آندھی کی اجاڑی ہوئی پھولوں کی کیاریوں کے پاس قدم رکھتا گزر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنی کیفیت سے نکل آیا ہے۔ مگر تبھی اس کو اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی اور مڑنے پر پلٹتے ہوئے وہ آدھا گھوم گیا۔ تعاقب کرنے والے آدمی کو ٹکر سے بچنے کے لیے فوراً رک پڑا اور اس کی چونکی ہوئی آنکھیں چند انچ کے فاصلے سے اسے دیکھنے لگیں۔ "جنابِ صدر،" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ان لوگوں نے تمھیں اس کام کی اجرت دی ہے، ان سے کہہ دو کہ زیادہ امید نہ رکھیں،" صدر نے اپنی مسکراہٹ یا آواز کی دلکشی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ "میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔"

Scanned with CamScanner

"یہ بات مجھ سے بہتر کون جانتا ہے،" وہ آدمی اپنے سر پر آ پڑنے والے جاہ و جلال کے وزن سے دبتے ہوئے بولا۔ "میں اسپتال میں کام کرتا ہوں۔" اس کی زبان اور چال ڈھال، یہاں تک کہ اس کا بودا پن، اس کے دیسی کریبین ہونے کے غماز تھے۔

"مجھے یہ مت بتانا کہ تم ڈاکٹر ہو،" صدر نے کہا۔

"کاش میں یہ کہہ سکتا، جناب۔ میں ایمبولنس چلاتا ہوں۔"

"معافی چاہتا ہوں،" صدر نے اپنی غلطی کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا کام خاصا سخت ہے۔"

"اتنا نہیں جتنا آپ کا کام ہے، جناب۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے چھتری کا سہارا لیتے ہوئے اس پر سیدھی نگاہ ڈالی، اور حقیقی دلچسپی کے ساتھ پوچھا: "کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"کریبین کا ہوں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے،" صدر نے کہا۔ "مگر کس ملک کے؟"

"جس ملک کے آپ ہیں، جناب،" اس آدمی نے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "میرا نام ہومیرو رے۔۔۔"

حیرت زدہ صدر نے اپنا ہاتھ بڑھانے بغیر اس کی بات کاٹ دی۔

"خدایا،" وہ بولا۔ "کیسا شاندار نام ہے۔"

ہومیرو پُرسکون ہو گیا۔ "پورا نام زیادہ اچھا ہے،" اس نے کہا۔ "ہومیرو رے ولا کاسا۔۔ ہومر، کنگ آف ہز ہاؤس۔"

سڑک کے بیچ میں کھڑا صدر سرمائی ہوا کے ایک تیز جھونکے کی زد میں آ گیا۔ لرزہ اس کی ہڈیوں تک اُتر گیا، اور وہ جان گیا کہ اوور کوٹ کے بغیر دو بلاک طے کر کے اُس سستے ریستوراں تک پہنچنا ممکن نہیں ہو گا جہاں وہ عموماً کھانا کھایا کرتا تھا۔

"تم کھانا کھا چکے ہو؟" اس نے ہومیرو سے پوچھا۔

"میں دوپہر کو کھانا نہیں کھاتا،" ہومیرو نے کہا۔ "صرف ایک بار کھاتا ہوں، رات کو اپنے گھر پہنچ کر۔"

"آج کھا لو،" اس نے اپنی تمام شان کو کام میں لاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہیں اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دیتا ہوں۔"

Scanned with CamScanner

وہ اس آدمی کو بازو سے پکڑ کر سڑک کی دوسری جانب والے ریستوران میں لے گیا جس کا نام سائبان پر زریں حروف میں لکھا ہوا تھا: لیوف کورونے۔ اندر کا حصہ تنگ اور گرم تھا اور کوئی میز خالی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہومیرو رے، اس بات پر حیران کہ کسی نے صدر کو نہیں پہچانا، مدد طلب کرنے کی غرض سے کمرے کے کونے میں گیا۔

"کیا یہ کوئی عام مقام صدر ہے؟" ریستوراں کے مالک نے دریافت کیا۔

"نہیں،" ہومیرو بولا۔ "معزول۔"

مالک تائید کے انداز میں مسکرایا۔ "ان کے لیے،" وہ بولا، "میرے پاس ہمیشہ ایک خاص میز ہوتی ہے۔"

وہ ان دونوں کو ریستوراں کے عقبی حصے میں رکھی ایک تنہا میز پر لے گیا جہاں بیٹھ کر وہ جی بھر کر باتیں کر سکتے تھے۔ صدر نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ "ہر ایک کو تمھاری طرح جلاوطنی کے وقار کی پہچان نہیں ہوتی،" وہ بولا۔

اس ریستوران کی مخصوص چیز گائے کی بھنی ہوئی پسلیاں تھیں۔ صدر اور اس کے میزبان نے دوسری میزوں پر سجے ہوئے گوشت کے پارچوں کو دیکھا جن پر چربی کی پتلی سی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ "کیا شاندار گوشت ہے،" صدر نے مدھم آواز میں کہا۔ "مگر مجھے منع ہے۔" اس نے ہومیرو کو عیار آنکھوں سے دیکھا۔ "درحقیقت مجھے ہر چیز منع ہے۔"

"آپ کو تو کافی بھی منع ہے،" ہومیرو بولا۔ "مگر آپ پیتے ہیں۔"

"تمھیں پتا چل گیا؟" صدر نے کہا۔ "مگر آج کا دن خاص ہے اس لیے میں نے اپنا معمول ترک کر دیا تھا۔"

اس روز اس نے فقط کافی ہی کے سلسلے میں اپنا معمول ترک نہیں کیا۔ اس نے گائے کی بھنی ہوئی پسلیاں بھی منگوائیں اور زیتون کے عرق میں ہلکا سا بھیگا ہوا تازہ سبزیوں کا سلاد بھی۔ اس کے مہمان نے بھی یہی کچھ منگوایا، اور اس کے ساتھ پینے کے لیے سرخ وائن کا نصف قرابہ۔

جس وقت دونوں کھانے کا انتظار کر رہے تھے، ہومیرو نے اپنی جیب سے بٹوا نکالا جس میں کوئی رقم نہیں تھی اور بہت سے کاغذ تھے، اور صدر کو ایک مٹتا ہوا فوٹوگراف دکھایا۔ صدر نے خود کو قمیص میں ملبوس، بہت سے چند پاؤنڈ کم وزن، اور سیاہ بالوں اور مونچھوں کے ساتھ پہچان لیا: اس سے زد نوجوانوں کا ہجوم تھا جو تصویر میں دکھائی دینے کے شوق میں پنجوں کے بل کھڑے ہوئے تھے۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے اس تصویر کے مقام، اور اس نفرت انگیز انتخابی مہم کے نشان کو بھی پہچان لیا، اور اسے وہ منحوس تاریخ بھی یاد آ گئی۔ "اسے دیکھ کر بہت صدمہ ہوتا ہے،" وہ آہستہ سے بولا۔ "میں نے ہمیشہ کہا ہے کہ آدمی حقیقی زندگی سے زیادہ تیزی سے تصویروں میں بوڑھا ہوتا

ہے۔' اور ایک قطعیت کے اشارے کے ساتھ تصویر اُسے واپس دے دی۔ "مجھے یہ موقع اچھی طرح یاد ہے،" اس نے کہا۔ "ہزاروں سال پہلے، سان کرستوبال دا لاکاسا میں، کاک پٹ میں بیٹھے ہوئے۔"

"میں وہیں کا ہوں،" ہومیرو نے کہا، اور تصویر میں دکھائی دیتے ہوئے ایک شخص پر انگلی رکھ کر بولا: "یہ میں ہوں۔"

صدر نے بھی تصویر میں اسے پہچان لیا۔ "تم تو بالکل بچے تھے۔"

"تقریباً،" ہومیرو نے کہا۔ "میں یونیورسٹی بریگیڈ کے لیڈر کی حیثیت سے جنوبی علاقوں کی پوری انتخابی مہم میں آپ کے ساتھ رہا تھا۔"

صدر نے اس طعنے کا پہلے ہی اندازہ کر لیا تھا۔ "میں نے بہرحال تمھیں نہیں دیکھا تھا۔"

"ایسی بات نہیں۔ آپ تو بلکہ مجھ پر بہت مہربان ہوئے تھے،" ہومیرو بولا۔ "لیکن وہاں اتنے سارے لوگ تھے، آپ کیسے یاد رکھ سکتے ہیں۔"

"بعد میں کیا ہوا؟"

"یہ آپ سب سے اچھی طرح جانتے ہیں،" ہومیرو نے کہا۔ "فوجی انقلاب کے بعد تو معجزہ یہ ہے کہ ہم دونوں یہاں موجود ہیں، آدھی گائے کھانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ایسی قسمت سب کو نہیں ملی۔"

اسی موقعے پر کھانا لایا گیا۔ صدر نے اپنا نیپکن، کسی بچے کی بب کی طرح، گلے میں باندھ لیا، اور اپنے مہمان کے خاموش تعجب سے لاعلم نہیں رہا۔ "اگر یہ نہ کروں تو ہر کھانے پر ایک ٹائی برباد ہو جائے،" وہ بولا۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے اس نے، یہ دیکھنے کے لیے کہ اچھی طرح گلا ہوا ہے یا نہیں، گوشت کو تھوڑا سا چکھا، اور اشارے سے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے اپنے موضوع پر لوٹ آیا۔ "میری سمجھ میں یہ نہیں آیا،" اس نے کہا، "کہ تم نے اس سے پہلے مجھ سے ملنے کی کوشش کیوں نہیں کی، شکاری کتے کی طرح میرا پیچھا کیوں کرتے رہے۔"

اس پر ہومیرو نے اسے بتایا کہ وہ اس کو اُسی وقت پہچان گیا تھا جب وہ نہایت خاص مریضوں کے لیے مخصوص دروازے سے اسپتال کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ یہ موسمِ گرما کے وسط کی بات تھی، اور اس نے انگلینڈ کا تھری پیس لینن سوٹ اور کالے سفید جوتے پہن رکھے تھے، کالر میں ڈیزی کا پھول لگا رکھا تھا اور اس کے حسین بال ہوا میں بکھر رہے تھے۔ ہومیرو نے پتا چلا لیا تھا کہ وہ جنیوا میں تنہا اور کسی مددگار کے بغیر ہے، کیوں کہ صدر اس شہر سے اچھی طرح واقف ہے جہاں اس نے اپنی قانون کی تعلیم مکمل کی تھی۔ اسپتال کی انتظامیہ نے صدر کی درخواست پر داخلی احتیاط کے تمام اقدامات کیے تھے تاکہ اس کی شناخت کا راز افشا نہ ہو۔ اُسی رات، ہومیرو اور اس کی بیوی

Scanned with CamScanner

نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے باوجود ہومیرو پانچ ہفتے، کسی مبارک موقعے کے انتظار میں، اس کا تعاقب کرتا رہا تھا۔ اور آج بھی، اگر صدر خود اس کے روبرو نہ آ گیا ہوتا تو، اس سے مخاطب نہ ہو پاتا۔

مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے سامنے آ گیا، صدر نے کہا، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا سامنا مجھے ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔

"یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔"

کیوں؟ صدر نے خلوص سے پوچھا۔ میری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ سب لوگ مجھے بھول چکے ہیں۔"

ہم آپ کو اتنا یاد کرتے ہیں کہ آپ تصور نہیں کر سکتے، ہومیرو نے اپنے جذبات کو چھپائے بغیر کہا۔ آپ کو یوں، جوان اور صحت مند، دیکھ کر بڑی مسرت کی بات ہے۔

حیف، صدر نے میلوڈراما کے بغیر بولا۔ تمام علامات موجود ہیں کہ میری موت قریب ہے۔

آپ کی صحت یابی کے معاملات سب اچھے ہیں، ہومیرو نے کہا۔

صدر حیرت سے چونک پڑا، لیکن اپنی حس مزاح سے دست بردار نہیں ہوا۔ خدایا! وہ چلایا۔ کیا حسین سوئٹزرلینڈ میں طبی رازداری کو بالکل خیرباد کہہ دیا گیا ہے؟

دنیا کے کسی ملک کے کسی بھی ہسپتال میں ایمبولینس ڈرائیور سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی،" ہومیرو نے کہا۔

خود مجھے جتنا کچھ معلوم ہے وہ بھی دو گھنٹے پہلے ایک ایسے شخص کی زبانی معلوم ہوا ہے جس کے سوا یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

کچھ بھی ہو، آپ کسمپرسی کی موت نہیں مریں گے، ہومیرو نے کہا۔ کوئی شخص وقار کی عظیم مثال کے طور پر آپ کا جائز مقام بحال کر دے گا۔

صدر نے پرمذاق تعجب کی اداکاری کی۔ 'خبردار کرنے کا شکریہ'، اس نے کہا۔

اس نے کھانا بھی اسی انداز میں کھایا جس انداز میں ہر کام کرتا تھا: بغیر عجلت کے اور بڑی احتیاط کے ساتھ۔ کھانے کے دوران اس نے ہومیرو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، اور اس شخص کو احساس ہوا کہ وہ اس کے خیالات کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یادوں سے بھری ہوئی ایک طویل گفتگو کے بعد وہ شرارت کے سے انداز میں مسکرایا۔ میں نے اپنی لاش کے بارے میں فکرمند نہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا، وہ بولا، مگر اب لگتا ہے کہ مجھے جاسوسی ناولوں والی تمام احتیاطیں کرنی ہوں گی تا کہ یہ کسی کے ہاتھ نہ آ سکے۔

"اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا،" ہومیرو نے جوابی مذاق کیا۔ "اسپتال میں کسی زار کی عمر ایک گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتی۔"

جب دونوں کافی پی چکے تو صدر نے اپنی تقدیر دوبارہ پڑھی اور دوبارہ لرز اٹھا: اس بار بھی وہی پیغام تھا۔ مگر اس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بل کی نقد ادائیگی کی لیکن اس سے پہلے حساب کو کئی بار جوڑ کر دیکھا، بے حد احتیاط کے ساتھ کئی بار رقم گنی، اور ایسی ٹپ چھوڑی جو ویٹر کی جانب سے ایک ہُنکارے سے زیادہ کی مستحق نہ تھی۔ "نہایت پرمسرت وقت گزرا،" اس نے ہومیرو سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے ابھی آپریشن کی تاریخ طے نہیں کی ہے، بلکہ یہ فیصلہ بھی نہیں کیا ہے کہ آپریشن کراؤں گا یا نہیں۔ لیکن اگر سب کچھ ٹھیک رہا تو ہم دوبارہ ملیں گے۔"

"اس سے پہلے کیوں نہیں؟" ہومیرو بولا۔ "لزارا، میری بیوی، مال دار لوگوں کے لیے کھانے پکاتی ہے۔ جھینگے اور چاول اس سے اچھے کوئی نہیں پکا سکتا، اور ہم آپ کو جلد ہی کسی رات اپنے گھر دعوت پر بلانا چاہتے ہیں۔"

"مجھے مچھلی بھی منع ہے، مگر میں بڑی خوشی سے کھاؤں گا،" اس نے کہا۔ "تو پھر کب؟"

"جمعرات کو میری چھٹی ہوتی ہے،" ہومیرو نے کہا۔

"بہت خوب،" صدر نے کہا۔ "جمعرات کو شام سات بجے میں تمھارے گھر پر ہوں گا۔ میرے لیے یہ بڑی مسرت کی بات ہوگی۔"

"میں آپ کو لینے آجاؤں گا،" ہومیرو بولا۔ "اوتیل دام، نمبر ۱۴ ریو دلند ستری۔ اسٹیشن کے پیچھے۔ درست ہے؟"

"درست ہے،" صدر نے کہا، اور ہمیشہ سے زیادہ شان کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ "معلوم ہوتا ہے تم میرے جوتے کا ناپ بھی جانتے ہو۔"

"یقیناً، جناب،" ہومیرو لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "اکتالیس نمبر۔"

جو بات ہومیرو نے صدر کو نہیں بتائی، مگر بعد میں برسوں، سننے پر آمادہ ہر شخص کو بتاتا رہا، وہ یہ تھی کہ ابتدا میں اس کے ارادے اتنے نیک نہیں تھے۔ دوسرے ایمبولنس ڈرائیوروں کی طرح اس کے بھی تدفین کا بندوبست کرنے والے اداروں اور انشورنس کمپنیوں کے ساتھ روابط تھے اور وہ اسپتال کے اندر، خصوصاً کم وسائل رکھنے والے غیر ملکی مریضوں سے، اس قسم کا کام حاصل کیا کرتا تھا۔ منافع کم تھا، اور اس میں سے اسپتال کے ان ملازموں کو بھی حصہ دینا پڑتا تھا جو

Scanned with CamScanner

سکیں، بیماریوں میں متضاد بحثوں کی خفیہ دلیلیں دائم کرتے تھے۔ مگر ایک جلاوطن اور مستقبل سے محروم شخص کے لیے، جسے ایک مضحکہ خیز تنخواہ میں بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پالنا ہو، اتنا ہی عبث تھا۔

لازارا ڈیوس، اس کی بیوی، زیادہ حقیقت پسند تھی۔ وہ سان جوان، پورٹوریکو، کی رہنے والی ایک پھرتیلے بدن کی طاقتور عورت تھی جس کا قد چھوٹا اور بدن مضبوط تھا، جلد کی رنگت سوختہ شکر جیسی، اور آنکھیں لومڑی کی سی جو اس کے مزاج سے بہت مطابقت رکھتی تھیں۔ دونوں کی ملاقات ہسپتال کے خیراتی وارڈ میں ہوئی تھی جہاں وہ، اپنے وطن کے ایک ماہر مالیات کے ساتھ نرس کے طور پر جینیوا آئی تھی اور اس شخص کے پاس ملازمت چھوٹنے پر شہر ہی میں در بدر پھرنے کے بعد سے، ایک مددگار کے طور پر کام کرنے لگی تھی۔ ان کی شادی کی تقریب کیتھولک طریقے سے ہوئی تھی حالانکہ وہ یوروبا شاہی گھرانے کی فرد تھی، اور وہ بغیر لفٹ کی، اور افریقی تارکین وطن سے آباد، ایک عمارت کی آٹھویں منزل پر دو کمروں کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ان کی بیٹی باربرا نو سال کی تھی، اور سات سالہ بیٹے لازارو میں ذہنی پس ماندگی کی علامتیں موجود تھیں۔

لازارا ڈیوس ذہین اور بدمزاج تھی لیکن اس کا دل نرم تھا۔ وہ خود کو خالص برجِ ثور کی خصوصیت کا حامل سمجھتی تھی اور ستاروں کے شگونوں کو پہچاننے کی اپنی صلاحیت پر اندھا اعتقاد رکھتی تھی۔ اس کے باوجود اس کا کروڑپتیوں کو تقدیر کا حال بتانے کا پیشہ اختیار کرنے کا خواب کبھی پورا نہ ہو سکا۔ دوسری طرف وہ مال دار خواتین کے لیے، جنہیں مہمانوں پر اپنی زبردست کھانے پکانے کی صلاحیت کا رعب ڈالنے کا شوق تھا، کھانے تیار کر کے گھر کی آمدنی میں اکثر تھوڑا بہت، اور کبھی کبھار اچھا خاصا، اضافہ کر لیا کرتی تھی۔ البتہ ہومیرو ایک حد تک دبو واقع ہوا تھا اور اپنی قلیل آمدنی میں اضافہ کرنے کے خواب نہیں دیکھتا تھا، مگر لازارا اس کے بغیر زندگی کا تصور نہیں کر سکتی تھی جس کی وجہ ہومیرو کی دلی معصومیت اور اس کے مردانہ عضو کی قابلِ قدر کارکردگی تھی۔ ان کے دن ٹھیک ہی گزر رہے تھے، مگر ہر نیا سال زیادہ دشوار ہو رہا تھا اور بچے بڑے ہو رہے تھے۔ صدر کی آمد کے وقت تک دونوں اپنی پانچ برس کی بچت کو خرچ کرنا شروع کر چکے تھے۔ اور اسی دن جب ہومیرو نے اسپتال کے گمنام مریضوں میں صدر کو شناخت کیا تو ان کی امیدیں بیدار ہو گئیں۔

انہیں یقین سے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا مانگیں گے، یا کس حق کے تحت مانگیں گے۔ پہلے پہل انہوں نے تدفین کے مکمل بندوبست کا شایاں حل کرنے کا منصوبہ بنایا جس میں لاش کو حنوط کرنے اور وطن واپس لے جانے کے انتظامات بھی شامل تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ انہیں اندازہ ہو گیا کہ اس کی موت اتنی بھی قریب نہیں ہے جتنی شروع میں معلوم ہوتی تھی۔ صدر کے ساتھ دوپہر کا

کھانا کھانے کے دن تو ہومیرو سخت شکوک میں مبتلا ہو گیا۔

سچ یہ ہے کہ ہومیرو یونیورسٹی بریگیڈ یا کسی اور شے کا لیڈر وغیرہ نہیں رہا تھا، اور اس انتخابی مہم میں اس کا کردار صرف اس گروپ فوٹو میں شامل ہو جانے تک محدود تھا جو کسی معجزے سے اساری میں پڑے کاغذوں کے ڈھیر میں سے اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ لیکن اس کا جوش و خروش حقیقی تھا۔ یہ بھی سچ تھا کہ اُسے فوجی انقلاب کے خلاف عام مظاہرے میں حصہ لینے کے نتیجے میں ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اگرچہ اب اتنے برس بعد تک جنیوا میں رہنے کا واحد سبب اس کی روح کی نادری کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس لیے ایک آدھ جھوٹ اس کے صدر کا التفات حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتا تھا۔

ان دونوں کے لیے پہلا حیرت انگیز انکشاف یہ تھا کہ وہ نامور جلاوطن شخص لے گروت کے غنک علاقے کے ایک چوتھے درجے کے ہوٹل میں، ایشیائی تارکینِ وطن اور شب بیدار عورتوں کے درمیان، مقیم تھا، اور سستے ریستورانوں میں تنہا کھانا کھایا کرتا تھا، جب کہ جنیوا ایسے مناسب بنگلوں سے بھرا پڑا تھا جنہیں معزول شدہ سیاست داں اپنی سکونت کے لیے استعمال کر سکتے تھے۔ ہر روز ہومیرو اُسے اپنے پچھلے دن کے معمولات کو دوہراتے دیکھ کرتا۔ پرانے شہر کی ماتمی دیواروں اور عشق پیچاں کی بوسیدہ بیلوں کے درمیان سیر کرتے ہوئے اس کی آنکھیں متواتر اس کے تعاقب میں رہتیں، اور کبھی کبھی تو دونوں کے درمیان فاصلہ احتیاط کے لحاظ سے خاصا کم ہو جاتا تھا۔ اس نے اُسے کالون کے مجسمے کے سامنے گھنٹوں خیالوں میں غرق دیکھا تھا۔ چنبیلی کی آتشیں مہک سے بے حال ہوتے ہوئے وہ اس کے تعاقب میں پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر بورگ ولفور کے اوپر تک گیا تھا جہاں بیٹھ کر وہ موسمِ گرما کے سست رو غروبِ آفتاب کا نظارہ کیا کرتا تھا۔ ایک رات ہومیرو نے اسے موسم کی پہلی بارش میں، اوور کوٹ یا چھتری کے بغیر، طالب علموں کے ساتھ روبنشٹائن کے کنسرٹ کی قطار میں کھڑا دیکھا تھا۔ 'میں حیران ہوں کہ اسے نمونیا کیوں نہیں ہوا،' بعد میں اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ جس سنیچر کو موسم بدلنا شروع ہوا، اس نے صدر کو نقلی فر کے کالر والا ایک خزانی کوٹ خریدتے دیکھا، اور خیاباں دیوروں کی جگمگاتی دکانوں میں نہیں جہاں مفرور شیوخ خریداری کرتے تھے، بلکہ استعمال شدہ اشیا کے ہفتہ وار بازار میں۔

"پھر تو ہم کچھ نہیں کر سکتے،" جب ہومیرو نے اس کا تذکرہ کیا تو نزار چلا کر بولی۔ "وہ انتہائی کنجوس شخص ہے جو یہی خیراتی تدفین کرانے کو ترجیح دے گا اور قلاشوں کے قبرستان میں دفن ہو گا۔ اس شخص سے ہمیں ایک کوڑی بھی حاصل نہیں ہو گی۔"

"ہو سکتا ہے وہ واقعی غریب ہو،" ہومیرو نے کہا۔ "آخر اتنے برسوں سے بے روزگار ہے۔"

Scanned with CamScanner

"آہ، میری جان، چڑھتے ہوئے سیارے کا بُرجِ حوت میں ہونا ایک بات ہے اور احمق ہونا بالکل دوسری،" لزارا بولی۔ "سب جانتے ہیں کہ وہ ملک بھر کا سونا لے کر فرار ہوا تھا اور مارتینیک کا امیر ترین جلاوطن ہے۔"

ہومیرو، جو اپنی بیوی سے دس سال بڑا تھا، اخباروں میں یہ قصے پڑھ پڑھ کر جوان ہوا تھا کہ صدر نے راج مزدور کی حیثیت سے کام کر کر کے جنیوا میں اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ اس کے برعکس لزارا کی پرورش حزبِ اختلاف کے اخباروں کے ان اسکینڈلوں پر ہوئی تھی جنھیں اس مکان میں بڑا کر کے دیواروں پر لگایا جاتا تھا جہاں وہ کمسنی میں کام کرنے جاتی تھی۔ نتیجہ یہ کہ جس دن ہومیرو اس بات پر مسرت سے بے دم گھر پہنچا کہ اس نے صدر کے ساتھ دوپہر کا کھانا کھایا ہے، تو وہ اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوئی کہ وہ اسے ایک مہنگے ریستوراں میں لے گیا تھا۔ اسے اس پر بہت غصہ آیا کہ ہومیرو نے ان بہت ساری فرمائشوں میں سے ایک بھی فرمائش نہیں کی جن کا وہ دونوں خواب دیکھتے رہے تھے، یعنی بچوں کے لیے وظیفے سے لے کر اسپتال میں بہتر ملازمت تک۔ صدر کے اس فیصلے سے کہ وہ، مناسب تدفین اور شان دار وطن واپسی پر اپنے فرانک خرچ کرنے کے بجائے، اپنی لاش کو گدھوں کے سپرد کرے گا، لزارا کے شبہات کی تصدیق ہوئی تھی۔ مگر صبر کے آخری تنکے کو ہومیرو نے گفتگو کے آخر کے لیے بچا رکھا تھا: اس نے جمعرات کی رات صدر کو اپنے گھر آ کر جھینگے اور چاول کھانے کی دعوت دی ہے۔

"بس اسی کی کسر رہ گئی ہے،" لزارا چیخ کر بولی، "کہ ڈبوں میں بند جھینگے کھا کر ہمارے ہی گھر میں اس کا دم نکلے، اور ہمیں بچوں کے لیے رکھی ہوئی رقم خرچ کر کے اس کے کفن دفن کا بندوبست کرنا پڑے۔"

آخرکار جس چیز نے اس کے طرزِ عمل کا تعین کیا وہ اس کی خانگی وفاداری کا احساس تھا۔ اسے پڑوس کے ایک گھر سے سلور کی تین پلیٹیں اور سلاد کا پیالہ، دوسرے سے بجلی کا کافی پاٹ، اور تیسرے سے ایک کڑھا ہوا میز پوش اور کافی پینے کے برتن اُدھار لینے پڑے۔ اس نے پرانے پردے اتار کر نئے پردے لگائے جنھیں صرف تہواروں کے موقعوں پر نکالا جاتا تھا، اور میز کرسیوں پر سے غلاف اتار دیے۔ ایک پورا دن اس نے فرش دھونے، گرد جھاڑنے اور چیزوں کی ترتیب بدلنے میں لگا دیا، یہاں تک کہ ان کا گھر ایسی حالت میں آ گیا جس کی بالکل اُلٹ حالت اُن کے لیے موزوں ہو سکتی تھی، یعنی جس کی مدد سے وہ اپنے مہمان کو اپنی پُروقار مفلسی سے متاثر کر سکتے تھے۔

جمعرات کی رات کو، سیڑھیاں چڑھ کر اپنا سانس درست کرتے ہوئے، صدر اپنا نیا خریدا

Scanned with CamScanner

ہوا پُرانا کوٹ اور کسی گزرے زمانے کا تربوز کی شکل کا ہیٹ پہنے، اور لزار کو پیش کرنے کے لیے گلاب کا فقط ایک پھول لیے، دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ اس کی مردانہ وجاہت سے اور اس کے شہزادوں کے سے شائستہ ادب آداب سے بہت متاثر ہوئی، مگر سب سے بڑھ کر اس کو وہی دکھائی دیا جسے دیکھنے کی وہ توقع کر رہی تھی: ایک فریبی اور غارت گر شخص۔ اس کو وہ بدلحاظ معلوم ہوا، کیوں کہ اس نے تو اس خیال سے کھڑکیاں بند رکھی تھیں کہ کہیں گھر میں جھینگوں کی بُو نہ بس جائے، اور اُس نے گھر میں آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ غیر متوقع انبساط سے مغلوب ہو کر ایک گہرا سانس لیا، بازو پھیلا کر آنکھیں بند کیں اور زور سے چلّایا: "آہ، ہمارے سمندر کی مہک!" اس کو وہ ہمیشہ سے زیادہ کنجوس بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس کے لیے گلاب کا فقط ایک پھول لایا تھا، جو بلاشبہ اس نے شہرداری کے باغ سے چرایا ہوگا۔ وہ اُسے بددماغ بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس نے اپنے صدارتی دور کے اُن اخباری تراشوں اور اپنی انتخابی مہم کے پھریروں اور جھنڈوں پر بڑی ناگواری سے نظر ڈالی جنھیں ہومیرو نے اتنے خلوص سے لِونگ روم کی دیوار پر لگایا تھا۔ وہ اسے سنگ دل بھی معلوم ہوا کیوں کہ اس نے باربرا اور لزارو سے سلام دعا تک نہیں کی جنھوں نے اس کے لیے ایک تحفہ لے کر رکھا تھا، اور پھر کھانے کے دوران دو چیزوں کا نام لیا جن کو وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتا تھا: کتّے اور بچے۔ اسے اس شخص سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ لیکن اس کی کریبیئن مہمان نوازی اس کی بدگمانیوں پر غالب آ گئی۔ اس نے ایک افریقی گاؤن پہنا تھا جو وہ خاص موقعوں پر پہنتی تھی، اور سانتیریا کی مالا اور کنگن، اور کھانے کے دوران تمام وقت اس نے کسی قسم کی غیر ضروری حرکت کرنے اور کوئی زائد لفظ بولنے سے پوری طرح گریز کیا۔ وہ میزبان کے طور پر صرف موزوں ہی نہیں بلکہ بہترین ثابت ہوئی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ جھینگے اور چاول اس کے باورچی خانے کی اعلیٰ ترین چیزوں میں سے نہیں تھے، لیکن اس نے انھیں پوری دلجمعی سے تیار کیا تھا اور وہ بہت اچھے پکے تھے۔ صدر نے تین مرتبہ اپنی پلیٹ بھری اور کھانے کی تعریف میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس کے علاوہ تلے ہوئے کیلوں اور ایووکاڈو کا سلاد بھی اسے بہت پسند آیا اگرچہ وہ ان دونوں کے نوستلجیا میں شریک ہونے سے قاصر رہا۔ لزارا نے میٹھا پیش کرنے تک صرف سننے پر اکتفا کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن بظاہر بغیر کسی وجہ کے ہومیرو نے خود کو خدا کے وجود کی بحث کی اندھی گلی میں جا پھنسایا۔

"میں خدا کے وجود کو مانتا ہوں،" صدر نے کہا، "مگر اُسے انسانوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ اس سے زیادہ بڑے کاموں میں مشغول ہے۔"

"میں صرف ستاروں پر یقین رکھتی ہوں،" لزارا نے کہا اور صدر کے ردِعمل کو غور سے دیکھنے لگی۔ "آپ کس تاریخ کو پیدا ہوئے تھے؟"

Scanned with CamScanner

"گیارہ مارچ کو۔"

میں جانتی تھی،" لزارا نے تجاہلِ عارفانہ کے ساتھ بولی، اور پھر خوشگوار لہجے میں پوچھنے لگی: "کیا آپ کے خیال میں ایک میز پر بیٹھے موت کے دو افراد ضرورت سے زیادہ نہیں ہیں؟"

دونوں مرد خدا کے بارے میں گفتگو میں مصروف تھے جب وہ کافی تیار کرنے باورچی خانے میں گئی۔ اس نے میز اچھی طرح صاف کر دی تھی اور دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی کہ دعوت خیر و خوبی سے ختم ہو۔ کافی لے کر لونگ روم میں واپس آتے ہوئے اسے صدر کا ایک ادھورا فقرہ سنائی دیا جس سے وہ حیرت زدہ رہ گئی۔

یقین کرو میرے پیارے دوست، اگر میں صدر رہتا تو یہ ہمارے غریب ملک کے لیے انتہائی بدقسمتی کی بات ہوتی۔"

ہومیرو نے لزارا کو دھاری ہوئی پیالیاں اور کافی پاٹ اٹھائے دیکھا اور اُسے خیال گزرا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے گی۔ صدر کی توجہ بھی اس طرف ہو گئی۔ "مجھے اس طرح مت دیکھو سینیورا،" وہ دوستانہ آواز میں بولا۔ "میں اپنے دل کی بات بتا رہا ہوں۔" اور پھر، ہومیرو کی طرف مڑ کر، اس نے اپنی بات پوری کی: "بالکل صاحب سے کہ اپنی حماقت کی میں اتنی بڑی قیمت ادا کر رہا ہوں۔"

لزارا نے کافی پیش کی اور میز کے اوپر لٹکی ہوئی بتی بجھا دی کیونکہ اس کی چمک گفتگو میں حارج ہو رہی تھی، کمرے میں قربت کا ایک سایہ سا چھا گیا۔ اُسے پہلی بار مہمان سے وہ دلچسپی پیدا ہوئی جس کی حسِ مزاح اس کے اندر کی اُداسی کو چھپانے میں ناکام تھی۔ لزارا کے تجسس میں اس وقت اور اضافہ ہو گیا جب کافی ختم کرنے کے بعد اُس نے اپنی پیالی کو اُلٹا کر طشتری میں رکھ دیا تاکہ کافی کے ذرات بہہ کر نیچے جمع ہو جائیں۔

صدر نے انہیں بتایا کہ اس نے اپنی جلاوطنی کے لیے جزیرہ مارتینیک کو شاعر ایمے سیزر سے اپنی دوستی کے باعث منتخب کیا تھا جس کی کتاب Cahier d'un Retour au Pays Natal (آبائی وطن کے سفر کی نظمیں) انہیں دنوں شائع ہوئی تھی، اور جس نے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔ اس کے خاندانی ورثے میں سے جو کچھ باقی رہ گیا تھا اس سے اس نے اور اس کی بیوی نے فورٹ دو فرانس کی پہاڑیوں میں نوبل وڈ سے بنا ہوا ایک مکان خرید لیا جس کی کھڑکیوں پر جھلمیاں لگی ہوئی تھیں اور قدیم پھولوں سے بھرے دالان کا رخ سمندر کی جانب تھا، جہاں جھینگروں کی آوازوں اور شکر کے کارخانوں کی سمت سے آتی ہوئی راب اور رم کی مہک سے سرشار ہو کر سونا ایک نعمت تھا۔ وہ اس مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا ۔۔ جو اس سے چودہ سال بڑی اور اس کے واحد بچے کو جنم دینے کے بعد سے معذور تھی ۔۔ اور تقدیر سے اپنی مدافعت کے لیے لاطینی کلاسیکی کتابوں کو، اصل لاطینی میں، پڑھنے کی عادت اور اپنے اس یقین کا سہارا لیا

Scanned with CamScanner

کرتا تھا کہ یہ اس کی زندگی کے ڈرامے کا آخری ایکٹ ہے۔ برسوں سے وہ اپنے شکست خوردہ حامیوں کے تجویز کیے ہوئے ہر قسم کے ایڈونچروں کی ترغیب کی مزاحمت کرتا چلا آرہا تھا۔

"لیکن میں نے ایک بھی خط کو کھول کر نہیں دیکھا،" اس نے کہا۔ "کبھی نہیں۔ جب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ ان میں سے انتہائی اہم خط ایک ہفتہ گزرنے پر کم اہم معلوم ہونے لگتے ہیں، اور دو مہینے بعد آدمی ان کو، اور انہیں لکھنے والوں کو، بالکل بھول جاتا ہے۔"

اس نے نیم تاریکی میں لزارا پر نظر ڈالی جو ایک سگریٹ سلگا رہی تھی، اور اپنے ہاتھ کی ایک پُراشتیاق حرکت سے سگریٹ اُس سے چھین لیا۔ ایک طویل کش لے کر اس نے دھوئیں کو دیر تک اپنے حلق میں رکھا۔ حیرت زدہ لزارا نے دوسرا سگریٹ سلگانے کے لیے ڈبیا اور ماچس اٹھائی تو اُس نے جلتا ہوا سگریٹ اسے واپس دے دیا۔ "تم اتنے مزے سے سگریٹ پیتی ہو کہ مجھ سے نہ رہا گیا،" وہ بولا۔ لیکن اُس کو دھواں منہ سے نکالنا ہی پڑا کیوں کہ اسے کھانسی آنے لگی تھی۔

"میں نے یہ عادت برسوں پہلے ترک کر دی تھی، لیکن اس عادت نے مجھے پوری طرح ترک نہیں کیا،" اس نے کہا۔ "بعض موقعوں پر میں اس سے ہار جاتا ہوں۔ جیسے اس وقت۔"

کھانسی کا دورہ اُسے دو مرتبہ اور پڑا۔ اس کا درد لوٹ آیا۔ صدر نے اپنی چھوٹی سی جیبی گھڑی میں وقت دیکھا اور رات کی دو گولیاں کھائیں۔ پھر اس نے اپنی کافی کی پیالی پر نظر ڈالی، مگر اس بار اس پر لرزہ طاری نہیں ہوا۔ "میرے بعض حامی میرے بعد صدر رہ چکے ہیں،" وہ بولا۔

"سایاگو،" ہومیرو نے کہا۔

"سایاگو بھی، اور دوسرے بھی،" اس نے کہا۔ "وہ سب میری طرح تھے: ایک ایسے اعزاز کے غاصب جس کے ہم مستحق نہیں تھے ایک ایسے منصب پر قابض جس کی ذمے داریاں نبھانا ہم نہیں جانتے تھے۔ کچھ لوگوں کو طاقت کی طلب ہوتی ہے، مگر زیادہ تر اس سے بہت کمتر چیز کی تلاش میں ہوتے ہیں ـــ ملازمت کی۔"

لزارا کو غصہ آگیا۔ "آپ کو معلوم ہے لوگ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

ہومیرو نے چونک کر دخل اندازی کی۔ "وہ سب جھوٹ ہے۔"

"جھوٹ ہے بھی اور نہیں بھی،" صدر نے ماورائی سکون کے ساتھ کہا۔ "جب معاملہ کسی صدر کا ہو تو بدترین قیاس بھی بیک وقت درست اور غلط ہو سکتا ہے۔"

اس نے اپنی جلاوطنی کا پورا عرصہ مارتینیک میں گزارا تھا، جہاں بیرونی دنیا سے اس کا واحد رابطہ سرکاری اخبار میں چھپنے والی چند خبروں تک محدود تھا، اور وہ ایک سرکاری درس گاہ میں اسپانوی اور لاطینی زبانیں پڑھا کر، اور ایمے سیزیر کی کوششوں سے کبھی کبھار ملنے والے ترجمے کے

کام سے اپنا خرچ چلایا کرتا تھا۔ اگست میں گرمی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تھی، اور وہ دوپہر تک جھولے میں پڑا، اپنے کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی گنگناہٹ سنتا اور کتاب پڑھتا رہتا تھا۔ دن کے گرم ترین حصوں میں بھی اس کی بیوی، تنکوں کے بنے اور مصنوعی پھلوں اور آرگنڈی کے پھولوں سے سجے ہوئے ہیٹ کی مدد سے خود کو دھوپ سے بچانے، ان پرندوں کی دیکھ بھال میں لگی رہتی تھی جن کو وہ صحن میں آزاد رکھ کر پال رہی تھی۔ مگر جب گرمی کم ہوتی تو دالان کی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا؛ وہ اندھیرا ہونے تک سمندر پر نظریں جمائے رہتا اور اس کی بیوی اپنی جھولنے والی کرسی میں بیٹھی، سر پر پھٹا پرانا ہیٹ اور ساری انگلیوں میں چمکدار پتھروں والی انگوٹھیاں پہنے، دنیا بھر کے جہازوں کو گزرتے دیکھا کرتی تھی۔ "یہ پورٹو ریکو جا رہا ہے،" وہ کہتی۔ "اس والے کے لیے تو چلنا مشکل ہو رہا ہے، پورٹو سانتو کے کیلوں سے اس بری طرح لدا ہوا ہے،" وہ کہتی۔ کیوں کہ اس کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ گزرنے والا ہر جہاز ان کے اپنے ملک کا نہ ہو۔ وہ اس کی بات سنی ان سنی کر دیتا تھا، اگرچہ آخرکار وہ فراموش کرنے میں اس سے زیادہ اچھی طرح کامیاب ہوئی کیوں کہ اپنی یادداشت کھو بیٹھی۔ وہ اسی طرح بیٹھے رہتے، یہاں تک کہ جھٹ پٹا ختم ہو جاتا اور انھیں مچھروں سے بچنے کے لیے اندر پناہ لینی پڑتی۔ اگست کے ایسے بہت سے مہینوں میں سے ایک کے دوران، دالان میں اخبار پڑھتے ہوئے، صدر حیرت سے چونک پڑا۔

"او خدایا!" وہ بولا۔ "میں ایستورِل میں انتقال ہو گیا ہے۔"

اس کی بیوی، جو غنودگی کے سمندر میں تیر رہی تھی، اس خبر سے دہشت زدہ ہو گئی۔ یہ خبر ایک ایسے اخبار کے پانچویں صفحے پر چھ سطروں میں شائع ہوئی تھی جو ان کی گلی کے نکڑ پر چھپا کرتا تھا، اور جس میں اس کے کیے ہوئے ترجمے بھی شائع ہوتے رہے تھے، اور جس کا مینیجر اس سے ملنے بھی کبھی کبھار آ نکلتا تھا۔ اور اب اس اخبار کا کہنا تھا کہ وہ یورپی انحطاط پسندوں کی پناہ گاہ اور سیرگاہ ایستورِل ولز ہو آ میں وفات پا گیا ہے جہاں اس نے کبھی قدم تک نہیں رکھا تھا اور جو شاید دنیا میں واحد جگہ تھی جہاں مرنا اُسے ناپسند ہوتا۔ اُس کی بیوی البتہ ایک سال بعد چل بسی، اپنے پاس باقی واحد یاد کے ہاتھوں اذیت اٹھاتے ہوئے: اپنے اکلوتے بیٹے کی یاد جس نے اپنے باپ کی معزولی میں حصہ لیا تھا اور بعد میں اپنے ہی ساتھیوں کی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔

صدر نے آہ بھری۔ "ہم ہی طرح ہیں، اور کوئی شے ہمیں نجات نہیں دلا سکتی،" وہ بولا۔ "دنیا کے قبیح ترین لوگوں کا تصور کیا ہوا ایک براعظم، محبت کے ایک لمحے تک سے محروم: اغوا، زنا بالجبر، قانون شکنی، بدنام کارروائیوں، فریب کاریوں اور دشمنوں کے دشمنوں سے اتحاد پر پرورش پائے ہوئے بچوں کا تصور کیا ہوا براعظم۔" اس نے لزارا کی افریقی آنکھوں کی طرف رُخ پھیرا جو اُسے بے رحمی سے گھور رہی تھیں، اور اس نے کسی کہنہ مشق کی سی خوش گفتاری سے اس

Scanned with CamScanner

عورت کا دل موہ لینا چاہا۔ "نسلوں کی آمیزش کا مطلب ہے آنسوؤں اور بہتے ہوئے خون کی آمیزش۔ اس قسم کے آمیزے سے کوئی کیا توقع کر سکتا ہے؟"

لزارا نے اپنی موت کی سی خاموشی سے اُسے اس کے مقام پر جما دیا۔ مگر نصف شب سے پہلے لزارا اپنے آپ پر تھوڑا بہت قابو پا چکی تھی اور اس نے ایک رسمی بوسے کے ساتھ اُسے الوداع کہا۔ صدر نے ہومیرو کو اپنے ساتھ ہوٹل تک جانے کی اجازت نہیں دی مگر اس کو ٹیکسی تلاش کرنے میں مدد دینے سے باز نہ رکھ سکا۔ جب ہومیرو واپس آیا تو اس کی بیوی ایک طیش کے عالم میں تھی۔ "یہ دنیا کا واحد صدر ہے جو واقعی معزول کیے جانے کا مستحق تھا،" وہ بولی۔ "کتے کا بچہ!"

ہومیرو کی اُسے تسلی دینے کی کوششوں کے باوجود، دونوں نے یک اندوہ ناک اور بے خواب رات گزاری۔ لزارا نے اعتراف کیا کہ صدر وہ خوش شکل ترین مرد تھا جسے اُس نے تمام زندگی میں دیکھا تھا، اور اس میں ترغیب کی تباہ کن صلاحیت اور کسی گھوڑے کی سی جنسی کشش تھی۔ "اس وقت بھی، جب وہ بوڑھا اور تھکا ہوا ہے، بستر میں وہ یقیناً کسی چیتے کی طرح جان دار ہو گا،" اس نے کہا۔ مگر اس کا خیال تھا کہ اس شخص نے خدا کی بخشی ہوئی ان صلاحیتوں کو محض خود نمائی میں صرف کر دیا۔ اُس کا یہ دعویٰ لزارا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا کہ وہ اپنے ملک کا بدترین صدر رہا ہے۔ اور اُس کی راہبانہ ادائیں، جب کہ اُسے یقین تھا کہ وہ مارتینیک میں گنے کی آدھی فصل کا مالک ہے۔ اور اقتدار کے لیے اُس کی ریاکارانہ تحقیر، جب کہ یہ بات واضح تھی کہ وہ محض اتنی دیر کے لیے دوبارہ صدر بننے کے لیے کچھ بھی دینے کو تیار ہو جائے گا کہ اپنے دشمنوں کو خاک چٹا سکے۔

"اور یہ سب کچھ،" اس نے اپنی بات پوری کی، "محض اس لیے کہ ہم اس کے قدموں میں گر کر اس کی پرستش کرنے لگیں۔"

"اس سے اُسے کیا فائدہ ہو گا؟" ہومیرو نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں،" وہ بولی۔ "مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کو رجھانے کی لت ایسی ہے جس کی تسکین کبھی نہیں ہو سکتی۔"

اُس کا غیظ و غضب اس درجے کا تھا کہ ہومیرو اس کے ساتھ ایک بستر میں رہنا برداشت نہ کر سکا، اور اس نے باقی کی رات لونگ روم کے دیوان پر ایک کمبل میں لپٹ کر گزاری۔ لزارا خود بھی رات کے درمیان، سر سے پیر تک برہنہ -- جس حالت میں وہ سوتے وقت یا گھر میں ہمیشہ رہا کرتی تھی -- اٹھ بیٹھی اور خود سے محض اس ایک موضوع پر متواتر مخاطب رہی۔ ہاتھ کی ایک تیز حرکت سے اس نے اس نفرت انگیز دعوت کی یاد کو انسانی حافظے سے ہمیشہ کے لیے محو کر دیا۔ صبح سویرے اس نے اُدھار لی ہوئی ساری چیزیں لوٹا دیں، نئے پردے اتار کر پرانے پردے لگائے اور فرنیچر کو اپنی پرانی ترتیب میں واپس لے آئی، یہاں تک کہ ان کا گھر اُسی غریبانہ اور پُروقار وضع

Scanned with CamScanner

پر لوٹ آیا جس میں یک رت پہلے تک تھا۔ پھر اس نے اخباروں کے تراشے، تصویریں اور اس منحوس انتخابی مہم کے جھنڈے اور پھر برسے دیوار پر سے نوچ کر ایک آخری چیخ کے ساتھ کوڑے کے ڈبے میں پھونک دیے:

"جہنم میں جاؤ!"

دعوت کے ایک ہفتے بعد ہومیرو نے اسپتال سے نکلتے ہوئے صدر کو اپنا منتظر پایا، اس درخواست کے ساتھ کہ ہومیرو اس کے ہوٹل تک اس کے ساتھ چلے۔ وہ اونچی سیڑھیوں والے زینوں کی تین منزلیں چڑھ کر اس بالاخانے میں پہنچے جس کی چھت میں صرف ایک کھڑکی تھی جس میں راکھ کے رنگ کا آسمان دکھائی دے رہا تھا اور اس کی پوری چوڑائی میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی جس پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ کمرے میں ایک ڈبل بیڈ بھی تھا، جس نے آدھا کمرہ گھیر رکھا تھا، اور ایک سخت کرسی، تپائی والی سلفچی، اور کسی غریب آدمی کی سی شیو کی صندوقچی جس کا آئینہ گدلایا ہوا تھا۔ صدر نے ہومیرو کے ردعمل کا جائزہ لیا۔ ابھی طالب علمی کے زمانے میں میں اسی طرح کے ہوٹل میں رہتا تھا، اس نے گویا عذر پیش کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کمرے کی ریزرویشن فورٹ ڈی فرانس ہی سے کرائی تھی۔

ایک مخملیں تھیلے میں سے اس نے اپنی دولت کی آخری چند نشانیاں نکالیں اور پھر انھیں نمائش کے لیے بستر پر پھیلا دیا: کئی طلائی کنگن جن پر مختلف قسم کے قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے؛ تین لڑیوں والا موتیوں کا ہار، اور سونے اور جواہرات کے دو اور ہار؛ تین طلائی زنجیریں جن میں ولیوں کے تمغے جھول رہے تھے؛ ایک جوڑی سونے اور زمرد کے آویزوں کی، ایک ہیروں کی، اور ایک سونے اور لعلوں کی؛ دو تبرکات اور ایک لاکٹ؛ مختلف قیمتی پتھروں سے جڑی گیارہ انگوٹھیاں؛ اور ہیروں کا ایک تاج جو کسی ملکہ کے لیے موزوں ہو سکتا تھا۔ ایک اور صندوقچی میں سے اس نے کف لنکس کی تین جوڑیاں چاندی کی اور دو سونے کی، جن میں سے ہر ایک کے ساتھ اس کے جوڑ کی ٹائی پن بھی تھی، سفید سونے کا پانی چڑھی ہوئی ایک جیبی گھڑی اور اس کے ساتھ کی زنجیر نکالی۔ اس کے بعد اس نے جوتے کے ڈبے میں سے اپنے چھ کے چھ اعزازات برآمد کیے: دو سونے کے، ایک چاندی کا، اور باقی سب بے قیمت تھے۔ "بس یہی کچھ ہے جو زندگی میں میرے پاس باقی رہ گیا ہے،" اس نے کہا۔

اس کے پاس اپنے علاج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ان تمام چیزوں کو بیچنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اور اس نے ہومیرو سے اس کی خاطر پوری رازداری کے ساتھ یہ کام کرنے کی

Scanned with CamScanner

التجا کی۔ لیکن ہومیرو کا خیال تھا کہ اگر ان چیزوں کی رسیدیں موجود نہیں ہیں تو وہ یہ کام نہیں کر سکے گا۔

صدر نے وضاحت کی کہ یہ سب زیور اُس کی بیوی کے ہیں اور اُسے رشتے کی ایک دادی کے مرنے پر ورثے میں ملے تھے جو نو آبادیاتی دور میں زندہ رہی تھی اور کولمبیا کی سونے کی کانوں کا ایک حصہ ورثے میں پایا تھا مگر ملی، کٹ لنکس اور ٹائی پنیں اُس کی اپنی تھیں۔ اعزازات، ظاہر ہے، اُس سے پہلے کسی کے نہیں تھے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی کے پاس ایسی چیزوں کی رسیدیں ہوتی ہوں گی،" اس نے کہا۔

ہومیرو ٹس سے مس نہ ہوا۔

"ایسی صورت میں،" صدر نے غور کرتے ہوئے کہا، "مجھے یہ کام خود ہی کرنا ہوگا۔"

وہ نپے تلے پُرسکون انداز سے جواہرات سمیٹنے لگا۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں، پیارے ہومیرو، مگر کسی قلاش ہو جانے والے صدر کی مفلسی سے بدتر کوئی مفلسی نہیں،" وہ بولا۔ "زندہ رہنا تک تحقیر کے قابل لگتا ہے۔" اس لمحے میں ہومیرو نے اُسے اپنے دل کی آنکھ سے دیکھا اور ہتھیار ڈال دیے۔

لزرا اُس رات دیر سے گھر لوٹی۔ اس نے میز پر پارے کے بلب کی روشنی میں جگمگاتے ہوئے جواہرات کی جھلک دروازے ہی میں سے دیکھ لی، اور اس پر بالکل ایسا اثر ہوا جیسے اُس نے اپنے بستر میں کسی بچھو کو دیکھ لیا ہو۔

"احمق مت بنو، ہومیرو،" وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ "یہ چیزیں یہاں کیا کر رہی ہیں؟"

ہومیرو کی وضاحت نے اُسے اور پریشان کر دیا۔ وہ بیٹھ کر جواہرات کو، کسی جواہر فروش کے تمام تر انہماک سے، ایک ایک کر کے دیکھنے لگی۔ پھر کسی لمحے اُس نے آہ بھرتے ہوئے کہا: "ان کی قیمت کسی خزانے سے کم کیا ہو گی۔" آخر کار وہ بیٹھ کر ہومیرو کا منہ تکنے لگی اور اپنی الجھن سے باہر آنے کا راستا کھو بیٹھی۔

"خدا کی لعنت ہو،" وہ بولی۔ "تمہیں کیا پتا کہ وہ شخص سچ کہہ رہا ہے؟"

"کیوں نہیں؟" ہومیرو نے کہا۔ "میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ اپنے کپڑے خود دھوتا ہے اور بالکل ہماری طرح انہیں کھڑکی میں لٹکا کر سکھاتا ہے۔"

"کیوں کہ وہ کنجوس ہے،" لزرا بولی۔

"یا غریب ہے،" ہومیرو نے کہا۔

لزرا نے ایک بار پھر جواہرات کا معائنہ کیا، اس بار ذرا کم توجہ کے ساتھ کیوں کہ اب وہ خود بھی ہتھیار ڈال چکی تھی۔ چناں چہ اگلی صبح اُس نے اپنا بہترین لباس پہنا اور جو زیور اُسے سب

سے زیادہ قیمتی معلوم ہوئے اُن سے خود کو آراستہ کیا، تمام انگلیوں میں جتنی انگوٹھیاں پہن سکتی تھی پہنیں، اور ان میں سے ایک اپنے انگوٹھے میں بھی چڑھا لی، کلائیوں میں جتنے کنگن آسکتے تھے پہنے، اور انھیں فروخت کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ "دیکھتے ہیں کون لازارا داویس سے رسیدیں مانگتا ہے،" وہ باہر نکلتے ہوئے ہنسی سے دوہری ہو کر بولی۔ اس نے بالکل درست جواہر فروش کا انتخاب کیا، جس کے پاس نیک نامی کم اور دکھاوا زیادہ تھا، جہاں اُس کو معلوم تھا چیزیں بیچی اور خریدی جاتی ہیں اور زیادہ سوال جواب نہیں کیے جاتے۔ وہ دہشت کے عالم میں، مگر مضبوط قدم رکھتی، اندر داخل ہوئی۔

شام کے لباس میں ایک دُبلے، زرد رُو سیلزمین نے تھیٹرانہ انداز سے جھک کر اسے خوش آمدید کہا، اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں اور تیز روشنیوں کی وجہ سے اندر دن سے زیادہ روشنی ہو رہی تھی، اور پوری دکان ہیروں کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ لازارا ملازم کی طرف دیکھے بغیر، کہ کہیں وہ اس کے ناٹک کو بھانپ نہ لے، اس کے پیچھے پیچھے چھپی ہوئی دکان کے پچھلے حصے میں پہنچ گئی۔

اس نے لازارا کو لوئی پانزدہم کے زمانے کے پیش تختوں میں سے ایک کے پاس بیٹھنے کی دعوت دی جو تنہا آنے والوں کی خدمت کے لیے کاؤنٹر کا کام دیتے تھے، اور اس کی اوپری سطح پر ایک صاف کپڑا بچھا دیا۔ پھر وہ لازارا کے مقابل بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

اس نے انگوٹھیاں، کنگن، ہار، آویزے، تمام زیور بے دھڑک اتار دیے اور انھیں شطرنج کے مہروں کی طرح پیش تختے پر ترتیب کے ساتھ رکھنے لگی۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتی ہے، اس نے کہا، کہ ان چیزوں کی اصل قیمت کیا ہے۔

جوہری نے اپنی بائیں آنکھ پر شیشہ لگا لیا اور کسی معالج کی سی خاموشی کے ساتھ زیوروں کا معائنہ کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد، معائنہ جاری رکھتے ہوئے، اس نے دریافت کیا: "آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟"

لازارا اس سوال کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ "اے سنیور،" وہ بولی، "میں بہت دور کی ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے،" اس نے کہا۔

وہ پھر خاموش ہو گیا اور لازارا کی دہشت زدہ سرد آنکھیں بے رحمی سے اس کا جائزہ لیتی رہیں۔ جوہری نے ہیروں کے تاج پر اپنی خاص توجہ صرف کی اور اسے باقی زیوروں سے الگ کر کے رکھ دیا۔ لازارا نے آہ بھری۔ "تم برج سنبلہ کا مکمل نمونہ ہو،" وہ بولی۔

جوہری کے معائنے میں کوئی خلل نہ آیا۔ "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

Scanned with CamScanner

"تمہارے برتاؤ سے،" لزارا بولی۔

اپنا معائنہ ختم کرنے سے پہلے اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، اور پھر اُسی احتیاط کے ساتھ اُسے مخاطب کیا جس سے ابتدا میں کام لیا تھا۔ "یہ سب چیزیں کہاں سے آئی ہیں؟"

"یہ میری دادی کا چھوڑا ہوا ورثہ ہے،" لزارا گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ "ان کا پچھلے سال ستانوے برس کی عمر میں پارامار بیو میں انتقال ہو گیا تھا۔"

تب جوہری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے،" وہ بولا، "مگر ان کی قیمت محض سونے کے وزن کے برابر ہے۔" اس نے اپنی انگلیوں کے سروں سے تاج کو اٹھا لیا اور اسے تیز روشنی میں گھما گھما کر جگمگانے لگا۔

"اس کے سوا،" وہ بولا۔ "یہ بہت پرانا ہے، شاید مصری ہے، اور اگر ہیرے اتنی بُری حالت میں نہ ہوتے تو انتہائی بیش قیمت ہوتا۔ مگر بہر حال، اس کی تاریخی اہمیت تو ضرور ہے۔"

اس کے سوا تمام زیوروں میں جڑے ہوئے جواہرات، یاقوت، زمرد، لعل، سلیسی، سب کے سب، کسی استثنیٰ کے بغیر، جعلی تھے۔ "بلاشبہ، ان کے اصل نمونے بہت شاندار رہے ہوں گے،" جوہری تمام زیوروں کو سمیٹ کر اُسے لوٹاتے ہوئے بولا۔ "لیکن ایک کے بعد دوسری نسل کو بار بار منتقل ہوتے ہوئے راستے میں کہیں اصل جواہرات نکال کر ان کی جگہ کانچ کے ٹکڑے جڑ دیے گئے۔" لزارا کو شدید متلی محسوس ہوئی، اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے اضطراب پر قابو پایا۔ سیلزمین نے اُسے تسلی دی: "ایسا اکثر ہوتا ہے، مادام!"

"مجھے معلوم ہے،" لزارا نے پُرسکون ہو کر کہا۔ "یہی وجہ ہے کہ میں ان سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔"

تب ہی اچانک اُسے احساس ہوا کہ وہ اپنا سوانگ ترک کر کے پھر سے اپنا آپ ہو چکی ہے۔ مزید تاخیر کے بغیر اس نے صدر کے کف لنکس، جیبی گھڑی، ٹائی پنیں، طلائی اور نقرئی اعزازت اور باقی ذاتی اشیا اپنے ہینڈ بیگ میں سے نکالیں اور ان سب کو میز پر رکھ دیا۔

"یہ بھی؟" جوہری نے پوچھا۔

"سب،" لزارا بولی۔

اُسے سوئس فرانک کے نوٹوں میں ادائیگی کی گئی جو اتنے نئے تھے کہ اسے اپنی انگلیوں کے سروں پر تازہ روشنائی لگ جانے کا خوف ہونے لگا۔ اس نے گنے بغیر یہ نوٹ لے لیے۔ دروازے پر جوہری کے رخصتی آداب خیر مقدم کی طرح پُرتکلف تھے۔ اس کے واسطے دروازہ کھول کر اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک لمحہ توقف کرنے کو کہا۔ "ایک آخری بات، مادام،" وہ بولا۔ "میرا برج دلو ہے۔"

Scanned with CamScanner

اُس روز شام ہوتے ہی ہومیرو اور لزارا رقم لے کر ہوٹل چلے گئے۔ بہت حساب کتاب کرنے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی سی رقم اور درکار ہو گی۔ اور صدر نے اپنی عروسی انگوٹھی، جیبی گھڑی اور زنجیر، اور کف لنکس اور ٹائی پن اتار کر انھیں بستر پر جمانا شروع کر دیا۔

لزارا اور ہومیرو نے عروسی انگوٹھی اُسے واپس دے دی۔ "یہ نہیں،" وہ بولی۔ "اس طرح کی یادگاریں بیچی نہیں جاتیں۔"

صدر نے اس کی بات مان لی اور انگوٹھی دوبارہ پہن لی۔ لزارا نے اس کی جیبی گھڑی بھی لوٹا دی۔ "یہ بھی نہیں،" اس نے کہا۔ صدر نے اس سے اتفاق نہیں کیا لیکن اُس نے صدر کو اُس کے مقام پر پہنچا دیا۔ "سوئٹزرلینڈ میں گھڑی بیچنے کی کوشش کون کر سکتا ہے؟"

"ہم نے بیچی ہے،" صدر نے کہا۔

"ہاں، مگر گھڑی نہیں۔ اس میں لگا ہوا سونا۔"

"یہ بھی سونے کی ہے،" صدر نے کہا۔

"ہاں،" لزارا بولی۔ "آپریشن کے بغیر تو شاید کام چل جائے، لیکن وقت جاننا آپ کے لیے ضروری ہو گا۔"

وہ صدر کا طلائی رِم والا چشمہ لے جانے پر بھی راضی نہیں ہوئی حالاں کہ اس کے پاس کچھوے کے خول والا ایک اَور چشمہ بھی تھا۔ اس نے سب چیزیں اپنے ہاتھ میں سمیٹ لیں اور صدر کے تمام شکوک کا خاتمہ کر دیا۔ "اور باتوں کے علاوہ،" وہ بولی، "یہ چیزیں کافی ہوں گی۔"

روانہ ہونے سے پہلے اس نے، صدر سے صلاح کیے بغیر، اس کے گیلے کپڑے رسی پر سے اتار کر اپنے گھر پر سکھانے اور استری کرنے کی غرض سے ساتھ لے لیے۔ وہ دونوں اسکوٹر پر سوار ہوئے، ہومیرو اسکوٹر چلانے لگا اور لزارا اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر پیچھے بیٹھ گئی۔ شفق کی سرخی میں سڑک پر لگی بتّیاں ابھی ابھی روشن ہوئی تھیں۔ ہوا آخری پتّوں کو اڑا لے گئی تھی اور پیڑ گھن کھائے ہوئے ڈھانچوں جیسے لگ رہے تھے۔ دیوروں پر ایک ٹو ٹرک ریڈیو کو اونچی آواز میں بجاتا اور اپنے پیچھے موسیقی کی ایک لکیر چھوڑتا تیز رفتاری سے چلا جا رہا تھا۔ جارج براسینز گا رہا تھا:

Mon amour tien bien la barre, le temps va passe par la, et le temps est un barbare dans le genre d'Attila. par la ou son cheval passe l'amour ne repousse pas.

---

*میرے محبوب گرفت مضبوط رکھو۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اور وقت اٹیلا کی طرح ایک وحشی ہے۔ جس جگہ اس کے گھوڑے کے قدم پڑتے ہیں وہاں محبت لوٹ کر نہیں آتی۔ (فرانسیسی سے ترجمہ: افضال احمد سیّد)

Scanned with CamScanner

ہومیرو اور لزارو گا سے اور سُنبل کی یادگیر مہک کے سحر میں آکر خاموش رہے۔ کچھ دیر بعد وہ گویا ایک طویل نیند سے بیدار ہوئی۔ "لعنت ہو!" وہ بولی۔

"کیا ہوا؟"

"بے چارہ بڈھا،" لزارا نے کہا۔ "کیسی ذلیل زندگی ہے!"

بعد کے ایک جمعے کو، جب اکتوبر کی سات تاریخ تھی، صدر پانچ گھنٹے کے ایک آپریشن سے گزرا جس سے فوری طور پر حالات کے غیر یقینی پن میں کوئی فرق نہ پڑا۔ قطعیت سے صرف اتنا کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے اور یہی غنیمت ہے۔ دس دن بعد اُسے ایک کمرے میں دوسرے مریضوں کے ساتھ منتقل کر دیا گیا۔ وہ ایک بالکل بدلا ہوا آدمی تھا، ذہنی طور پر منتشر اور جسمانی طور پر نحیف، اور اس کے چھدرے بال تکیے کی رگڑ سے جھڑنے لگے تھے۔ اس کے سابقہ وجود کا اگر کچھ باقی رہ گیا تھا تو وہ اس کے ہاتھوں کی پُروقار جنبش تھی۔ ہڈیوں کے امراض میں مبتلا لوگوں کے لیے مخصوص دو چھڑیاں ہاتھ میں لے کر چلنے کی اس کی پہلے پہل کی کوشش دلخراش تھی۔ لزارا اسپتال میں ٹھہر گئی اور اس کے سرہانے سوئی تاکہ اسے نرس رکھنے کے خرچ سے بچا سکے۔ کمرے میں موجود ایک اور مریض نے پہلی رات موت کے خوف سے چیخیں مارتے ہوئے گزاری۔ ان غیر مختتم راتوں نے لزارا کا رہا سہا تکلف بھی اٹھا دیا۔

جنیوا میں اپنی آمد کے چار ماہ بعد صدر کو اسپتال سے چھٹی دی گئی۔ ہومیرو نے، جو اس کے قلیل مالی اثاثوں کے محتاط مزاجی کی ذمےداری سنبھالے ہوئے تھا، اسپتال کا بل ادا کیا اور اُسے اپنی ایمبولنس میں، اسپتال کے چند اور ملازموں کے ساتھ اپنے گھر لے گیا، جنھوں نے اُسے آٹھویں منزل تک پہنچانے میں ہومیرو کی مدد کی۔ انھوں نے اسے بچوں کے سونے کے کمرے میں رکھا جن کے وجود کو اس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، اور رفتہ رفتہ وہ حقیقت کی دنیا میں واپس آتا گیا۔ اس نے سپاہیانہ مستعدی کے ساتھ خود کو صحت یابی کی جسمانی مشقیں کرنے میں لگا دیا، اور اپنی چھڑی کے سہارے چلنے کے قابل ہو گیا۔ لیکن اپنے گزرے ہوئے دنوں کے بہترین لباس میں بھی، وہ پہلا سا آدمی نہ بن سکا، نہ ظاہری ہیئت کے اعتبار سے اور نہ طرزِ عمل کے لحاظ سے۔ جاڑوں کے خوف سے، جن کے نہایت شدید ہونے کی توقع تھی، اور جو درحقیقت اس صدی کے شدید ترین جاڑے ثابت ہوئے، اس نے ڈاکٹروں کے مشوروں کے برخلاف، جو اسے مزید کچھ عرصے تک زیرِ نگرانی رکھنا چاہتے تھے، اس نے ۱۳ دسمبر کو روانہ ہونے والے مرسائی مای جہاز پر گھر لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ آخری وقت میں معلوم ہوا کہ اس کے پاس کرائے کی پوری رقم نہیں ہے،

Scanned with CamScanner

اور لزارا نے، اپنے شوہر کو بتائے بغیر، اپنے بچوں کے لیے رکھی ہوئی رقم میں ہاتھ مار کر فرق پورا کرنے کی کوشش کی، لیکن اسے وہاں بھی اتنی رقم نہیں ملی جس کی وہ توقع کر رہی تھی۔ تب ہومیرو نے اعتراف کیا کہ اس نے، لزارا کو بتائے بغیر، اسپتال کا بل پورا ادا کرنے کے لیے وہاں سے کچھ رقم لی تھی۔

"خیر،" لزارا نے تن بہ تقدیر ہوتے ہوئے کہا، "ہم یہی سمجھ لیں گے کہ وہ ہمارا سب سے بڑا بیٹا ہے۔"

۱۱ دسمبر کو، شدید برفباری میں، وہ اُسے مرسائی جانے والی ٹرین پر سوار کرانے لے گئے، اور بچوں کی میز پر پڑا ہوا الوداعی خط انہیں اسٹیشن سے واپس آنے سے پہلے نظر نہیں آیا۔ وہیں اس نے اپنی عروسی انگوٹھی باربرا کے لیے چھوڑ دی تھی، اور اپنی مرحوم بیوی کی عروسی پٹی بھی جس کو فروخت کرنے کی اس نے کوشش تک نہیں کی تھی، اور اپنی جیبی گھڑی اور زنجیر ننھے لزارو کے لیے۔ چوں کہ وہ اتوار کا دن تھا، کچھ کیریبین پڑوسی، جن پر راز افشا ہو گیا تھا، ویرا کروز کا ایک ہارپ بینڈ لے کر کورناوین اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ صدر اپنا اوباشوں کا سا اوور کوٹ اور ایک لمبا سا رنگین اسکارف پہنے، جو دراصل لزارا کا تھا، ہانپتا ہوا چل رہا تھا، مگر اس کے باوجود وہ آخری ڈبے میں سوار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور تیز سرد ہوا میں ہاتھ ہلا کر الوداع کہا۔ ٹرین رفتار پکڑنے لگی تھی جب ہومیرو کو احساس ہوا کہ صدر کی چھڑی اس کے پاس رہ گئی ہے۔ وہ پلیٹ فارم کے آخری سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور پوری قوت سے چھڑی اُس کی طرف اچھال دی تاکہ وہ اسے ہاتھ بڑھا کر پکڑ سکے، مگر وہ پہیوں کے درمیان گر کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ یہ ایک دہشت ناک لمحہ تھا۔ لزارا کی آنکھوں کے سامنے آخری منظر چھڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اسے تھامنے سے قاصر رہنے والا صدر کا کپکپاتا ہاتھ تھا، اور ٹرین کا گارڈ جس نے برف سے ڈھکا ہوا کوٹ کا کالر پکڑ کر بوڑھے آدمی کو نیچے آ گرنے سے آخری لمحے میں بچا لیا۔ لزارا انتہائی دہشت کے عالم میں دوڑتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس پہنچی، اور اپنے آنسوؤں کے پیچھے سے ہنسنے کی کوشش کرنے لگی۔ "میرے خدا!" وہ چیخ کر بولی۔ "یہ شخص کسی طرح نہیں مر سکتا!"

وہ بخیریت پہنچ گیا، یہ بات اس کے طویل شکریے کے ٹیلیگرام سے معلوم ہوئی۔ ایک سال تک اس کی کوئی اور خبر نہ آئی۔ آخرکار انہیں چھ صفحوں کا، ہاتھ سے لکھا ہوا خط ملا جس کی تحریر سے پہچاننا مشکل تھا۔ اس کا درد لوٹ آیا تھا، پہلے کی طرح شدید اور باقاعدہ انداز میں، مگر اب اُس نے اسے نظر انداز کر کے زندگی کو جوں کا توں قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ شاعر ایمے سیزر نے اسے ایک اور چھڑی دے دی تھی، جس میں سیپیاں جڑی ہوئی تھیں، لیکن اس نے اس چھڑی کو استعمال نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پچھلے چھ مہینے سے وہ پابندی سے گوشت اور مچھلی کھا رہا

Scanned with CamScanner

تھا اور دن بھر میں تلخ ترین کافی کی بیس پیالیاں تک پینے پر قادر تھا۔ لیکن اس نے پیالی کی تہہ میں اپنی تقدیر پڑھنا ترک کر دیا تھا کیوں کہ اس میں دکھائی دینے والی پیش گوئی کبھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ اپنی پچہترویں سالگرہ کے دن اس نے مارتینیک کی نفیس رم کے چند گلاس پیے، جو اسے اپنے مزاج کے مناسب محسوس ہوئے، اور اب سگریٹ نوشی بھی دوبارہ شروع کر دی ہے۔ اس کی حالت، بلاشبہ، بہتر نہیں ہوئی، لیکن پہلے سے زیادہ خراب بھی نہیں ہوئی۔ مگر اس خط کا اصل مقصد نہیں یہ اطلاع دینا تھا کہ وہ ایک اصلاحی تحریک کے رہنما کی حیثیت سے، جو قوم کے وقار کے شایانِ شان تحریک ہے، وطن واپس جانے کی ترغیب محسوس کرنے لگا ہے، خواہ اس کا حاصل بستر میں بڑھاپے کا شکار ہو کر نہ مرنے کی حقیر عظمت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لحاظ سے، خط کے آخر میں لکھا تھا، جنیوا کا سفر بے حد خوش آئند ثابت ہوا تھا۔

**

گابریئل گارسیا مارکیز کی یہ کہانی Bon Voyage, Mr President کے عنوان سے مارکیز کے تازہ مجموعے *Strange Pilgrims* میں شامل ہے۔

فہمیدہ ریاض

آدمی کی زندگی

۱۱

آدمی نے دیر تک جوڑا حساب
زندگی کی عمر کیا ہے؟
زندگی سے آدمی کتنا بڑا ہے؟
ہو نہ پایا کچھ بھی ثابت
زیر کر سکتا ہے اس کو یا نہیں

۱۲

آدمی کی بات کیوں سنتی نہیں ہے زندگی؟
اس کے کہنے پر کبھی جیتی نہیں کیوں زندگی؟
اک سمندر کے کنارے
ہاتھ پر ٹھوڑی رکھے

Scanned with CamScanner

سوچتی رہتی ہے کیا؟
زندگی خودسر ہے کیا؟
ضدی ہے کیا؟

۱۳

جب خسارے میں گیا سب کاروبارِ زندگی
آدمی اتنا اُداس!
زندگی کو پیار کر سکتا نہیں
زندگی کو اپنی باہنوں میں جکڑ سکتا نہیں
کس طرح ہوگی ترقّی
آدمی سمجھا کہ ہارا
سوچتا ہے کس طرح کر لے کنارا
زندگی سے
زندگی ـــ
آدمی کے سر کا ہار
کر نہیں سکتی کوئی بھی کاروبار

۱۴

آدمی نے ایک منصوبہ بنایا
زندگی سے وصل کا
رو پڑی زندگی نے آدمی سے جب سنا
اس صدی کے ختم ہونے تک ملیں گے ہم کہیں
سُرخ ہو کر سر جھکائے زندگی چلتی رہی

آدمی پھر ناگہانی آفتوں میں گھر گیا
روک لو اپنے قدم جب تک مجھے فرصت ملے
آدمی نے زندگی سے سخت لہجے میں کہا

زندگی نے مڑ کے دیکھا ایک بار
اشک بار
اور یونہی چلتی رہی
زندگی کارِ مشیت کی اسیر
آفتوں کے حشر ہونے تک ٹھہر سکتی نہیں

۱۵

آدمی اک شہر میں تھا
زندگی بھی تھی وہیں
آدمی نے زندگی کا دور تک پیچھا کیا
آخرش اک موڑ پر
آدمی نے زندگی کو جا لیا
درد کے میلے پسینے میں نہاتی زندگی

آدمی آنکھوں سے لیس
زندگی کے جسم سے لے کر مسامِ زندگی
غور سے تکنے لگا
سوچتا تھا مجھ سے پوشیدہ رکھے گی کب تلک
اس کے سارے بھید آخر جان لوں گا
زندگی سے مدِ مسرت اور ۔۔۔ شاید تا ابد
وصل کی ترکیب کو پہچان لوں گا

۱۶

شہر کی آتش زنی میں زندگی!
آدمی اس کو بچا کر پُرسکوں گلیوں میں لایا
سہ پہر کاٹی وہیں
زندگی اتنی ہراساں! زندگی کا رنگ فق!

اور نازک، اور پیاری ہو گئی تھی زندگی

شہر پر اُتری جو شام، نیل میں ڈوبی ہوئی
اس نے دیکھا پھر رہے ہیں زندگی اور آدمی
جس طرح نکلے ہوں دونوں سیر کو،
جیسے چھٹی کا ہو دن
دیکھتے ہوں جیسے پہلی بار اپنے شہر کو

جل گئی تھی بتّیاں
آسماں کا نیل جب، اور بھی گہرا ہوا
اک عمارت کے تلے
آدمی نے زندگی کے رُخ کو دیکھا غور سے
نرم پیلی روشنی میں تھے عیاں
سارے تیکھے زاویے اور نرم خو گولائیاں
خوب صورت تھی عمارت، خوب رُو تھی زندگی
شہر کی جلتی بسوں پر آدمی کا بس نہ تھا
آہ، پر قربت کی آنچ!
مشتعل انبوہ سے نظریں بچا
آدمی نے زندگی کا ایک بوسہ لے لیا

ورلڈ بینک

بے پناہ طاقت نے
اک نظام کی تجویز
بے شمار کم زوروں
کے لیے مرتب کی

بے پناہ طاقت نے
اس پہ کتنی محنت کی!

بد شعار یہ کم زور
اس قدر نکمے ہیں
ننگ و فقر و فاقہ میں
جنتیوں کے شائق ہیں
جیب میں نہیں کوڑی
گیت سنتے رہتے ہیں
سر کو دُھنتے رہتے ہیں
بے پناہ طاقت سے
سر ہلا کے کہتے ہیں:
"واہ، کیا لیاقت ہے!

"کس طرح رہیں ہم لوگ
بس انھیں مسائل کی
خاک چھانتے ہیں آپ
آرزو کریں ہم کیا
ہم سے سو گنا بہتر
خوب جانتے ہیں آپ!"

بد لحاظ ناشکرے
گندگی میں بستے ہیں
بے پناہ طاقت پر
منہ چھپا کے ہنستے ہیں

یہ بھی سوچ سکتے ہیں
کون مان سکتا ہے

Scanned with CamScanner

ان کے دل میں کیا کچھ ہے
کون جان سکتا ہے

سِول سرونٹ

اپنی اپنی زندگی یہ لوگ پوری کر چلے
اور کسی نے ان سے یہ پوچھا نہیں کیوں کر جیے
اپنی اپنی پالکی میں سیرِ گلشن کو گئے
اور واپس آ گئے
گھر بنائے تین چار
اور تصرف میں رکھی دفتر کی کار
اس عمل میں ہو گیا ٹھنڈا مزاج
اس پہ اتنا کام کاج
سر پہ یہ کانٹوں کا تاج
تار و پود ہست و بود
سبز بیاہی کی طرح بنتا گیا سارا وجود
گھومتا ہے چند گز کے قطر میں کل راج پاٹ
افسری میں عمر بھر
مسکراتے مسکراتے ہو گئے چہرے سپاٹ

٭٭

Scanned with CamScanner

رگھوویر سہائے

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

ہنسو ہنسو جلدی ہنسو

ہنسو تم پر نگاہ رکھی جا رہی ہے

ہنسو، اپنے پر نہ ہنسنا کیوں کہ اس کی کڑواہٹ
پکڑ لی جائے گی اور تم مارے جاؤ گے
ایسے ہنسو کہ بہت خوش نہ معلوم ہو
ورنہ شک ہو گا کہ یہ شخص شرم میں شامل نہیں
اور مارے جاؤ گے

ہنستے ہنستے کسی کو جانے مت دو کس پر ہنستے ہو
سب کو ماننے دو کہ تم سب کی طرح ہار کر
ایک اپنا پے کی ہنسی ہنستے ہو
جیسے سب ہنستے ہیں بولنے کے بجائے

جتنی دیر اونچا گول گنبد گونجتا رہے، اتنی دیر
تم بول سکتے ہو اپنے سے

Scanned with CamScanner

گھٹ تھمتے تھمتے پھر ہنسنا
کیوں کہ تم چپ ملے تو خلل ڈالنے کے جرم میں پھنسے
آخر میں ہنسے تو تم پر سب ہنسیں گے اور تم بچ جاؤ گے

ہنسو، پر چٹکلوں سے بچو
اُن میں لفظ ہیں
کہیں اُن میں معنی نہ ہوں جو کسی نے سو سال پہلے دیے ہوں

بہتر ہے کہ جب کوئی بات کرو تب ہنسو
تاکہ کسی بات کا کوئی مطلب نہ رہے
اور ایسے موقعوں پر ہنسو
جو بے روک ٹوک ہوں
جیسے غریب پر کسی طاقت ور کی مار
جہاں کوئی کچھ کر نہیں سکتا
اُس غریب کے سوا
اور وہ بھی اکثر ہنستا ہے

ہنسو ہنسو جلدی ہنسو
اس کے پہلے کہ وہ چلے جائیں
اُن سے ہاتھ ملاتے ہوئے
نظریں نیچی کیے
اُن کو یاد دلاتے ہوئے ہنسو
کہ تم کل بھی ہنسے تھے

Scanned with CamScanner

رام داس

چوڑی سڑک گلی پتلی تھی
دن کا سمے گھنی بدلی تھی
رام داس اُس دن اُداس تھا
انت سمے آ گیا پاس تھا
اُسے بتا یہ دیا گیا تھا اُس کی ہتیا ہوگی

دھیرے دھیرے چلا اکیلے
سوچا ساتھ کسی کو لے لے
پھر رہ گیا، سڑک پر سب تھے
سبھی مَون تھے سبھی نہتّے
سبھی جانتے تھے یہ اُس دن اُس کی ہتیا ہوگی

کھڑا ہوا وہ بیچ سڑک پر
دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر
سدھے قدم رکھ کر کے آئے
لوگ سمٹ کر آنکھ گڑائے
لگے دیکھنے اُس کی طے تھا ہتیا ہوگی

نکل گلی سے تب ہتیارا
آیا اُس نے نام پکارا
ہاتھ تول کر چاقو مارا
چھوٹا لوہُو کا فوارا
کہا نہیں تھا اُس نے آخر اُس کی ہتیا ہوگی

ہتیا: قتل　　　مَون: خاموش　　　ہتیارا: قاتل

بھیڑ ٹھیل کر لوٹ گیا وہ
مرا پڑا ہے رام داس یہ
دیکھو دیکھو بار بار کہہ
لوگ نڈر اس جگہ کھڑے رہ
لگے بلانے انھیں جنھیں سنتے تھا جیا ہوگی

نشے میں دَیا

میں نشے میں دُھت تھا آدھی رات کے سنسان میں
اِک کوئی تا بولتا جاتا تھا اپنی جان میں

کچھ منٹ پہلے کیے تھے بِل پہ میں نے دستخط
خان ساماں سوچتا ہوگا کہ یہ سب ہے غلط

تم جو چاہو کھاؤ پی لو اور یہ سگریٹ لو
سن کے مجھ کو دیکھتا تھا وہ کہ اپنے پیٹ کو؟

پھر کھکار کر کے سگریٹ جیب میں میرے لیے
آج پی لوں گا اسے پر کل تو بیڑی چاہیے

ایک بنڈل ساٹھ پیسے کا بہت چل جائے گا
اس کی وہ ٹھنڈی نظر کہتی تھی کل کل آئے گا

ہوش کھو بیٹھے ہو تم کل کی فکر تم کو نہیں

سینٹ : شلنگ   دَیا : سخاوت

Scanned with CamScanner

تم جہاں ہو در اصل اس جگہ پر تم ہو نہیں
کتنے بچے ہیں؟ کہاں کے ہو؟ یہاں گھر ہے کہاں؟
چار ہیں، بجنور کا ہوں، گھر ہے مسجد میں میاں

قورمہ جو لکھ دیا میں نے تمہارے واسطے
خود وہ کھا لو گے کہ لے جاؤ گے گھر کے واسطے؟

سن کے وہ چپ ہو گیا اور مجھ کو یہ جتا گیا
رحم کر کے میں اٹھا اور جاوہ تن میں جگا

اک چٹورے کا نہیں اس پر ترس کھانے کا حق
اُف نشہ کتنا بڑا سکھلا گیا مجھ کو سبق

گھر پہنچ کر لکھ کے رکھ لوں گا جو مجھ میں ہو گیا
سوچ کر میں گھر تو پہنچا پر پہنچ کر سو گیا

اُٹھ کے وہ کہتا نہ تھی عقل پر آئی ضرور
اس کو کتنا ہوش تھا اور مجھ کو تھا کتنا سرور

پیدل آدمی

جب سیما کے اِس پار پڑی تھیں لاشیں
تب سیما کے اُس پار پڑی تھیں لاشیں
سکڑی ٹھٹھری ننگی انجانی لاشیں

سیما = سرحد

وہ اُدھر سے اِدھر آ کر کے مرتے تھے
یا اِدھر سے اُدھر جا کر کے مرتے تھے
یہ بحث راج دھانی میں ہم کرتے تھے

ہم کیا رُخ لیں گے یہ اس پر زیرِ بحث تھا
کس کا مرنے سے پہلے اُن کو ڈر تھا
پنکتی کے لیے الگ الگ افسر تھا

اتنے میں دونوں پردھان منتری بولے
ہم دونوں میں اِس برس دوستی ہو لے
یہ کہہ کر دونوں نے دروازے کھولے

پر راشٹر منتریوں نے دو رسم بتلائے
دو پارپتر اس کو جو اُڑ کر آئے
دو پارپتر اس کو جو اُڑ کر جائے

پیدل کو ہم کیول تب عزت دیں گے
جب دے کر کے بندوق اُسے بھیجیں گے
یا گھائل سے گھائل ادلیں بدلیں گے

پر کوئی بھوکا پیدل مت آنے دو
مٹی سے مٹی کو مت مل جانے دو
ورنہ دو سرکاروں کا جانے کیا ہو

**

زیرِ بحث: مسئلہ   پنکتی: قطار   رسم: پروٹوکول
پارپتر: پاسپورٹ   پروانہ: راہداری   کیول: صرف

Scanned with CamScanner

ثروت حسین

دن نکلتا ہے

دن نکلتا ہے کسی اُجلے کبوتر کی طرح
آج کس نے میرے دل پر ہاتھ رکھا دھوپ کے پر کی طرح
گھنٹیاں بجنے لگیں
ایک دروازہ کھلا
آج میرے ہاتھ میں اک پھول ہے
لوگ اُتریں گے پہاڑوں سے کسی دن شہد کے پیالے لیے
گھڑسواروں کے قدم سے جگمگائیں گے ببول
ہونٹ کھولیں گے رسُول
شاعری کا ساتھ ہے
اک پری کا ہاتھ ہے
جس کی انگلی میں انگوٹھی جگمگاتی ہے کسی دل کی طرح
دل کی تہ میں اک سمندر ہے جو بیدار کرتا ہے مجھے
پار کرنا ہے مجھے
اُس کنارے جاؤں گا

Scanned with CamScanner

گیت اور امید لے کر آؤں گا
تم یہاں اِس نہر کے پُل سے مجھے آواز دینا
زندگی اک شور ہے ہنستے ہوئے گھر کی طرح
دن نکلتا ہے کسی اُجلے کبوتر کی طرح

کاٹ دو اِس پیڑ کو

کاٹ دو اِس پیڑ کو
جس کے سائے میں کوئی ماندہ مسافر
ایک پل سویا نہیں
کاٹ دو اِس پیڑ کو
جس کے سائے میں کوئی عاشق کسی دن ٹوٹ کے
رویا نہیں

کھِل اُٹھے پھول تُم

کھِل اُٹھے پھول تُم
اپنی خوشبو میں گُم
ہر دریچے میں دن مسکرانے لگا
وہ پرندہ جو عرصے سے خاموش تھا
چہچہانے لگا

ہوائے شب کے سامنے

ہوائے شب کے سامنے دیا لیے ہوئے ترے مکاں تک گیا، ورق ورق گرے ہوئے تھے روشنی کے پھول دور تک زمین پر لکیر سی کھنچی ہوئی فلک تلک چلی گئی تو میں رکا، دیے کو طاق پر رکھا، اُتارا شاخ سے گلاب اور دور کی دِشاؤں کو سراہتا ہوا پیالہ بھر مسرتوں کی کھوج میں نکل کھڑا ہوا۔۔۔

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملاح

سمندر سے روٹھا ہوا ایک ملاح کل شام ساحل پہ یہ کہہ رہا تھا: فرشتو! مری بات مانو، سمندر کی جانب نہ جاؤ، یہیں ساحلی شہر کے بام و در کو سجاؤ کہ اِس رات کی دسترس میں ستارے نہیں ہیں۔ کسی نے کہا: میں سمندر میں اتروں گا، موتی چنوں گا، کسی جل پری سے وہ نغمہ سنوں گا جو دل میں شگوفے کھلاتا اُترتا ہے پانی میں آغاز کرتا ہے اُس عہد کا جو کسی نے بلندی پہ روشن منارے کی صورت اُسارا ہے جس کے دریچے کسی اور ہی آسماں کی طرف کھل رہے ہیں۔۔۔

بارشیں

(صلاح الدین محمود کے لیے)

برس گئیں
عجوبہ بارشیں برس گئیں
ریگ اور سنگ پر
برس گئیں
عجوبہ بارشیں برس گئیں
مری نظر کی آخری حدوں تلک
فلک فلک

برس گئیں
جو یہ بارشیں برس گئیں
اے ابرِ سبز تھم ذرا
کہ میں زمیں پہ گری ہوئی کتاب اٹھا سکوں
خوشی کا گیت گا سکوں

صبح اُترتی ہے شہر میں

ترتی گھنٹیاں بجاتی ہوئی صبح
اُترتی ہے شہر میں
فوارے کی اوٹ سے
بھیگا ہوا شہسوار
دیکھتا ہے
بار بار
زرد سنہری افق
جیسے فرشتہ کوئی
بکھیر رہا ہو زمیں پر ورق

پتھر کی بینچ

خالی پڑی رہتی ہے
پارک کے ایک کونے میں
ہوائیں گزرتی ہیں
پتوں کو گراتی ہوئی

فوارے کی موت

گیت ختم کیا پانی کا
ریت سے اَٹ گیا فوارہ
سوکھتے چلے گئے گل بوٹے
اب نہیں اترتے پرندے
کسی نے منایا نہیں سوگ
شاعر کے سوا۔۔۔

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے

شاعری روٹھ گئی ہے مجھ سے
آسماں چپ ہے، زمیں بات نہیں کرتی ہے
بہتا پانی کسی امید پہ آمادہ نہیں
خوش نہیں آتا کوئی لفظ کوئی دروازہ
کیسے بچھڑے ہوئے لوگوں کی خبر لاتے ہیں
کس طرح روٹھے ہوئے شخص کو گھر لاتے ہیں
شہد کی مکھیاں پھولوں کی طرف جاتی ہیں
ایک فوارے کے نزدیک شجر گنتا ہوں

Scanned with CamScanner

سیب کے باغ میں خود کلامی

باغ کے اندھیرے میں
سیب توڑ کر دیکھوں
آئنہ شکستہ ہے
پھر سے جوڑ کر دیکھوں
دشت و کوہ کی خاطر
شہر چھوڑ کر دیکھوں

آگ مجھ کو سبز کر

آگ مجھ کو سبز کر
اس قدر
کہ جنگلوں کے دیودار اپنا حُسن بھول جائیں
نہ دیر تک اُداس رکھ
ناشتے کی میز پر
دودھ کا گلاس رکھ
آگ ـــ
نان پز کے ہاتھ مت جلا
غالسوں کی کھیتیوں میں پھیل جا

**

ثروت حسین

ریت

سورج چمک رہا تھا۔ ہوا بھی گرم تھی۔ اُن کے اُٹھے ہوئے قدموں کے پیچھے ریت کے ذرّے دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ وہ اپنے پیروں کے نقوش ریت پر چھوڑتے، گرم ہوا کے تھپیڑوں میں اپنے شکستہ لبادوں کو سمیٹتے، اپنے اپنے سایوں کو روندتے، بغیر کوئی آواز کیے چلے جا رہے تھے۔ ریگستان میں ریت کے ٹیلے سر اُٹھائے خاموش کھڑے تھے؛ ان پر ہوا نے سلوٹیں ڈال دی تھیں۔ کہیں کہیں زرد پھولوں والے ناگ پھنی ہوا میں جھوم رہے تھے۔ وہ تین تھے اور گرم دن کے بیچ سر جھکائے چلے جا رہے تھے۔ اچانک ایک آدمی نے ٹھوکر کھائی۔ تینوں رک گئے۔ "کیا ہوا؟" یہ پہلے لفظ تھے جو رُکنے والوں کی زبان سے ادا ہوئے۔ وہ آدمی جس نے ٹھوکر کھائی تھی اور ریت پر جھکا ہوا تھا، بمشکل کھڑا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک اینٹ تھی جو دھوپ میں چمک رہی تھی۔

"ارے یہ تو سونے کی اینٹ ہے!" تینوں حیرت اور مسرت کے ساتھ بیک زبان چیخ اُٹھے۔ "ہم اس اینٹ کو تین برابر حصوں میں تقسیم کرلیں گے۔"

"ہمارے بھی دن پھر جائیں گے،" ایک نے کہا، جو کھجور کے تنکوں کی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ "پہلے کھانے کا بندوبست ہو جائے۔ بھوک بہت زور کی لگ رہی ہے،" دوسرے نے کہا۔ انھوں نے ایک آدمی کو کھانا لانے شہر کی طرف بھیج دیا۔ جب وہ کھانا لینے چلا گیا تو دونوں نے آپس میں طے کیا کہ یہ آدمی جیسے ہی کھانا لے کر آئے، اسے قتل کر دیں۔ اُدھر اُس آدمی نے سوچا

کہ میں کھانے میں زہر ملا دوں تو یہ دونوں مر جائیں گے اور اینٹ میری ہو جائے گی۔ چناں چہ جب وہ کھانا لے کر پہنچا تو اُن دونوں نے اُسے قتل کر دیا۔ جب اُن دونوں نے کھانا کھایا تو وہ بھی مر گئے۔ تینوں موت کی آغوش میں سو گئے۔

***

ماہ و سال گزرتے گئے۔ ریت کے ذرّے اور تودے ہوا میں اُڑتے رہے، ٹیلے اپنی جگہ بدلتے رہے۔ ریگستان کے بیچ تین گلے سڑے ڈھانچے اور ایک سونے کی اینٹ پڑی تھی جو اتنا وقت گزر جانے کے باوجود دھوپ میں چمک رہی تھی۔ ایک روز جب ہوا کی گونج ڈراوینے والی اور دھوپ تیز تھی، ایک لڑکا اپنے کتے کی زنجیر تھامے اُس ریگستان میں وارد ہوا۔ اُس نے دور سے دیکھا کہ تین انسانی پنجر ریت پر پڑے ہوئے ہیں۔ وہ لڑکا اُن کے قریب گیا تاکہ ان مردہ آدمیوں کے ڈھانچوں کے ساتھ پڑے ہوئے جستجو، اٹھ سکے۔ ارے، یہ کیا چیز ہے! لڑکے نے سونے کی اینٹ کو اُلٹ پلٹ کے دیکھا اور کندھے پر پڑے چمڑے کے تھیلے میں ڈال لیا۔ لڑکا زمین پر جھکا، دو زنگ خوردہ تلواریں، ایک پانی کی چھاگل، ایک انگوٹھی جو مرنے والے کی انگلی کے گرد اب بھی موجود تھی، لڑکے نے بمشکل اتاری۔ انگوٹھی میں ایک نگ جڑا تھا جس کی آب و تاب اب بھی باقی تھی۔ لڑکے نے چیزوں کو سمیٹا، کتے کی زنجیر تھامی اور چل دیا۔

***

جھونپڑی جنگلی جھاڑیوں کو کاٹ چھانٹ کر کھڑی کی گئی تھی۔ آڑی ترچھی لکڑیوں سے بلند کی ہوئی دیوار سے گرم ہوا آ رہی تھی۔ کچھ مٹی کے برتن زمین پر رکھے تھے۔ کھجور کی ٹہنیوں سے رکی ہوئی چھت سے سورج کی کرنیں نیچے چٹائی پر سوئے ہوئے آدمی پر پڑ رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سوئے ہوئے آدمی نے جماہی لی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر وہ کھڑا ہوا اور ٹٹول ٹٹول کر اُس طرف چلا جہاں پانی سے بھرا ایک مٹکا رکھا تھا۔ بینائی سے محروم وہ شخص پانی کے مٹکے تک گیا، مٹکے کے منہ پر ڈھکے ہوئے مٹی کے کوزے کو ہاتھ میں سنبھالا، مٹکے کو ایک طرف جھکایا یہاں تک کہ گرتے ہوئے پانی سے کوزہ بھر گیا۔ بینائی سے محروم شخص نے دونوں ہاتھوں سے کوزہ تھاما اور ایک ہی سانس میں پانی حلق میں اتار لیا۔ اُس کی داڑھی بھیگ گئی۔ وہ اندازے سے چلتا ہوا کھجور کی چٹائی پر پہنچا اور بیٹھ گیا۔ اُس کا لباس پھٹا ہوا تھا، گریبان کے چاک سے سفید بالوں سے بھرا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اتنے میں کتے کے بھونکنے کی آواز آئی اور ایک لڑکا کتے کی زنجیر تھامے جھونپڑی میں داخل ہوا۔

بابا! کھانے کو تو کچھ نہیں ملا، البتہ یہ دو تلواریں، ایک پانی کی چھاگل اور ایک انگوٹھی ریگستان سے ملی ہے، اور یہ ایک اینٹ ہے جو دھوپ میں چمکتی ہے۔ یہ کہہ کر لڑکے نے

Scanned with CamScanner

کاندھے سے چمڑے کا تھیلا اتارا اور چٹائی پر رکھ دیا۔ اینٹ نکالی اور بوڑھے آدمی کے ہاتھ میں تھما دی۔ بینائی سے محروم اُس بوڑھے آدمی نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اینٹ کو ٹٹول کر دیکھا۔ 'یہ تو مٹی کی ہے،' بوڑھے نے اینٹ ایک طرف چٹائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا۔ کتا اپنی زبان نکالے زمین پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔

'کل میں شہر جا رہا ہوں۔ شاید تلواروں، پیالوں اور انگوٹھی کے کچھ دام لگ جائیں،' لڑکے نے بوڑھے کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا اور ٹھہر ٹھہر کے سانس لیتے ہوئے، اپنی پتھریلی آنکھوں کو گھماتے ہوئے، چٹائی کے تنکے کریدتا رہا۔ کتا اب بھی خاموش تھا۔ تینوں خاموش تھے اور ہوا جھاڑیوں کی دیوار کے بیچ سے گزر رہی تھی۔

***

کئی دن ہو چکے تھے۔ بوڑھا جو رات اور دن میں تفریق نہیں کر سکتا تھا، چٹائی پر بیٹھا خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اچانک گھوڑے کی ٹاپوں کی دھمک قریب آتی سنائی دی۔ بوڑھے نے اپنا چہرہ دروازے کی طرف کر لیا۔ آنے والا جھونپڑی کے دروازے پر گھوڑے سے اُترا اور اندر داخل ہوا۔

'تھوڑا سا پانی مل جائے گا؟' اجنبی نے کہا۔ 'ہاں ہاں،' بوڑھے نے اثبات میں گردن ہلائی اور سوار کو پانی سے بھرے مٹکے کی طرف جانے کو کہا۔ آنے والے شخص نے بہ عجلت پانی پیا۔ اُسے یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ بوڑھا بینائی سے محروم ہے اور اکیلا ہے۔ آنے والے شخص نے چٹائی پر پڑی سونے کی اینٹ کو دیکھا اور ایک خیال اُس کے ذہن میں تیر گیا۔ اس نے آہستگی سے وہ اینٹ اٹھائی اور بوڑھے سے اجازت چاہتے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ گھوڑا دھوپ میں کھڑا اپنی دُم سے مکھیاں اُڑا رہا تھا۔ چاروں طرف گہری خاموشی تھی۔

***

طوفان شدید تھا۔ آندھی ریگستان کو اُڑائے لیے جا رہی تھی۔ سورج گرد و غبار کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ گھڑسوار ریت میں دھنستے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور گرم ریت پر گر پڑا۔ اُس کی تلوار نیام سمیت کمر سے الگ ہو کر دور جا گری۔ اس کا ساز و رخت سونے کی اینٹ کے ساتھ ریت میں دفن ہوتا جا رہا تھا۔ آسمان سے زرد ریت تواتر کے ساتھ برس رہی تھی۔

**

ثروت حسین

آدمی اور بیل

یہ داستان اشتر مزارع کی ہے جو بیان کی شاہان گڈریے نے۔

شاہان گڈریے کا بیان:

میرا نام شاہاں ہے۔ اس نام کا کوئی مطلب بھی ہوگا لیکن ایک گڈریے کے لیے اس بات میں کوئی دل چسپی نہیں کہ وہ اپنے نام کے مطلب سے بھی آگاہ ہو۔ میری عمر اب پینتالیس کے قریب ہے۔ میں پچھلے تیس برس سے بکریاں اور بھیڑیں چراتا ہوں۔ مویشیوں کی آواز اور چراگاہ کی خاموشی دونوں کو بخوبی سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں ایک گڈریے کے لیے اتنا علم بہت ہے۔ میں نے شادی نہیں کی؛ اس میں میرے کسی جسمانی نقص کو کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی آدمی کے داہنے پاؤں میں تھوڑا سا لنگ ہو تو یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر کوئی عورت اُس مرد کے لیے دروازہ وا نہ کرے۔ بات یہ ہے کہ میں حد درجے کا تنہائی پسند ہوں۔ اس سے یہ مطلب قطعی نہ نکالیے کہ میں ہجوم سے الگ تھلگ رہنے والا آدمی ہوں۔ میں یا تو مویشیوں کے ریوڑ کے درمیان رہتا ہوں یا پھر کسی پُررونق بازار میں آدمیوں کی بھیڑ میں چلتا ہوں۔

میں اشتر مزارع کے ریوڑ کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ یہ تعلق پچھلے پچیس برس سے ہے۔ پچیس برس — صدی کا چوتھائی ٹکڑا۔ ایک آدمی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ مدت بہت ہے۔ میں نے پچیس برس تک اس آدمی کو سوتے، جاگتے، باتیں کرتے اور راستوں سے گزرتے دیکھا ہے۔ موسم

Scanned with CamScanner

کبھی یک سے نہیں رہتے، کبھی بارش، کبھی خشک سالی، کبھی بہار کبھی گرم ہوائیں۔ آدمی کی زندگی میں بھی ہزار طرح کے موسم آتے ہیں۔ میں نے اشتر مزارع کو ہر موسم میں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو آدمی، جانور اور درخت سے یکساں محبت کرتا ہے۔

ہر آدمی کے پاس کم از کم ایک داستان تو ضرور ہوتی ہے: اس کی اپنی کہانی۔ اور اب جب کہ میں اشتر مزارع کی داستان بیان کرنے بیٹھا ہوں تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ میں اپنی داستان سے دور کیوں بھاگتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میں نے اپنی داستان کو اس بڑی داستان پر قربان کر دیا ہے جو کہیں زیادہ دل چسپ اور عظیم ہے۔ میری یومیہ اجرت صرف چھ تنگ چاندی ہے اور میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو دوسرے دن کے لیے بھی اٹھا رکھتے ہیں۔ اگر میرے پاس سنگ تراش اور مزدور کو دینے کے لیے چاندی کا ایک محفوظ ذخیرہ ہوتا تو میں اس داستان کو کسی دیدہ زیب پتھر پر کندہ کراتا یا کم سے کم مٹی کی تختیوں پر محفوظ کر لیتا۔ میں کوئی باقاعدہ داستان گو نہیں، اس لیے داستان جس طرح یاد آتی جائے گی سناتا جاؤں گا۔ ممکن ہے آپ لوگوں میں سے کوئی، یا آنے والے وقت کا کوئی اور، اس داستان کو شایان شان لفظ دے سکے۔

یہ داستان تموز کی ساتویں تاریخ سے شروع ہوتی ہے۔ یہ وہ مہینا ہے جب سورج آگ برساتا ہے اور سبزہ و گیاہ سوکھ کر جل جاتے ہیں۔ یہ دیوتاؤں کے غضب کا مہینا ہے۔ تموز کی ساتویں تاریخ کو اشتر مزارع کا ایک دوست اس سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ ایک بیل تھا۔ بیل خشک سالی اور لاغری سے ہڈیوں کا پنجر نظر آتا تھا۔ اس کا بڑا سا سر اور بہت بڑے بڑے دو سینگ کچھ عجیب سے دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ مجھے کسی اور زمین کی مخلوق لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کی دہشت اور بے چارگی تھی۔ اشتر مزارع کے دوست نے کہا:

میں اس بیل کی نگہداشت نہیں کر سکتا۔ میرے پاس گھر والوں کے لیے بہت کم غلہ رہ گیا ہے۔ تم یہ بیل رکھ لو۔

تب سے وہ بیل اشتر مزارع کی ملک میں شمار ہو۔ چالیس بکریاں، ساٹھ بھیڑیں، دو گدھے اور ایک بیل۔

دن، مہینے اور سال گزرتے گئے۔ خوب بارشیں ہوئیں۔ دریا پانی سے اور چراگاہیں سبزے سے بھر گئیں۔

اشتر مزارع کے پائیں باغ کے ساتھ ایک چھپر ہے۔ اس کے نیچے ایک بیل بڑی تمکنت کے ساتھ کھڑا ہے۔۔ ایک مضبوط، خوب صورت بیل۔ یہ وہی بیل ہے جسے دیکھنے سے کبھی خوف آتا تھا۔ اب وہ صحت مندی اور خوب صورتی کا ایک نمونہ ہے جسے لوگ دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ اودے رنگ کا ایک پارچہ اس کی پیٹھ پر پڑا رہتا ہے۔ اس کی پیشانی سے منڈھی ہوئی بڑی بڑی

Scanned with CamScanner

سینگیں دھوپ میں چمکتی ہیں۔ ایک بیل کی خوب صورتی پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے شروع میں کہا، میں کوئی باقاعدہ داستان گو نہیں، نہ ہی شاعر ہوں، اس لیے میں بیل کی خوب صورتی پر اپنا بیان ختم کرتا ہوں اور اصل داستان کی طرف آتا ہوں۔

تشری کا تہوار آغاز پر تھا۔ گندم اور جو کے کٹے ہوئے خوشوں سے چھوترے اور اناج گھر بھر گئے تھے۔ اور پھر وہ دن بھی آ گیا۔ جو کی شراب پیے ہجوم کے جلو میں پروہت اور اس کے مددگار راستوں اور کھیتوں سے گزر رہے تھے۔

جب وہ اشتر مزارع کے پائیں باغ کی طرف سے گزرے تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایک مضبوط بیل اپنے چاروں پیر جمائے وہاں چنار کے نیچے کھڑا تھا۔ یہ ساتواں بیل تھا جو قربانی کے لیے منتخب کیا گیا۔ آج اشتر مزارع گھر پر نہیں، وہ ایک دوسرے شہر گیا ہوا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں، پروہت اور اس کے مددگار اشتر کے بیل کو ہانک کر لیے جا رہے ہیں مگر ایک گڈریا پروہت سے، اس کے کارندوں سے اور جو کی شراب پیے ہجوم سے کیسے مقابلہ کر سکتا ہے۔ پھر دیوتاؤں کی ناراضگی الگ رہی۔

دوسری صبح خداوند زیوس کی قربان گاہ پر پتھر کی ایک ناند لائی گئی۔ پروہت نے اُسے مقدس پانی سے دھویا اور اس میں گندم اور جو کا گندھا ہوا آٹا رکھ دیا۔ مددگار آئے اور انھوں نے ناند کو اٹھا کر میدان کے بیچ گاڑ دیا اور پھر بیلوں کو اس طرف ہنکایا گیا۔ جو بیل آٹا سونگھتا اُسے نیزوں کا نشانہ بنا دیا جاتا۔

میں نے دیکھا اشتر مزارع کا بیل ناند کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اتنے میں ایک شخص بھیڑ کو چیرتا ہوا وہاں ناند کے پاس آیا اور بیل سے لپٹ گیا۔ وہ اشتر مزارع تھا جو کسی دوسرے شہر سے ابھی ابھی یہاں پہنچا تھا۔ لوگوں نے دیکھا اشتر مزارع اور اس کا بیل دونوں نیزوں سے چھلنی ہیں اور گرم گاڑھے خون کے فوارے اُبل رہے ہیں۔ لوگوں نے دیکھا ایک آدمی اور ایک بیل کا خون ایک ہی طرح سے بہتا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ثروت حسین

پانی کے گیت کا انجام*

دریاب خان کو ہوش آ گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ کسی اسپتال کے ایک بڑے ہال نما کمرے میں بستر پر پڑا ہے۔ اس کے سامنے چھت پر لگا ہوا پنکھا مسلسل گھوم رہا ہے اور بائیں ہاتھ پر بالکل قریب کھڑکی کے پردے آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔ داہنی طرف تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کچھ بستر اور ہیں۔ پیروں کی طرف، دیوار سے پہلے، آنے جانے کے لیے راستا ہے جس کے آخر پر جالی دار دروازہ ہے۔ صبح کی خنک خاموشی میں کبھی کبھی کسی کے بات کرنے کی آواز یا قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔

دریاب خان کی آنکھیں پوری طرح کھل چکی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کسی خواب سے جاگا ہے یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے یہاں اسپتال میں کون لایا؟ کیا حادثہ پیش آیا تھا اسے؟ اس کے حافظے میں شکلوں اور آوازوں کا بھنور سا چکرانے لگا۔ پھر یہ بھنور دھندلے سے ایک منظر پر ٹھہر گیا۔ اسے یاد آیا: شام تھی اور وہ پاراچنار ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر کے سامنے فٹ پاتھ سے گزر رہا تھا۔ بس اسٹاپ سے کچھ پہلے اسے بائیں ہاتھ میں درد کی لہر سی اٹھتی محسوس ہوئی۔

---

* پابلو نیرودا کی ایک نظم کا عنوان

پھر درد شدید ہوتا گیا اور آس پاس جو کچھ تھا تیزی سے گھومتا ہوا لگا۔ پھر وہ زمین پر گر پڑا تھا،

بے سُدھ، درد سے تڑپتا ہوا، اور لوگ اس کے گرد اکٹھے ہو رہے تھے۔ اُسے لوگوں کے پیر بہت قریب اور چہرے بہت دور نظر آ رہے تھے۔ پھر آسمان قریب آ گیا تھا اور آواریں، چہرے، ہاتھ، عمارتیں، سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اس سے آگے اُسے کچھ یاد نہ آیا۔

اس نے بے خیالی میں اپنے سر کو اٹھانا چاہا تو نقاہت سے اس کا سر دوبارہ تکیے میں دھنس گیا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ابھی زندہ ہے اور اسپتال کے بستر پر پڑا ہے۔ اس نے دیکھا کہ اس کے کپڑے تبدیل کیے جا چکے ہیں اور ایک سفید چادر اس کے پیروں پر پڑی ہے۔ کھڑکی سے باہر کہیں قریب ہی کوّے بول رہے تھے۔ کوّوں کی آواز کا خیال کرتے ہی اُسے اپنا آبائی مکان یاد آیا جہاں دروازے کے ساتھ ہی نیم اور پیپل کے دو درخت پتی گھنی، پھیلی ہوئی شاخوں کے ساتھ نہ جانے کب سے کھڑے تھے۔ صبح اور شام کوّوں کے غول کے غول ان پر اُترتے اور شور مچاتے تھے۔ پیپل کی جڑوں کے پاس لال اینٹوں سے بنی ہوئی ایک گھڑونچی تھی جس پر دو مٹکے ہمیشہ موجود رہتے۔ موٹے بانوں والا ایک پلنگ بھی وہاں پڑا رہتا جس پر اس کا باپ اکثر ستایا کرتا۔ پھر اس نے دیکھا جاگنے کا چکر کھاتا بھنور باپ کے چہرے میں بدل گیا ہے اور باپ اُسے پکار رہا ہے۔ تب اُسے یاد آیا کہ اس کا ایک نام بھی ہے اور وہ اپنے اس نام کے ساتھ چھیاسٹھ برس تک زمین پر چلتا رہا ہے --- دوڑتا رہا ہے۔ پناہ کے لیے، انتقام کے لیے، پیسوں کے لیے، اپنے خاندان کی خوشیوں کے لیے۔ سکون و آرام سے کوسوں دور --- قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، شہر شہر --- بغیر رکے ہوئے، بغیر تھکے ہوئے۔ اور اب وہ گر پڑا ہے۔ چھیاسٹھ برس تک اپنی سیدھی کمر اور پورے ہاتھ پیروں سے چلنے کے بعد وہ اس طرح گرا ہے کہ اٹھنا اس کے بس میں نہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ان گھوڑوں کے مضبوط جسم تیر گئے جنھیں اس نے گرتے ہوئے دیکھا تھا اور جو پھر نہ اُٹھ سکے۔ اُسے یاد آیا کہ ایک جلتی دوپہر جب وہ روٹی لے کر باپ کی دکان کو جا رہا تھا، چوک پر تانگے میں جتا ہوا گھوڑا سڑک پر گر پڑا تھا۔ تانگے والے نے جلدی جلدی تمام کسی ہوئی پیٹیاں کھول دی تھیں اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کو سہارا دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ مضبوط سیاہ جسم والا گھوڑا اٹھ نہیں پا رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں عجیب سی دہشت اور بے چارگی تھی۔ گرے ہوئے گھوڑے کی آنکھیں کئی دن تک اس کے دھیان میں پھرتی رہیں۔ پھر اُسے وہ ایک شام یاد آئی جب دروازے پر کھڑے دونوں درخت بالکل خاموش تھے اور بستی کے مکانوں پر اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا باپ اپنا زخمی بدن لیے، خون میں نہایا ہوا آیا تھا اور پیپل کی جڑوں پر بے دم ہو کر گر پڑا

Scanned with CamScanner

تھا۔ اس کا باپ گولی لگنے کے باوجود تین میل سے چلتا ہوا آرہا تھا اور اب اپنے دروازے پر اپنے لوگوں اور درختوں کے درمیان دم توڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اپنے بیٹوں اور بھائیوں پر جمی تھیں۔ دریاب خان نے دیکھا تھا۔ مرتے ہوئے باپ کی آنکھوں میں گرے ہوئے گھوڑے کی وحشت اور بے چارگی تھی۔

آدمی اپنے لوگوں کے درمیان ہی کیوں مرنا چاہتا ہے؟ جیسے اس نے خود ہی سے سوال کیا ہو۔ اور پھر اس احساس نے اسے شدت سے آلیا کہ وہ اپنے مکان، اپنے درختوں اور اپنے لوگوں کی آنکھوں سے بہت دور یہاں اسپتال کے بستر پر پڑا ہے اور مر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ان دنوں کو یاد کیا جب اس کا خون گرم تھا اور چیزوں پر گرفت مضبوط تھی۔ اُن دنوں جب بھی وہ اپنی موت کے بارے میں سوچتا تو یہی کہ وہ بھی کسی خاندانی تنازعے میں اپنے باپ کی طرح گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا یا اپنے بھائی کی صورت تودہ گرنے سے ہلاک ہو جائے گا۔۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دادا کی طرح لمبی عمر پا کر اپنے آبائی مکان میں خاموشی سے چل بسے۔ لیکن یہ آخری صورت اُسے پسند نہ آتی۔ اور اب یہاں، جنوب کے ایک دور دراز شہر میں اپنے لوگوں کی آنکھوں اور ہاتھوں سے بہت دور وہ گر پڑا ہے۔ کوئی گولی نہیں چلی، کوئی تودہ نہیں گرا، اور وہ گر پڑا ہے اور مر رہا ہے۔ دریاب خان مر رہا ہے۔ یہ سوچ کر اس کی آنکھیں بھر آئیں اور گرم گرم آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ بہا۔

اس نے خود کو ایک تیز رفتار، سرکش پہاڑی دریا کے بیچ پایا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کہیں تک نہیں رہے اور تیز بہاؤ میں اس کا جسم شل ہو چکا ہے۔ اسے لگا کہ کنارا، درخت، بچے، پھول، انسان، حافظہ، آسمان، سب کچھ اس کے ہاتھوں سے نکلتا جا رہا ہے۔

رات کے کسی پہر ہسپتال کے کارڈیو ویسکولر یونٹ میں ایک مرنے والے کا اندراج کیا گیا۔ نام نہ معلوم ہونے کے سبب صرف بیڈ نمبر درج کیا گیا اور لاش مُردہ خانے میں بھیج دی گئی۔

مرنے والے کے کپڑوں سے کچھ نوٹ اور ایک مُڑا تُڑا لفافہ نکلا جس پر لکھا تھا:

شانگی بار رشوں پہنچ کر گل خان ولد دریاب خان موٹر مکینک کو ملے۔

**

Scanned with CamScanner

نیر مسعود

بائی کے ماتم دار

یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی، یا شاید کسی کو بھی نہ معلوم ہو، کہ لڑکپن میں ایک مدت تک میں دُلھنوں سے بُری طرح خوف کھاتا رہا ہوں۔ خوف کی وجہ ایک روایت تھی جو ہمارے خاندان میں پشتوں پہلے کی ایک دُلھن کے بارے میں بیان کی جاتی تھی۔

یہ روایت سننے سے پہلے مجھ کو بھی، اپنے دوسرے ہم عمروں کی طرح دلھنوں میں ایک کشش محسوس ہوتی تھی۔ کسی شادی میں میری شرکت ہوتی تو میں دلھن کے زیادہ سے زیادہ قریب گھس کر بیٹھتا اور اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو اور اس کے سُرخ لباس کو اور اس کے زیوروں کو بار بار چھُوتا تھا۔ دلھن کے پاس سے اٹھتی ہوئی پھولوں اور عطروں کی اور دوسری، پہچان میں نہ آنے والی، خوشبوؤں کی لپٹیں مجھے اپنی طرف کھینچتی تھیں اور اس کے زیوروں کی ہلکی ہلکی کھنک مجھے اچھے سے اچھے سازوں کی آواز سے اچھی لگتی تھی۔ میں یہ بھی دیکھتا تھا کہ ہر عورت دلھن بن کر خوب صورت اور نرم ہو جاتی ہے اس لیے میں ہر دلھن کی عارضی محبت میں گرفتار ہو جاتا اور جب وہ رخصت ہو کر اپنے دولھا کے ساتھ چلی جاتی تو کچھ دیر تک ایسے عاشق کی طرح اُداس رہتا جس سے اُس کی محبوبہ چھین لی گئی ہو۔

Scanned with CamScanner

لیکن ایک رات، جب خوب بارش ہو رہی تھی، میں نے اپنے خاندان کی اس دلھن کا قصہ سنا۔ وہ نکاح کے بعد اپنے ماں باپ کے گھر سے رخصت کر دی گئی تھی لیکن جب دولھا کے گھر پر اُسے اتارا جانے لگا تو معلوم ہوا وہ راستے ہی میں مر چکی ہے۔ اُس کا نچلا ہونٹ دانتوں کے بیچ میں آ کر کٹ گیا تھا، بدن اکڑ چلا تھا اور ایک بڑا سا کنکھجورا اس کی پنڈلی میں اتر ہوا تھا۔ پرانے کنکھجورے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ آدمی کی جلد میں اپنی آنکڑے دار ٹانگیں پیوست کر دیتا ہے اور دھیرے دھیرے گوشت کے اندر دھنستا ہوا ہڈی تک پہنچ جاتا ہے۔ آخر کچھ اس کے زہر کی وجہ سے مگر زیادہ تر تکلیف سے آدمی مر جاتا ہے۔ یہ دلھن تکلیف سے مری۔ اگر وہ بتا دیتی کہ کنکھجورا اس کی پنڈلی میں لپٹ گیا ہے تو اس کی جان بچ سکتی تھی، لیکن اس زمانے میں کسی دلھن کا بول پڑنا بے حیائی کا ثبوت سمجھا جاتا تھا، اس لیے وہ خاموش رہی اور تکلیف اٹھاتی رہی اور چپ چاپ مر گئی۔

"اگر وہ ذرا ایک بار اُف بھی کر دیتی،" یہ قصہ سنانے والی عزیزہ نے کہا تھا، "تو کیڑے کو گرم چمٹے سے پکڑ کر کھینچ لیا جاتا، نہیں تو اس پر مٹھی بھر شکر ہی ڈال دی جاتی، وہیں کا وہیں گھل کر رہ جاتا۔"

یہ شکر والی بات میری بھی سمجھ میں آئی اس لیے کہ اس زمانے میں جب بھی گھر میں کوئی بڑا کنکھجورا نکلتا ہم لوگ لپک کر اس پر شکر ڈال دیتے تھے۔ وہ کچھ دیر تڑپتا، پھر گھلنے لگتا اور دیکھتے دیکھتے پانی ہو جاتا تھا۔

مجھے اس بے زبان دلھن کے ساتھ ہمدردی بلکہ اتنی پشتیں گزر جانے کے بعد بھی کچھ محبت محسوس ہوئی، لیکن اس کا قصہ یہاں پر ختم نہیں ہوتا تھا۔ سنانے والی نے آگے بتایا کہ اس کی موت پر خوشی کے گھروں میں کہرام مچ گیا۔ اور دونوں گھروں نے فیصلہ کیا کہ دلھن کو اسی طرح، پورے سنگار کے ساتھ، عروسی جوڑے اور سارے زیوروں سمیت، دفن کیا جائے۔ اور اسی دن شام سے پہلے "دلھن" کو قبر میں اتار دیا گیا۔

لیکن وہ قبر میں چین سے سو نہیں سکی۔ اسی رات ایک آدمی چپکے سے قبرستان میں پہنچا اور تازہ قبر کھول کر اس کے اندر اتر گیا۔ اس کی چیخیں سن کر آس پاس کے لوگ دوڑے تو دیکھا وہ قبر میں دلھن کے پاس بے ہوش پڑا ہوا ہے اور اس کے ہاتھوں اور چہرے پر زیوروں کے نشان ثبت ہیں۔ دونوں گھروں کے لوگ بھی اطلاع ملتے ہی قبرستان پہنچے۔ تب پتا چلا کہ قبر میں اترنے والا اسی دلھن کا شوہر ہے۔ اسے باہر نکالا جانے لگا تو دلھن کا بدن بھی کچھ دور تک اس کے ساتھ اٹھتا چلا آیا، پھر اس سے چھوٹ کر قبر کی زمین پر گر گیا۔

میت کی بعض رسمیں جلدی جلدی پھر سے ادا کر کے قبر کو دوبارہ بند کر دیا گیا اور سب لوگ

شوہر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہوش میں آنے کے بعد سے وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ پہلے اس نے بتایا کہ دلہن کے زیوروں نے اس کو پکڑ لیا تھا اور اس کے بدن میں پیوست ہوئے جا رہے تھے۔ پھر کہنے لگا کہ خود دلہن نے اسے دبوچ لیا تھا، پھر بتایا کہ دلہن کا پورا بدن اس کے بدن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ شروع میں اس نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا کہ وہ قبر میں اترا کیوں تھا۔ جب اس کے ہوش ذرا زیادہ درست ہوئے تو اس نے کہا کہ صرف اپنی دلہن کو ایک نظر دیکھنے کے لیے اس نے قبر کھولی تھی، لیکن اپنے آپ ہی اس نے بتا دیا کہ وہ قبر کے اندر اتر کر دلہن کے زیور اتار رہا تھا۔

کئی دن تک وہ باولا سا اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ آخر ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ اسی قبرستان میں دلہن کی قبر کے پائینتی مرا پڑا ہے۔ اس کے بعد سے یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ دلہن کی قبر میں اچھا خاصا خزانہ موجود ہے، کسی کفن چور تک نے اُدھر کا رخ نہیں کیا، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ قبر بے نشان ہو گئی۔

یہ قصہ سن کر مجھ کو پہلی بار دلہن ایک خوفناک چیز معلوم ہوئی اور بارش کی آواز میں مجھے زیوروں کی مدھم جھنکار سنائی دینے لگی۔ اسی وقت میرے ایک بڑے بھائی بولے:

اصل میں دلہن مری نہیں تھی۔ لوگوں نے اسے مُردہ سمجھ کر زندہ دفن کر دیا اور وہ بے چاری شرم کے مارے بتا بھی نہیں سکی کہ میں زندہ ہوں۔" اس پر کچھ لوگ ہنس پڑے اور قصہ سنانے والی نے اُن بھائی کو ڈانٹا کہ ایسی باتوں کا مذاق نہیں بنانا چاہیے، لیکن مجھے یہ سوچ کر کہ دلہن زندہ دفن تھی، اور زیادہ ڈر لگا، اور جب میں نے خود کو یقین دلایا کہ وہ قبر میں مری پڑی تھی تو وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ ڈراونی معلوم ہونے لگی۔

کئی دن تک مجھ کو اُس کا خیال آتا رہا۔ کبھی میں اُسے زندہ تصور کرتا کبھی مُردہ، اور ہر صورت میں وہ مجھ کو پہلی صورت سے زیادہ ڈراتی تھی، اور اس کے زیور اُس سے بھی زیادہ ڈراتے تھے، یہاں تک کہ میں شادی کی تقریبوں میں دلہن کے قریب جانے سے، بلکہ شادی کی تقریبوں ہی سے گھبرانے لگا۔ کچھ عرصے بعد دھیرے دھیرے میرا خوف کم ہونا شروع ہوا، لیکن دُلہنوں میں جو کشش مجھ کو پہلے محسوس ہوتی تھی وہ بالکل ختم ہو گئی۔

انہیں دنوں ہمارے مکان کے سامنے سڑک پار کے مکان میں ایک شادی ہوئی جس میں مجھ کو شرکت کرنا پڑی۔

***

وہ چھجے والا مکان کہلاتا تھا کیوں کہ اس کی اوپری منزل والے دونوں کمروں کے آگے سڑک کے رخ ایک چھجا بنا ہوا تھا۔ اس مکان میں ہم لوگوں کا آنا جانا تھا۔ جس لڑکی کی شادی تھی اس کے

Scanned with CamScanner

دو چھوٹے بھائی میرے دوست تھے۔ لڑکی چلبلی اور باتونی تھی۔ وہ مجھ کو خواہ مخواہ چھیڑا کرتی اور کبھی کبھی ایسی باتیں کرتی کہ میں اس سے کچھ گھبرانے، کچھ شرمانے لگا تھا۔ لیکن مجھ کو اس کی چھیڑ چھاڑ اچھی سی لگتی تھی، جس طرح وہ خود اچھی لگتی تھی۔

شادی کے کام کاج میں گھر کے اندر اور باہر اپنے دوستوں کے ساتھ میں بھی لگا رہا۔ کئی بار کسی شعلے کی لپک کی طرح میرے دل میں یہ خواہش ابھری اور دم بھر میں غائب ہو گئی کہ دلھن کے پاس بیٹھوں اور اسے چھو کر دیکھوں۔ نکاح کے بعد جب دلھن کی رخصتی کا وقت آیا تو میں نے وہاں سے ٹل جانا چاہا لیکن دوستوں نے مجھ کو پکڑ لیا۔ نیچے، مکان کی لمبی ڈیوڑھی میں، عورتوں کا مجمع تھا۔ میں بھی وہیں ایک دیوار سے ٹک کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر میں دلھن اوپری کمرے سے نیچے لائی گئی۔ باہر سڑک پر سواری تیار تھی اور ڈیوڑھی میں دلھن ایک ایک سے رخصت ہو رہی تھی۔ عورتیں باری باری اسے گلے لگاتیں اور زور زور سے روتیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھر میں شادی نہیں موت ہوئی ہے اور ماتم داروں میں رونے کا مقابلہ ہو رہا ہے۔ ان میں بعض کے منھ ایسے بنتے تھے کہ دیکھ کر ہنسی آ جاتی تھی، اور میں آئندہ کسی دوسروں کو ہنسانے کے خیال سے دل ہی دل میں ان کے رونے کی نقلیں اتار رہا تھا۔ اسی وقت ڈیوڑھی کے دروازے پر سے کسی مرد نے ڈانٹ کر عورتوں کو چپ کرایا اور کہا کہ دلھن کو فوراً سوار کیا جائے نہیں تو اسٹیشن پہنچتے پہنچتے گاڑی چھوٹ جائے گی۔ ڈیوڑھی میں خاموشی پھیل گئی اور دلھن عورتوں کے جھرمٹ میں اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کے کندھوں پر جھکی ہوئی، زیوروں کی ہلکی جھنجھناہٹ کے ساتھ آہستہ آہستہ ڈیوڑھی کے باہری دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ دو عورتیں اس کے نیچے لباس کو چٹکیوں میں پکڑے زمین سے کچھ اوپر اٹھائے ہوئے تھیں۔ سرخ جوڑے اور لمبے سے گھونگھٹ میں دلھن کا کچھ بھی ظاہر نہیں تھا، البتہ کارچوبی جوتی کو چھوتی ہوئی بھاری پازیب کے اوپر اس کی ایک پنڈلی کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی۔ جب وہ میرے آگے سے گزرنے لگی تو مجھے حیرت ہوئی کہ دلھن بننے کے بعد وہ سکڑ کر اتنی سی کیوں کر رہ گئی۔ اس کو ذرا غور سے دیکھنے کے لیے میں نے اپنے سامنے کھڑی ہوئی دو عورتوں کے بیچ سے گردن تھوڑی آگے بڑھائی، اور اس نے معلوم نہیں کس طرح اپنے چہرے پر پڑے ہوئے دُہرے گھونگھٹ اور پھولوں اور مقیش کے سہروں کی لڑیوں کے پیچھے سے مجھے دیکھ لیا۔ اس کے بدن میں سر سے پیر تک تڑپ سی پیدا ہوئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے کھڑی ہوئی دونوں عورتیں اچانک ایک بڑا سا سرخ دھبا ہو کر رہ گئیں۔ میں نے زیوروں کی تیز جھنکار سنی اور دیکھا کہ دلھن میرے سامنے پورے قد سے کھڑی ہوئی ہے۔ پھر وہ جھکی اور مجھے چمٹا کر رو• ور سے رونے لگی۔ پھولوں، عطروں اور دلھن کے بدن کی خوشبوؤں نے مل کر ایک ساتھ مجھ پر حملہ کیا۔ اس کی کلائیوں کے جڑاؤ کنگن مجھے اپنے شانوں میں پیوست ہوتے محسوس ہوئے اور ان کی

چُھن کے پیچھے اس کے ہاتھوں کا نرم لمس غائب ہو گیا۔ عورتوں نے اس کو کھینچ کر مجھ سے الگ کیا، لیکن اس کے گلے میں پڑے ہوئے سونے کے لمبے ہار کا کوئی حصہ میری قمیص کے کھلے ہوئے بٹن میں پھنس گیا تھا۔ چھڑانے کی کوششوں میں وہ کچھ اور الجھ گیا۔ اب دلہن مجھ سے دو تین قدم کے فاصلے پر بالکل جھکی ہوئی کھڑی تھی، میرے اور اس کے بیچ میں سونے کا ہار چمک رہا تھا اور کئی عورتیں میری قمیص کے بٹن کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ڈیوڑھی میں رونے کی آوازیں تیز ہونے لگیں اور اسی وقت اچانک مجھے اُس دلہن کا خیال آ گیا جس کے زیوروں نے ایک آدمی کو چپکا لیا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے وہی دلہن کھڑی ہے، بلکہ گھونگھٹ اور سہروں کے پیچھے مجھ کو اُس کا مٹیالا چہرہ بھی نظر آنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ قدم اٹھائے بغیر میری طرف بڑھ رہی ہے اور قریب ہے کہ اس کا بدن مجھ سے یا میرا بدن اُس سے چپک کر رہ جائے۔ انھیں چند لمحوں کے اندر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ ڈیوڑھی میں اس کے اور میرے سوا کوئی نہیں ہے، بلکہ ڈیوڑھی بھی نہیں ہے، ایک تازہ قبر ہے جس کے کھلے ہوئے منہ پر کسی ٹیڑھے بکڑے درخت کی شاخیں جھکی ہوئی ہیں۔

میں پیچھے گھوم کر دیوار سے ٹکرایا، پھر ڈیوڑھی کی بھیڑ کو چیرتا ہوا باہر نکلا اور دلہن کے ہار کی ایک چھوٹی سی سنہری پتّی کو اپنی قمیص کے بٹن میں الجھائے ہوئے سڑک پار کر کے بھاگتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔

***

میں نے اپنے گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا، لیکن اس واقعے نے مجھے بیمار سا کر دیا۔ اپنے مکان کے خالی حصوں میں جا کر مجھے احساس ہوتا کہ ابھی کسی چیز کی آڑ سے کوئی دلہن نکل کر میری طرف بڑھے گی۔ رات کو سوتے سوتے مبہم آوازوں سے میری آنکھ کھل جاتی اور ناک میں ملی جلی خوشبوئیں آنے لگتیں جو میرے جاگنے کے بعد بھی تھوڑی دیر تک آس پاس منڈلاتی رہتیں۔ پانی برسنے کی آواز یا کسی اور مسلسل شور کے پیچھے مجھے رونے کی آوازیں اور زیوروں کی مدھم سی کھنک سنائی دیتی۔ میں غیر استعمالی کمروں کے خفیف سے کھلے ہوئے دروازوں کے قریب سے ہو کر نہیں گزر سکتا تھا اس لیے کہ کئی مرتبہ مجھے ان کی درازوں کے پیچھے غائب ہوتی ہوئی سفید پنڈلی اور اس پر چپکا ہوا سیاہ گھنگھرو دکھائی دیا تھا۔

بیچ والے مکان کے لوگ شادی کے تھوڑے ہی دن کے اندر کہیں اور اٹھ گئے تھے اور ان کے بعد وہاں ایک بوڑھے میاں بیوی آ کر رہنے لگے تھے، لیکن جب تک وہ مکان خالی رہا اس کی ڈیوڑھی کے سامنے سے گزرتے وقت میرے قدم اکھڑے جاتے تھے۔ اگر کبھی اس کا دروازہ ذرا سا کھلا نظر آتا تو مجھے شبہ ہوتا کہ میں نے ڈیوڑھی کے اندھیرے میں زیوروں کی چمک دیکھی ہے، اور

Scanned with CamScanner

میں یقین کر لیتا کہ اگر دروازے کی جھری سے جھانکوں گا تو مجھ کو وہاں پر دلہن نظر آئے گی: بیچ والے مکان کی باتونی دلہن نہیں، مجھ سے کئی پشت پہلے کی چُپ چاپ مر جانے والی دلہن۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب نظر کے دھوکے اور میرے وہم ہیں، لیکن مجھ کو نظر کے دھوکے اصلی منظروں سے زیادہ اصلی، اور وہم حقیقتوں سے بڑی حقیقت معلوم ہوتے تھے۔

***

مجھے یقین تھا کہ میری ساری زندگی اسی خوف کے ساتھ گذرے گی، لیکن نوجوانی کا زمانہ

[illegible] ہو چلا گیا اور دلہن رفتہ رفتہ اپنا اثر

وہ محلے کے گھروں میں آتی جاتی تھی —زیادہ تر نوکروں سے باتیں کرنے کے لیے— اور اُن میاں بیوی کے بارے میں ہماری معلومات کا خاص ذریعہ تھی۔

وہ بیوی کو بائی اور میاں کو صاحب کہتی تھی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ یہ بےاولاد لوگ ہیں۔ بائی کے عزیزوں میں کوئی نہیں ہے، صاحب کے دور کے رشتہ دار بہت ہیں جن میں سے کئی اسی شہر میں ہیں لیکن اُن سے ان لوگوں کا ملنا جلنا کب کا ختم ہو چکا ہے، البتہ ان رشتہ داروں میں جب کوئی بہت بیمار ہوتا ہے یا کسی کے یہاں موت ہو جاتی ہے تو صرف صاحب وہاں ہو آتے ہیں۔ بائی کہیں نہیں جاتیں۔ ان کے گھٹنوں میں پرانی تکلیف ہے جس کی وجہ سے ان کا بیٹھ کر اٹھنا مشکل اور زینے اُترنا چڑھنا بالکل ناممکن ہے۔

ایک بار اس نے میری والدہ کے سامنے بائی کی اس تکلیف کا ذکر کیا تو والدہ نے اسے مالش کے ایک تیل کا آسان سا نسخہ بتایا جس کے ایک جُز کے وزن میں انھیں کچھ شک پڑ رہا تھا۔ خانم کے جانے کے بعد والد صاحب گھر کے اندر آئے تو والدہ نے ان سے اس جز کا وزن دریافت کیا۔ اس کے بعد بائی اور صاحب کی باتیں ہونے لگیں۔ معلوم ہوا کہ والد صاحب ان دونوں کے حالات سے کچھ کچھ واقف ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بائی نوجوانی میں شہر کی مشہور گانے والی تھیں۔ انھوں نے بائی کا وہ نام بھی بتایا جس سے اُس زمانے میں شہر کا ہر شوقین واقف تھا، اور یہ بھی بتایا کہ صاحب پرانے رئیس زادے تھے۔ ان کا وقت گزر گیا تھا لیکن وہ بائی کے گانے کے سب سے بڑے قدردان تھے۔ اُسی زمانے میں بائی کے ساتھ ان کی شادی ہو گئی تھی جس کے بعد دونوں شہر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

آپ نے ان کا گانا نہیں سنا؟ والدہ نے ہنستے ہنستے پوچھا۔

والد صاحب بھی ہنسنے لگے۔

"ہم نہ شوقین تھے نہ رئیس زادے،" انھوں نے کہا، "اُس وقت اسکول میں پڑھتے تھے۔ فیس کے لیے دوڑ دھوپ سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ ان کا گانا تو کیا سنتے، گانے کی دھوم ضرور سنا کرتے تھے۔"

***

صاحب کو میں زیادہ تر ڈیوڑھی کے اندر بیٹھے دیکھتا تھا جہاں ان کا ناک نقشہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھے گھر سے باہر نکلتے یا باہر سے گھر میں داخل ہوتے بھی نظر آئے۔ ان کے ہاتھ میں کٹاؤ کے کام کی سیاہ چھڑی ہوتی تھی اور وہ شہر کے معزز بزرگوں والا مشرقی لباس پہنتے تھے لیکن ان کے سر پر شکاریوں والا انگریزی ہیٹ ضرور ہوتا تھا۔ وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے بہت دھیرے دھیرے چلتے تھے، لیکن ان موقعوں پر بھی میں نے انھیں دور ہی سے دیکھا۔ کئی بار وہ مجھے بازار میں

Scanned with CamScanner

بھی دور پر نظر آئے اور میں نے فقط چہرے کی اور ہیئت کی وجہ سے اُن کو پہچانا۔

بائی کو میں نے اُتنا بھی نہیں دیکھا جتنا صاحب کو دیکھ لیتا تھا۔ میرے سامنے سے دکھائی دینے والے ان کے دونوں کمروں میں سے ایک کا دروازہ مستقل بند نظر آتا تھا۔ دوسرا دروازہ زیادہ تر صرف اُس وقت کھلتا تھا جب خانم گملوں میں پانی ڈالتی تھی، البتہ کبھی کبھی وہ اُس وقت بھی کھول دیا جاتا تھا جب فضا میں اُمس کی کیفیت ہوتی یا اچھی ٹھنڈی ہوا چلنے لگتی۔ ان موقعوں پر بائی مجھے کمرے کے اندر مسہری پر بیٹھی دکھائی دیتی تھیں۔ کئی مرتبہ میں نے دیکھا کہ خانم اُن کے بالوں میں کنگھی کر رہی ہے۔ ایک مرتبہ خود وہ خانم کے کنگھی کرتی نظر آئیں۔ اتنی دور سے ان کا ناک نقشہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا، بس یہ اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ بھاری بدن کی سن رسیدہ عورت ہیں۔

پہلے میرا خیال تھا کہ صاحب مستقل نیچے ہی رہتے ہیں لیکن ایک دن جب اس کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ مسہری پر بائی کے سامنے بیٹھے ہیں اور کچھ کچھ دیر بعد آگے کو جھک جاتے ہیں، اور خانم بار بار ان دونوں کے پاس آتی ہے، واپس جاتی ہے، پھر آتی ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں کھانا کھا رہے ہیں۔ یہ منظر میں نے کئی مرتبہ دیکھا۔ ایک بار یہ بھی دیکھا کہ صاحب زبردستی کوئی چیز بائی کو کھلانا چاہ رہے ہیں اور بائی ادھر اُدھر منھ پھیر پھیر کر انکار کر رہی ہیں اور خوب ہنس رہی ہیں۔ اُسی وقت خانم پانی لے کر آ پہنچی۔ بائی نے اس کی کمر پر ایک ہاتھ مارا اور وہ کندھے اچکا اچکا کر ہنستی ہوئی واپس چلی گئی۔

***

میرے گھر والوں کو شاید ٹھیک ٹھیک پتا ہو، لیکن میں اندازے سے بھی نہیں کہہ سکتا کہ صاحب اور بائی کو پیچھے والے مکان میں رہتے کتنا عرصہ گذرا تھا، اس لیے کہ ان دونوں میں مجھے دلچسپی پیدا نہیں ہو سکی تھی۔ میرے آس پاس کے منظروں میں یہ میاں بیوی بھی شامل تھے جنھیں دیکھنا نہ دیکھنا میرے لیے یکساں تھا۔ شاید اسی لیے مجھ کو اس کا کوئی خاص احساس نہیں ہوتا کہ کسی دن سے اس مکان کے اوپری کمرے کا دروازہ نہیں کھلا ہے اور نیچے ڈیوڑھی کا دروازہ بھی اندر سے بند رہتا ہے۔ جب ایک دن خانم ہمارے یہاں گرم پانی سے سکائی کرنے والی ربڑ کی تھیلی مانگنے آئی تو پتا چلا کہ بائی کی طبیعت کچھ دن سے بہت خراب ہے اور صاحب شہر کے باہر کہیں گئے ہوئے ہیں۔ تیمارداری کے متعلق اس نے بتایا کہ بائی نے صاحب کے رشتہ داروں کے یہاں سے دو عورتوں کو بلوا لیا ہے اور وہ آج ہی پہنچی ہیں۔

اسی دن شام کو میں نے دیکھا کہ بائی کے دونوں کمروں کے دروازے پورے کھلے ہوئے ہیں اور کمروں میں دو نئی عورتیں چل پھر رہی ہیں۔ دوسرے دن صبح دو کی جگہ چار پانچ عورتیں نظر

آئیں۔ تیسرے دن سہ پہر تک ان کی تعداد اور بڑھ گئی۔ چوتھے دن سورج نکلنے کے کچھ دیر بعد اس مکان سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں کچھ دیر تک اُدھر دیکھتا رہا، پھر گھر والوں کو خبر دینے کے لیے نیچے اُترا تو دیکھا قاسم صحن میں بیٹھی رو رہی ہے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ بائی کچھ دیر پہلے ختم ہوئی ہیں، تیمارداروں نے اُن کے سرہانے سلگانے کے لیے لوبان منگایا ہے اور دکانیں ابھی کھلی نہیں ہیں۔ میری والدہ دالان کی ایک الماری کے سامان میں لوبان کی پڑیا بھی ڈھونڈھ رہی تھیں اور قاسم سے بائی کی بیماری وغیرہ کی تفصیل بھی پوچھتی جا رہی تھیں۔ اس نے سب کچھ بہت قاعدے سے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ صاحب ابھی واپس نہیں لوٹے ہیں، اور یہ بھی کہ ان کی روانگی کے وقت بائی بالکل ٹھیک تھیں، او یہ بھی کہ وہ صرف بائی کو بتاتے تھے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔

میں اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔ بائی کے یہاں رونے کی آوازیں کم ہو گئی تھیں۔ دن چڑھتے چڑھتے آوازیں قریب قریب ختم ہو گئیں۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ڈیوڑھی پر زنانی سواریاں اتر رہی تھیں۔ اُن کے ساتھ کے مرد جو ہمارے محلے کے نہیں تھے، ڈیوڑھی میں کھڑے رہتے اور اوپر رونے کی آوازیں بلند ہو کر پھر ختم ہو جاتیں۔ لیکن ایک بار میں نے محسوس کیا کہ آوازیں تیز ہو کر کم ہونے کے بجائے بڑھ رہی ہیں بلکہ اب ایک بے ہنگم شور میں بدل گئی ہیں۔ میں چھجے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ بائی کے کمرے میں عجب غدر سا مچا ہوا تھا۔ کوئی رو نہیں رہا تھا، سب چیخ رہے تھے، اور سب کی آوازوں پر قاسم کی جھنجھلائی ہوئی آواز بالا تھی۔ ہر عورت ہر عورت کی طرف لپک لپک کر کچھ کہہ رہی تھی۔ کسی کو ایک جگہ پر قرار نہ تھا، اور قاسم تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ روشنی میں آئی ہوئی کوئی چمگادڑ ہے جو کمرے بھر میں منڈلاتی اور ایک ایک سے ٹکراتی پھر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد سڑک پر مردانی آوازیں بلند ہوئیں اور میں نے چھجے کے نیچے دیکھا۔ عورتوں کے ساتھ آنے والے آدمی ڈیوڑھی کے آگے آپس میں جھگڑ رہے تھے اور محلے کے دو تین لوگ انھیں سمجھا بجھا رہے تھے۔ دیر تک اوپر اور نیچے کا ہنگامہ دیکھنے کے بعد آخر میں نے دیکھا کہ عورتیں ڈیوڑھی سے نکل نکل کر مردوں کے ساتھ واپس جا رہی ہیں۔ وہ زور زور سے بول رہی تھیں اور ان کے مرد انھیں چپ کرا رہے تھے مگر خود زور زور سے بول رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سب کیا کہہ رہے ہیں۔ میں نے پھر چھجے کی طرف دیکھا۔ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔ خاموشی ایسی تھی گویا وہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو، البتہ ہوا کے ساتھ مجھے اُدھر سے لوبان کی خوشبو آتی محسوس ہو رہی تھی۔

میں گھر والوں کو اس ہنگامے کی اطلاع دینے کے لیے نیچے اترا۔ قاسم پھر موجود تھی اور پورا قصہ سنا چکی تھی۔ وہ سب میرے گھر کی عورتیں وہی قصہ دہرا رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

خانم نے بتایا تھا کہ بائی کئی دن سے غفلت میں پڑی رہتی تھیں۔ کچھ کچھ دیر بعد چونک کر صاحب کو پوچھتیں اور پھر غافل ہو جاتی تھیں۔ ایک دن پہلے انھیں پوری طرح ہوش آ گیا اور وہ ٹھیک ٹھاک معلوم ہونے لگیں۔ انھوں نے کچھ کھانے کو مانگا، پھر خانم سے اپنے زیوروں کے صندوقچے نکلوائے اور سر سے پیر تک سارے زیور پہن لیے۔ انھوں نے تاکید کر دی تھی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ صاحب کے لیے کھلا رکھا جائے۔ رات بھر وہ مسہری پر بیٹھی جاگتی رہیں۔ صبح انھوں نے پھر صاحب کو پوچھا، خانم سے کنگھی کرائی اور کاجل کی ڈبیا مانگی۔ خانم ڈبیا لے کر آ رہی تھی کہ ان کا دم نکل گیا۔ صاحب کی بہت سی رشتہ دار عورتیں آ گئی تھیں۔ رونا پیٹنا ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد ماتم داروں نے بائی کے ہاتھ پاؤں اور چہرے پر منھ رکھ رکھ کے رونا اور بین کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ایک نے روتے روتے بائی کے چہرے پر سے منھ ہٹایا تو دوسری نے دیکھا کہ بائی کے کان کا بُندہ غائب ہے۔ اس نے پوچھا بُندہ کہاں گیا۔ عورت بولی جہاں انگوٹھی گئی، اور ایک تیسری عورت کی طرف اشارہ کرنے لگی۔ بائی کی انگلی سے انگوٹھی بھی غائب تھی۔ یہ ہنگامے کی ابتدا تھی۔ دیکھتے دیکھتے سب نے ایک دوسرے کو چوری لگایا اور بائی کے ساتھ اپنا قریبی رشتہ بتا بتا کر ان کے زیوروں پر اپنا اپنا حق جتانا شروع کیا۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھی کہ لڑنے والیاں بائی پر لپک پڑیں اور ذرا دیر میں ان کا مردہ بدن زیوروں سے خالی — عورتوں کی اصطلاح میں ننگا — ہو گیا۔

مجھ کو خانم کے بیان میں مبالغہ معلوم ہوا۔ میں نے کہا میں خود دیکھ رہا تھا۔ وہاں ایسی لوٹ تو نہیں مچی تھی۔ پھر میں نے جو تھوڑا بہت دیکھا تھا وہ بیان کر دیا۔ خانم نے میرے بیان کو بے اعتنائی، قدرے تحقیر، کے ساتھ سنا اور جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ تو خود وہاں موجود تھی۔ پھر اس نے بتایا کہ ساری رشتہ دار عورتیں ناراض ہو کر چلی گئی ہیں اور وہ بائی کے پاس محلّے کی عورتوں کو بٹھا کر ہمارے یہاں صرف اس لیے آئی ہے کہ ہم لوگ جس طرح بھی بنے صاحب کا پتا لگوا کر انھیں اطلاع کرا دیں۔ میرے والد صاحب کو اندر بلوایا گیا۔ انھیں بالکل اندازہ نہیں تھا کہ صاحب کہاں ہوں گے، لیکن انھوں نے شہر کے دو تین پرانے لوگوں کو، جو ان کے خیال میں صاحب کے واقف کار ہو سکتے تھے، پرچے لکھ کر ایک نوکر کے ہاتھ بھجوا دیے۔ اب جا کر سب نے دیکھا کہ خانم کی ناک اور کانوں سے کچھ کچھ خون رس رہا ہے، اور یہ بھی دیکھا کہ چاندی کے موٹے موٹے زیور، جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی اب نہ اس کے ہاتھ پیروں میں ہیں نہ چہرے پر۔ میری والدہ چیخ اٹھیں:

"ری، کیا تجھے بھی کھسوٹ لیا گیا؟"

"نہیں،" خانم نے بتایا، "وہ بائی کے زیور برآمد کرنے کے لیے ایک ایک عورت کو پکڑ کر اس

Scanned with CamScanner

کی جامہ تلاشی لے رہی تھی مگر عورتیں اسے اُچھال اُچھال دیتی تھیں۔ آخر اس نے اپنے زیور بھی اتار اتار کر عورتوں پر کھینچ مارے کہ لو یہ بھی لے جاؤ۔

"وہ بھی تو ہماری بائی کا گہنا تھا،" آخر میں اس نے کہا اور بین کر کر کے رونے لگی۔

اُسے مشکل سے اور دیر میں چپ کرایا جا سکا۔ خون روکنے کی دوا اس نے خاموشی کے ساتھ لگوائی اور وہیں بیٹھ کر نوکر کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ اسے کچھ کھانے کو دیا گیا جو اس نے بلاعذر سر جھکا کر کھا لیا۔

نوکر پرچیوں کے جواب لے کر آ گیا۔ کوئی نہیں بتا سکا کہ صاحب کہاں گئے ہوں گے، بلکہ ان لوگوں کو یہی پتا نہیں تھا کہ وہ واپس آ کر اسی شہر میں رہنے لگے ہیں۔

خانم ٹھہر کر چلنے کو ہوئی تھی کہ باہر والے نوکر نئی خبریں لائے۔ کسی نے تھانے پر اطلاع پہنچائی تھی کہ بائی کو دن دہاڑے قتل کر کے ان کے زیور لوٹ لیے گئے ہیں۔ ابھی ابھی پولیس والوں نے آ کر لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور بیان لینے کے لیے خانم کی تلاش ہو رہی تھی۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ خانم پولیس سے کتنا ڈرتی ہے۔ زیوروں کے بغیر یوں بھی اس کا چہرہ اجاڑ ہو رہا تھا، اب اس پر اور بھی مُردنی چھا گئی۔ میرے گھر والے ان حالات پر ردوکد کر رہے تھے اور وہ پھٹی پھٹی بے نور آنکھوں سے ایک ایک کا منھ تک رہی تھی۔ اوپر سے میرے ایک ماموں جو مقدمہ بازی میں ماہر تھے اور کسی مقدمے ہی کے سلسلے میں کان پور سے آئے ہوئے تھے، انھوں نے یہ کہہ کر اس کو اور بھی ڈرا دیا کہ یہ معاملہ بہت طول کھینچے گا اور اس کو بار بار گواہی میں پولیس اور وکیلوں کی جرح کا جواب دینا ہوگا۔ اب جو اس سے بیان دینے کے لیے جانے کو کہا گیا تو وہ زمین پر پچھاڑیں کھانے لگی۔ وہ کسی کی کوئی بات سننے پر تیار نہیں تھی اور بھاگ بھاگ کر ہمارے گھر کی کوٹھریوں میں گھسی جا رہی تھی۔ آخر اس کو زبردستی باہر نوکروں کے حوالے کر کے انھیں بتا دیا گیا کہ اس وقت اُس کا ہمارے یہاں چھپ رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔

جس وقت چھوٹی چھوٹی ٹانگیں چلاتی اور چیختی چلاتی خانم کو قریب قریب گود میں اٹھا کر باہر پہنچایا جا رہا تھا، میں نے اپنے ماموں کو دیکھا کہ میرے والد اور والدہ کو ایک طرف لے جا کر ان سے چپکے چپکے کچھ کہہ رہے ہیں۔ پھر انھوں نے اشارے سے مجھ کو قریب بلا کر بتایا کہ وہ مجھے اسی وقت اپنے ساتھ کان پور لیے جا رہے ہیں۔

"اور یہاں یا وہاں،" انھوں نے زور دے کر کہا، "کسی کو مت بتانا کہ تم نے کچھ دیکھا ہے، نہیں تو گواہی میں کھنچے کھنچے پھرو گے۔"

والدہ نے دیکھتے دیکھتے سفر کا سامان درست کر دیا۔ ہم مکان کے عقبی دروازے سے ہو کر پچھواڑے والی گلی میں آئے، گلی سے دوسری سڑک پر نکلے اور ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو

Scanned with CamScanner

گئے۔

***

چار پانچ دن بعد مجھے کان پور سے واپس بلا لیا گیا۔ گھر پہنچ کر مجھ کو صرف تین باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ خانم ہمارے نوکروں میں سے کسی کے رشتہ داروں کے یہاں روپوش ہو گئی تھی، لیکن دوسرے دن وہاں سے بھی غائب ہو گئی۔ دوسری یہ کہ بانی کو میرے والد صاحب کی اجازت سے، بلکہ انھیں کی تجویز پر، ہمارے خاندانی قبرستان میں دفن کیا گیا ہے، اور تیسری یہ کہ صاحب کا اب تک پتا نہیں۔

میں نے اوپر جا کر اس مکان کو دیکھا۔ چھجے پر رکھے ہوئے گملوں کے زیادہ تر پودے مرجھا گئے تھے، اور نیچے اوپر کے سب دروازے بند تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں برسوں سے کھولا نہیں گیا ہے۔

۳

صاحب چوتھے دن سہ پہر کو ہمارے یہاں آئے، اسی طرح چھڑی ٹیکتے اور شکاری ہیٹ لگائے ہوئے۔ میں اس وقت مکان کے سامنے والے باغ میں ایک کیاری بنا رہا تھا اور والد صاحب قریب کھڑے مجھے ہدایتیں دے رہے تھے۔ صاحب بھی وہیں آ گئے۔ والد صاحب نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ پھر تعزیت کی اور صاحب نے والد کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے بانی کو اپنے قبرستان میں جگہ دے دی۔ وہ فوراً ہی واپس ہو رہے تھے لیکن والد نے ان کو روک لیا۔ شہتوت کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ کر دونوں باتیں کرنے لگے اور میں کیاری بناتا رہا۔ صاحب توقع سے زیادہ دیر تک بیٹھے رہے۔ وہ دھیمی آواز میں بولتے تھے جس کی وجہ سے ان کی باتیں مجھے صاف سنائی نہیں دے رہی تھیں، لیکن یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بانی کی خوبیاں بیان کر رہے ہیں، جس طرح مرنے والوں کی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، اور مثال کے طور پر کچھ واقعات بھی سناتے جا رہے تھے۔

آخر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ والد نے مجھے اشارہ کیا کہ ان کو سڑک والے پھاٹک تک پہنچا آؤں۔ وہ خود بھی باغ سے نکلے ہوئے چبوترے تک صاحب کے ساتھ آئے۔ چبوترے کی بیرونی سیڑھیوں کے پاس آ کر صاحب نے ان سے مصافحہ کیا، سیڑھیاں اتر کر دو قدم آگے بڑھے، پھر رکے اور چھڑی پر اپنے پورے بدن کا زور ڈال کر گھوم پڑے۔

"آپ مجھے خط لکھتے رہیے،" انھوں نے بلند آواز میں کہا، لیکن کچھ پوچھنے سے پہلے ہی چپ ہو گئے۔

والد سے کچھ تسلی دینے والی باتیں کہیں اور صاحب مڑ کر چھڑی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پھاٹک پر پہنچ کر انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا:

بس بیٹے، جیتے رہیے۔ اور پھاٹک سے سڑک پر نکل گئے۔

***

اسی ہفتے ایک دن میں نے اپنے کمرے کا سڑک کے رخ والا دروازہ کھولا تو دیکھا صاحب کی ڈیوڑھی کے سامنے گھریلو اسباب سے لدے ہوئے دو تانگے کھڑے ہیں اور ان کے پاس محلے کے کچھ لوگ آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ چھجے پر سے گملوں کی قطار غائب ہے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد صاحب ڈیوڑھی سے نکلے۔ انھوں نے دروازہ باہر سے بند کیا، کنڈی میں پیتل کا بڑا سا قفل لگایا اور کنجی محلے کے ایک بزرگ کے ہاتھ میں دے دی۔ پھر وہ باری باری سب سے گلے ملے۔ اس میں بار بار ان کا ہیٹ بے جگہ ہو جاتا تھا جسے وہ پھر سے سر پر جما کر دوسرے آدمی سے گلے ملتے۔ آگے والا تانگا چل دیا۔ صاحب پیچھے والے تانگے کی اگلی نشست پر کوچوان کے برابر بیٹھے۔ تانگا ذرا سا آگے بڑھا، پھر رک گیا۔ صاحب نے نیچے اتر کر کوچوان سے کچھ کہا۔ کوچوان دوسری طرف سے اتر کر آیا۔ اس نے پیچھے رکھا ہوا ایک صندوق اور لکڑی کے اسٹینڈ میں لگی ہوئی پانی کی صراحی اتار کر دونوں چیزیں آگے رکھیں۔ صاحب پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ انھوں نے سامنے کھڑے ہوئے محلے والوں کو دیکھا اور سلام کے لیے ہاتھ اٹھا دیا۔ گھوڑے کی لگام سے ہلکا سا جھٹکا کھایا اور تانگا اگلے تانگے کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گیا۔ سڑک کے سرے پر پہنچ کر دونوں تانگے ریلوے اسٹیشن کی سمت مڑ گئے۔

**

حسن منظر

بوڑھا مگرمچھ*

آدم عیسیٰ قاضی بھی خوب آدمی تھا۔ خدا اس کے گناہ معاف کرے کیوں کہ وہ جیسا تھا ویسا کا ویسا، بلکہ جس حال میں تھا اسی حال میں، پچھلے دنوں خدا کے گھر پہنچ گیا۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ اس نے بیوی سے پانی مانگا، پیا، ٹائی کی ناٹ کھولتے کھولتے دو ایک ہچکیوں کی قسم کی آوازیں نکالیں، صوفے پر پیچھے ہو کر، اور ختم ہو گیا۔ مرنے کے بعد بھی اس کے منہ سے وسکی کی بو آ رہی تھی جو پہلے اس کی بیوی، پھر صوفے نے سونگھی اور دونوں، ناک پکڑتی ہوئی جسم سے پرے ہو گئیں۔

فون کرنے پر تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا، اوپی جی کمپنی کا، حسین نامی۔ اس نے بے دھیانی سے دو ایک سوال کیے: کہاں گیا ہوا تھا؟ کب سے؟ کب لوٹ کے گھر آیا؟ پھر کیا ہوا؟ ڈری ہوئی مسز آدم عیسیٰ قاضی کے بتانے پر کہ صبح گیارہ بجے کا نکلا نکلا بس تین بجے گھر لوٹا تھا، اس نے صوفے پر گرے ہوئے ڈھیر کی طرح پڑے ہوئے آدم کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا جہاں خون ٹھہرے تھے اور نبض غائب۔ پھر وہ بند آنکھوں کو کھول کر ان میں جھانکنے کے لیے آدم کے چہرے پر جھکا اور جھٹک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

ایک لمحے بعد اس نے خود سے کہا: ایک دن میرے کو اس کی امید تھی۔ I expected it one day! پھر کچھ دیر لاش کے پاس خاموش کھڑا رہ کر وہ آہستہ آہستہ دروازے کی طرف

*The Old Croc

Scanned with CamScanner

بڑھنے لگا۔

گھر میں تیسرا فرد نہیں تھا، یعنی اگر اس جسم کو گنتی میں نہ لیا جاتا۔

حسین نانجی نے کھلے دروازے کو باہر سے بند کرنے سے پہلے کہا: "میں آسود اسمعیل، خدیجہ بی بی، موسیٰ پٹیل اور قاسم گورا کے گھروں کو فون کرتا ہوں۔ آپ لوگ فکر مت کرو۔ ان لوگ سے دوسروں کو پتا چل جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

پھر وہ دو قدم سیڑھیوں کی طرف چلا، وہاں ٹھہرا، اور واپس دروازے پر آ کر اندر جھانک کر بولا: "دفن کا تو ابھی طے نہیں کیا ہوگا؟"

مسز آدم نے "نہ" میں سر ہلایا۔

"میرا خیال ہے کل رکھنا ہوگا؟"

مسز آدم نے سر کی جنبش سے ہاں کی۔ ایک لمحہ خاموش رہ کر نانجی بولا: "یوسف کو تو فون کر دی آپ کو، بھی کرنا پڑے گا، نہیں تو وہ جنازے کے لیے کیسے پہنچے گا"

اب مسز آدم نے روتی ہوئی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ ان سے حقیقت میں آنسوؤں کی جگہ بے چارگی بہہ رہی تھی۔

ڈاکٹر نے کچھ سوچ کر کہا: "خیر یہ کام میں ابھی کیے ڈالتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ دفن سے پہلے پہنچ جائے گا۔ رہتا تو وہ ابھی اُدھر ہی ہے نا جدھر پہلے تھا؟"

مسز آدم نے "ہاں" میں سر ہلایا۔ ڈاکٹر سے اس سے زیادہ تسلی کی امید نہ سارہ کو تھی۔ اس کی ساس عائشہ کو۔ غالباً وہ مرنے والے کی طرح روتی ہوئی عورتوں کو سینے سے لگا کر دلاسہ دینے کا فن نہیں جانتا تھا۔

"ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا پر اس طرح نہیں،" کرسی پر بیٹھی ہوئی مسز آدم سر جھکا کر روتے میں کہہ رہی تھی۔ "نہلانے والے آئیں گے تو کیا ہوئیں گے۔ اس طرح نہیں ہونا تھا یا میرے اللہ! اس طرح نہیں ہونا تھا۔"

دوسرے کمرے سے بہو کی آواز آئی: "ممی، آپ چپ کرو۔ ان اللہ مع الصابرین۔"

تھوڑی دیر بعد جب اس نے سر اٹھایا تو دیکھا بہو آدم کے جسم پر جھکی ایک پیالی میں اپنی شہادت کی انگلی ڈبو ڈبو کر اپنے سسر کے ہونٹوں اور اندر چھپے مسوڑھوں پر پھیر رہی ہے

"کیا ہے؟ زم زم؟" مسز آدم نے پوچھا۔

بہو بات کو اَن سنا کر کے لاش کے ساتھ مصروف رہی، جیسے سو میاں رہی ہو۔ پھر اس نے مُردے کی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر اُسے زور سے نیچے کو دبایا اور پیالی میں بچا ہوا پانی، یا جو کچھ بھی وہ تھا، لاش کے منہ میں انڈیل دیا۔ پھر منہ سے بہہ نکلنے والے پانی کو اپنے دوپٹے سے پونچھتے ہوئے اس

Scanned with CamScanner

نے ساس کی بات کا جواب دیا: سنئے مس۔ (دلچسپی۔)

دونوں عورتوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں اعتماد کے ساتھ دیکھا۔ اب لاش کے منہ سے شراب کی بو آنے کا اندیشہ مٹ گیا تھا اور یہ گر انھوں نے آدم عیسیٰ قاضی ہی سے سیکھا تھا۔ گو وہ پیتے ہوئے ہو اور کوئی بزرگ ملنے کو آ جائے تو وہ منہ کی کلیاں کرتا تھا۔ سارہ کا کہنا تھا ایک زمانے میں جب اس کے پاس پیسے ہوتے تھے وہ شراب کی بو مارنے کی شیشی بھی جیب میں رکھا کرتا تھا کہ پتا نہیں کہاں اس کی ضرورت پڑ جائے۔

اس کے بعد بہو چاروں طرف فون کرنے لگی۔ رشتے دار کچھ یہیں جوہانس برگ میں تھے، کچھ آس پاس کے شہروں میں: مرنے والے کی بڑی بیٹی پیٹرمیری لس برگ میں تھی۔ بیٹی اور داماد سانتیاگو، چلی (Chile) میں تھے لیکن ان کا فون نمبر کسی کو معلوم نہیں تھا اور نہ پتا۔ اس کے شوہر کو فون کرنے کا پتا ڈاکٹر حسین ابھی بول کر گیا تھا، پھر بھی اس کے من میں کھٹکا تھا کہ یوسف اپنے پپا کی شکل دیکھنے کو آئے گا یا نہیں۔ اور آنا چاہے بھی تو ایر ٹریول کے لیے اس کے پاس ایک دم اتنے پیسے کہاں سے آ جائیں گے۔ (اس رونی صورت حال میں بھی اُس کے من میں شوہر کے لیے وہی وچار آئے جو وہ لیٹے میں اُس سے ہنسی میں کہہ بیٹھتی تھی: سالا بالکل کڑکا رہتا ہے، ایک دم بروک!")

لیکن وہ اپنے کام میں لگی رہی۔ فون کرنے کے بعد وہ بالکل پروفیشنل انداز سے اپنے سسر کی لاش کے پاس آئی۔ فیتے کھول کر جوتے اتارے جو مرنے والے نے عادت کے مطابق بغیر جرابوں کے پہن رکھے تھے۔ آہستہ سے اس کا سر اٹھا کر اور گردن کے پیچھے ہاتھ ڈال کر ٹائی کو کالر سے رہا کیا۔

مسز آدم نے لاش سے ہمدردی کے سے لہجے میں کہا: "نرمی سے عائشہ! پپا کو تکلیف نہ ہووے۔" لیکن اس وقت تک گھسا دیے بغیر وہ گردن کو ٹائی سے آزاد کر چکی تھی۔ پھر اس نے ٹانگیں صوفے کے اوپر کر دیں اور کھینچ کھانچ کر لاش کو اس طرح کر دیا جیسے آدم صوفی تھک کر باہر سے آیا ہو اور کپڑے بدلے بغیر وہیں کوٹ پہنے پہنے سو گیا ہو۔ ایک بار پھر اس نے جھک کر اپنے سسر کے منہ کو سونگھا اور پانی گرم کرنے کے لیے کچن میں چلی گئی۔

***

سو آدم عیسیٰ قاضی کو دفن کیا جا چکا ہے۔ رواج کے مطابق لوگ دعائیں پڑھتے ہوئے اُسے قبرستان چھوڑ گئے تھے۔ قبر کے اندر زم زم عرب سے لائی ہوئی بوتلوں سے چھڑکا گیا اور باہر مٹی پر بھی۔ لیکن خود آدم عیسیٰ قاضی کبھی حج پڑھنے نہیں گیا تھا جو اس نے زم زم کے کنویں کی زیارت کی ہوتی۔ وہ کبھی ملک سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ وہ ساؤتھ میں پیدا ہوا اور ساؤتھ ہی میں

خانے تک رہا۔ یہ بات بڑی عجیب ہے کیوں کہ یہاں لے ہوئے لوگ تقریباً سب کے سب بچپن اور نوجوانی ہی میں پہلا ج پڑھ آتے ہیں اور کثر نے دو ور کچھ نے تین بلکہ چار ج بھی پڑھ رکھے ہیں۔ لیکن آدم کی ہتھیلیوں میں کہا جاتا ہے کہ چھید تھے؛ ہمہ (rand) ن میں آتا تو لیکن جیب تک پہنچنے سے پہلے ہی غائب ہو جاتا تھا۔ اس کے بیٹے کو رشتے داروں نے چندہ کر کے علی گڑھ، انڈیا میں دو سال پڑھایا تھا اور تعلیم کے نامکمل رہ جانے پر پانچ چھ سال یہاں جھک مار کر اب وہ کراچی میں وہاں کے رشتے داروں کی مدد سے پیر ٹکانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یک دن امید تھی وہ اپنے ماں باپ اور بیوی کو وہاں لے جائے گا کیوں کہ اس سونے کے شہر جوہانسبرگ میں آدم کی ساکھ بالکل نہیں تھی۔ لوگ اُسے پنے اسٹورز میں نوکری دیتے ہوئے گھبراتے تھے۔ کون ہے آدمی پر اسٹور چھوڑ کر کہیں جائے گا جو ایک کمبل یا ہیر ڈرائیر لے کر پلک جھپکتے ہی غائب ہو جانے ور بعد میں پتا چلے وہ کمبل کسی عورت کو ملا ہے جو کسی زمانے میں، جب اُس کا پنا اسٹور تھا، اس کی سیلز گرل تھی۔ نوجوان پود اُسے "اولڈ رومیو" کہتی تھی ور لڑکیاں جن پر اُس کی نظریں رہتی تھیں اور جن سے وہ بزرگوں والا برتاؤ کرتا تھا۔۔ یعنی بات کرنے میں کندھے پر ہاتھ رکھ دینا، سینے سے لگانے کی کوشش کرنا۔۔ اُسے "اولڈ کروک" (Old Croc) کہتی تھیں۔ اور حقیقت میں اپنے شراب سے سُکھائے ہوئے جسم سے لگتا بھی وہ یسا بوڑھا مگرمچھ تھا جو بظاہر آنکھیں میچے دریا کی ریت پر سو رہا ہو لیکن بے خبری میں نزدیک آ جانے والے کو اپنی دُم کے ایک ہی جھٹکے سے زمین پر گرا لے۔ زیادہ منہ پھٹ لڑکیاں اُسے 'اولڈ کروک' کہنے کے بعد کہتیں: 'بوڑھی تو ہے لیکن مرنے جیسا نہیں ہے'، ور دوسری لڑکی کہتی: 'او نو! ہرگز نہیں! ذرا س کے پاس جا کر دیکھو۔' س طرح دیکھا جائے تو وہ نوجوانوں کے حلقے میں خاصا مقبول تھا، جیسے اس کے اپنی عمر والوں کا گروپ چھوڑ کر ان میں آ بیٹھنے سے اُن کے ہاتھ ایک کھلونا آ جاتا ہو۔

پنی جوانی میں اسٹور آدم عیسیٰ قاضی نے شہر کے مختلف علاقوں میں کئی بار کھولے تھے۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اس کے پاس باپ کی چھوڑی ہوئی تھوڑی بہت پونجی تھی اور کٹب والے بھی اُسے مال کریڈٹ پر دیتے ہوئے نہیں گھبراتے تھے۔

پہلی بار۔۔ تیئس چوبیس سال پہلے۔۔ لوگ خوش تھے کہ حاجی ایسپ بھائی مرحوم کا بیٹا جو وہ جانتے تھے تھوڑا رنگیلا ہے، اب پنے پیروں پر کھڑا ہونے جا رہا ہے۔ اس لیے ایک تیسرے پہر جب اسٹور کو کھلنا تھا، عورتیں اور مرد جن میں زیادہ تر اس کے ماں باپ کی عمر کے تھے، وہاں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ ان کے ساتھ بچے بھی تھے جو غالباً ان کے پوتا پوتی یا نواسا نواسی ہوں گے۔ یہ لوگ برکت کے لیے اس سے کچھ خریدنے آئے تھے اور کچھ اور نہیں تو ان بچوں کو کینڈیز اور ٹوفیاں ہی لے کر دے رہے تھے۔ آدم عیسیٰ قاضی خوش تھا، بہت خوش۔ اس کے پہلو میں کھڑی

Scanned with CamScanner

اُس کی نوجوان بیوی سارہ بھی خوش ہو ہو کر بچوں کو کینڈیز وغیرہ دے رہی تھی اور رقم کو تھینک یو کر کے لیتی جا رہی تھی، حالاں کہ وہ جانتی تھی پہلی دفعہ اس کے اسٹور سے بچوں کو فری گفٹ ملے۔ پر ایسا کرنا بدشگونی ہوتی۔ ایک آدھ بار اس نے اپنی کسی اچھی واقف عورت سے رقم لیتے ہوئے ہنسی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے خوشی کے لہجے میں کہا:

"You know I cannot say no."

اور خریدار عورت نے اُسی خوشی کے لہجے میں کہا:

"No, you should not, that would be a bad omen."

یہ لوگ کئی دیر وہاں جمے کھڑے رہے کہ راہ گیروں نے بھی اس بھیڑ کو دیکھ کر وہاں رکنا شروع کر دیا۔ جب ان میں دوسری رنگتوں والے بھی نکل آئے تو اُسے گڈلک آدم بھائی کہتے ہوئے یہ لوگ رخصت ہو لیے۔ بعض مذہبوں نے چلتے چلتے کہا: گڈلک، کام کرتا جا بھائی۔ نو ادھر ادھر! اور آدم نے بھی ہنسیں دانت والے لہجے میں سر ہلا کر کہا: نو ادھر ادھر!

اُس دن سارہ رات ہونے تک وہیں لگی رہی۔

اس کے بعد بھی وہ کئی دن تک وقت بے وقت اسٹور پر آتی رہی۔ آکر چیزوں کو ترتیب سے رکھنے لگتی یا ان میں سے جن کے چمکانے کی ضرورت ہوتی ان پر کپڑے کا ہاتھ پھیرنے لگتی تھی۔ لیکن کاروبار میں جب وہ پہلے چند دنوں والی ہما ہمی نہیں رہی تو ایک رات کھانا کھاتے ہوئے آدم نے سارہ سے کہا: میرا خیال ہے ہمیں ایک سیلز گرل کی ضرورت ہے۔

مسز آدم کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ وہ آدم کو شادی سے پہلے سے جانتی تھی اور شادی کے بعد بھی جانتی تھی کہ اس کا دھیان کب کدھر کو ہے۔ وہ اپنے پیا سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ پھر بھی مرنے والے نے اگر ساری زندگی دکھ اٹھایا تھا تو بھی تھوڑا بہت آدم کے لیے چھوڑا تھا کہ وقت آنے پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے۔ آدم نے باپ کی زندگی میں کبھی کام کرنے کی ہی نہیں سوچی تھی۔ اتنے دن بھی اس نے اسٹور کیسے چلایا یہ اس کی بیوی کے لیے تعجب کی بات تھی۔

یہ بات آدم نے جب کہی تھی جب وہ کھانا ختم کر کے اپنے کمرے میں جا چکے تھے اور آدم چوپ کی آخری ہڈی کو پلیٹ میں انگلی سے ہلانے کا کھیل کھیل رہا تھا۔ آدم کو بیوی کے منہ سے کچھ سننے کی توقع نہیں تھی۔ یہ بات اس نے خبر کے طور پر سنائی تھی۔ اور یہی ہوا۔ سارہ بغیر کچھ کہے برتن اٹھانے لگی۔ آدم تھوڑی دیر ریڈیو گرام پر ہندوستانی گانے سنتا رہا۔ اپنے کمرے میں پڑھتے رہے تھے یا نہیں اس میں اُسے دلچسپی نہیں تھی۔ پھر اُس کی آواز باہر کسی سے کچن میں بولنے کی سنائی دی۔ اس کے قہقہوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بہت خوش ہے۔ سیلز گرل کے خیال سے اس کی دوسری کسل مندی یک دم دور کر دی تھی جو پچھلے چند دنوں سے

اس پر طاری تھی۔

گیارہ بجے کے قریب گھر آ کر جب وہ بیوی سے تھوڑا ہٹ کر بستر پر لیٹا تو سارہ نے محسوس کیا وہ خوش ہے، جیسے باپ کی زندگی میں ہوا کرتا تھا۔ اس نے اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور بستر پر چت لیٹا ہلکورے سے لے رہا تھا۔ پھر چھت پر نظر لگائے ہوئے اس نے کہا: "ہمیں سیلز گرلز کی ضرورت ہے ورنہ بزنس نہیں چلے گی۔"

سارہ کا پورا جسم تنا ہوا تھا۔ اس کے منھ سے بے وجہ نکلا: "میں جو ہوں۔"

آدم نے بیوی کی طرف کروٹ لی، رم کی میٹھی بو اس کی سانس میں تھی، اور کہا: "نہیں تم نہیں۔ سب جانتے ہیں یو آر مائی وائف۔"

"پھر؟" سارہ نے اُسی تنے ہوئے منھ کے ساتھ کہا۔

"لوگ فری ہونا چاہتے ہیں۔ سیلز گرل از سیلز گرل۔ وہ تم سے فری نہیں ہو سکتے۔

"Not in my life!

آخری بات اس نے قدرے مردانہ جوش سے کہی تھی۔

"اور آپ چاہتے ہیں جو لڑکی آپ رکھیں وہ اُس سے فری ہوں؟"

"ہاں یار، دیٹ از دی پوائنٹ۔ اس سے سیل بڑھے گی۔"

سارہ خاموش رہی۔ باقی گفتگو میں اس کا شریک ہونا بے سود تھا۔ آدم نے بات جاری رکھی: "جن دکانوں میں سیلز گرلز ہیں اُن میں کھڑے ہونے کی جگہ نہیں۔ اپنے یہاں ایک دم مندا ہو گیا ہے۔" سارہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔ وہ خود کو یہ دھوکا نہیں دینا چاہتی تھی کہ بیوی کو سیلز گرل نہ بنا کر وہ بیوی کا مان رکھ رہا ہے۔

اور جب آدم نے سارہ کے کان پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا: "مرڈوا مُو لِنڈ میرا خیال ہے کام ڈھونڈ رہی ہے"، تو سارہ نے اس کی انگلیوں کو پرے کرتے ہوئے کہا: "گڈ لک۔"

آدم دیر تک ہنستا رہا۔ لیکن لگتا تھا وہ بیوی کی بات پر نہیں ہنس رہا ہے بلکہ ایک بے وجہ کی خوشی کی ہنسی ہنس رہا ہے جو اسے شراب نے ودیعت کی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ خراٹے لینے لگا۔ اور سارہ کے دماغ پر آسنفو لازمانہ سوار ہو گیا۔ اس لڑکی مرڈوا کا ہسبنڈ اسے سوسائٹی کے حوالے کر کے پچھلے تین چار سال سے غائب تھا، اور وہ دونوں ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔ اور اپنے ہسبنڈ کے زمانے میں مرڈوا ایک بار سارہ کے گھر کھانے پر بھی آ چکی تھی۔ اس دن بھی سارہ کو لگا تھا آدم کے دانت مرڈوا پر ہیں۔ لیکن مرڈوا کا سرکل دوسرا تھا اس لیے اتنے دنوں سے اس نے اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا۔ اس کا تو خیال تھا وہ کیپ ٹاؤن چلی گئی ہے، بلکہ کسی نے کہا تھا وہ تو ملک ہی میں نہیں ہے۔ انگلینڈ جا چکی ہے۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ مرڈوا آدم کی پرانی واقفیت ہے اور اس

Scanned with CamScanner

وقت پوری لڑکی تھیں، اکیلی رہ رہی ہے اور بہ آسانی آدم عیسیٰ قاضی کے ہاتھ آ جائے گی۔ اگر وہ واقف نہ بھی ہوتی، سارہ نے کروٹ لیتے ہوئے سوچا، اور ہسبنڈ اور بچے والی، تو بھی اگر آدم کی نظر اُس پر ایک بار پڑ جاتی تو وہ نہ صرف اس کو بلکہ اس کے ہسبنڈ کو بھی یقین دلا دیتا کہ ایسی پرسنیلٹی اور ایسے ٹیلنٹ والی لڑکی کو پبلک ڈیلنگ کے کام پر ہونا چاہیے۔ اس کی زندگی کھانا بنانے کے اسٹوو کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے نہیں بنی تھی۔ She had much more in her اور آدم کی فرشتہ جیسی معصوم صورت اور لمبے بھرے بھرے جسم کو دیکھ کر، اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کا پیشہ کسی اور قسم کی شراب سے کوئی رشتہ ہو سکتا ہے، مرزلا کا ہسبنڈ اس کے الفاظ پر یک دم ایمان لے آتا اور بول اٹھتا: تو آدم جانی، تم والو اس کو کوئی جاب۔ وہ بھی ایک نمبر حرامی تھا اور جانتا تھا اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لیے مرزلا کو آگے رکھتا ہے۔

سارہ نے دوبارہ آدم کی طرف کروٹ لی اور ایک کہنی کو بستر پر ٹیک کر سر کو اپنی ہتھیلی پر رکھ لیا۔ دیر تک وہ اس کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ فکر اُسے چھو تک کر نہیں گئی تھی۔ برابر کے کمرے سے بچوں کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز آئی۔ انھیں خاموش رہنے یا سونے کے لیے کہنا اسے غیر ضروری لگا۔ بلکہ اچھا ہی تھا کہ دونوں سونے سے پہلے ہنس رہے تھے، اور آہستہ آہستہ سو جائیں گے۔ اس نے دونوں کی عمروں کا حساب لگایا۔ یوسف نویں میں لگا تھا، شفعہ اس سے دو سال چھوٹی تھی۔ پھر اُسے اپنا محمد یاد آیا جو بچوں کی آمد کے رک جانے کے سوال پر ہنسنے والیوں سے جواب میں کہا کرتی تھی: آ گئے؟ آگے آ جاتے۔ اس وقت بھی یہ بات سوچ کر اسے ہنسی آ گئی اور اس نے سوچا آیت کا الٹا رہنا چاہیے۔ کیسے معصوم آدم اُسے اور ان بچوں کو اپنی زندگی کی ناؤ میں بٹھا کر کہاں لیے جا رہا ہے۔ کالاہاری ڈیزرٹ جیسی۔ اس نے جھرجھری لی۔ نہ کچھ کھانے کو ہوگا نہ پینے کو، یا کہیں اور۔

ہتھیلی پر سر رکھے رکھے اسے ایک جھپکی آ گئی اور اس نے دیکھا وہ بڑے بڑے جگمگاتے اسٹورز اور اونچی اونچی عمارتوں سے دور والے کسی سیٹلمنٹ کے کسی بازار میں ہے جہاں لوگ بے پروائی سے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں۔ دکانوں کے بیچ کی گلیوں جیسی جگہوں میں کپڑے تھے اور کیبن جیسی دکانیں تھیں جن کے آگے افریقی عورتیں اپنی پیٹھوں پر اپنے بچوں کو کمبلوں میں باندھے چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے میں مصروف تھیں۔ اس بھیڑ میں ہندوستانی بھی تھے لیکن مختلف قسم کے؛ ایسے جنھیں دیکھ کر افریکانیر (سفید) کولی (coolie) کہہ کر پکارتے تھے۔ اور اسی بھیڑ میں اس نے اپنے سسر الیپ قاضی کو دیکھا۔ لوگوں کو ادھر اُدھر ہٹا کر اپنی راہ بناتا ہوا وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اگلے لمحے وہ الیپ کا باپ بن گیا، یعنی آدم کا دادا جسے سارہ نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کے کپڑے الیپ کے کپڑوں سے بھی بدتر تھے۔

جھپکی ٹوٹی تو سارہ کی گردن دُکھ رہی تھی۔ اس نے سر کو تکیے پر رکھ دیا اور آنکھ بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن اس نے محسوس کیا وہ بے وجہ ڈری ہوئی ہے۔ ہُوا ہی کیا تھا؟ یہی نا کہ آدم نے کہا تھا وہ سیلز گرل رکھنے جا رہا ہے۔ اس میں نئی کون سی بات تھی؟ اس کے لیے تو سے تیار رہنا چاہیے تھا۔ اور بھی کتنے جاننے والے تھے جنھوں نے سیکریٹریاں اور سیلز گرلز رکھ رکھی تھیں اور انھیں اپنے گھر کھانے پر بھی بلایا کرتے تھے جیسے اِن کے گھر کی وہ ایک فرد ہوں۔ انڈین لڑکیاں اور عورتیں جن جن جگہوں پر تھیں بڑی اسمارٹ لگتی تھیں۔ ٹیچرز، کلرکنگ اسٹاف اور نرسوں، اور ان لڑکیوں میں کیا فرق تھا؟ یہی نا کہ کچھ اپنے کام کرنے کی جگہیں اور کام بدلتی رہتی تھیں، کچھ اپنی جگہوں اور کاموں پر جمی رہتی تھیں۔ کچھ آزاد تھیں، کچھ اپنے پیشوں سے بندھی ہوئی۔ اور اس کے دماغ نے مردُلا مولچند کو اُس گروپ میں رکھ دیا جو جگہیں بدلتی رہنے والی عورتوں کا تھا؛ جن کے ساتھی بھی بدلتے رہتے تھے اور جو تقریباً سب کی سب ہنستی تھیں۔

ایسُپ قاضی نے اپنے آخری دنوں میں اُس سے کہا تھا: "بچے چھوٹے ہیں، آدم کا چلن جیسا ہے وہ سارہ تجھے پتا ہے۔ بچوں سے زیادہ آدم کو سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اُس کا ساتھ چھوڑا تو دھر اُدھر ہو جائیگا۔ اس پر نظر رکھنا کبھی مت بھولنا۔"

ایسی ہی بات مرنے والے نے اپنے آخری دن کہی تھی: "بچوں پر بھلے نظر نہ رہے، وہ تیرے بچے ہیں اور میں جانتا ہوں تو کیسی ہے، پر آدم پر نظر رکھنی ضروری ہے۔ جتنی جلدی ہو اُسے کام پر لگ جانا چاہیے، نہیں تو جتنا چھوڑ رہا ہوں وہ دن میں اُڑا دے گا۔ میں تو کہہ کہہ کر تھک گیا پر وہ سنتا ہی نہیں۔"

***

لیکن باپ کے مرنے کے بعد بھی سارہ کی بات سننے میں آدم کو پورا ایک سال لگا جب اُس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کرنا شروع کیا کہ گھر کا خرچ تو خیر مشکل سے چل ہی رہا ہے اُس کا شام کا خرچ بھی سے تھوڑا تھوڑا تنگ کرنے لگا ہے۔

کیا ہوگا؟ کیسے ہوگا؟ ان باتوں کی یاد سے گزرتے ہوئے سارہ نے سوچا۔ اگلے ہی لمحے اس کے دماغ میں آیا: جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ نہیں ہوگا تو میں کہیں سیلز گرل لگ جاؤں گی۔ یہاں نہیں کسی اور شہر میں۔ ٹرنسوال نہ سہی نتال یا کیپ پروونس۔ بڑی بہن کے شوہر کا ڈپارٹمنٹ اسٹور تو ہے ہی۔ ضروری بات یہ ہے کہ مجھے خود کو ہر بات کے لیے تیار رکھنا چاہیے، اس نے نیند میں جاتے ہوئے سوچا۔

***

اور ہوا بھی یوں ہی کہ اُس دن سے لے کر جب پہلی بار آدم عیسیٰ قاضی نے ایک سیلز گرل

رکھنے کا ذکر کیا تھا اس دن تک جب جو عائشہ نے دارچینی کے پاؤڈر کو پانی میں گھول کر مرنے والے کے ہونٹوں پر لگایا، سارہ کو خود کو ہر بات کے لیے تیار رکھنا پڑا۔ یہی نہیں، اس کے ساتھ اس کے دونوں بچوں کو بھی ہر بات کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ انھیں اپنے باپ کے لقب یاد تھے۔ کوئی اُسے آدم بھائی کہتا تھا، یعنی جب سارہ یا دونوں بچے یوسف اور حفصہ نزدیک ہوتے تھے، لیکن اکثر جب وہ دور ہوتے تھے اُس کا ذکر اولڈ رومیو یا اولڈ کروک، بُوزر، یا شرابی یا عورتوں کا رسیا کہہ کر کرتے تھے۔ اور یہ بات بچوں میں پھیلتی ہوئی یوسف اور حفصہ کے کانوں تک بھی پہنچتی تھی اور وہ اس بھی ایسے موقعوں پر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھنے سے کتراتے تھے، اور بات سنتے ہوئے ایسے بن جاتے تھے جیسے بات اُن کے باپ کی نہیں ہو رہی ہے کسی اور غیر متعلق شخص کی ہے۔

ایک دن یوسف نے حفصہ کو ڈکشنری میں کوئی لفظ ڈھونڈتے دیکھا۔ اس وقت حفصہ کے پاس نہ کوئی درسی کتاب تھی جس کے کسی لفظ کے معنی وہ دیکھ رہی ہوتی اور نہ ہی وہ اس وقت پڑھائی کی کتابوں کے سامنے بیٹھی تھی۔ ڈکشنری یوسف کی تھی۔ اس نے پوچھا: کوئی بڑا لفظ ہے جو تمھاری ڈکشنری میں نہیں ہے؟

حفصہ نے کہا: ہاں، اور اسی پر رکھے کی انگلی تھوڑی دیر چلانے کے بعد کتاب کو ناامیدی سے بند کر دیا۔

"کیا لفظ ہے؟" یوسف نے پوچھا۔

تھوڑی دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد حفصہ نے کہا: satyriasis یا اس سے ملتا جلتا کوئی لفظ۔

یوسف کے ماتھے پر سوچ کی سلوٹیں پڑ گئیں۔ ایک بار اس نے بھی ڈکشنری سے قسمت آزمائی کی اور پوچھا: کہاں پڑھا تھا؟ مجھے دکھاؤ۔ حفصہ نے کہا، سنا تھا، اور یوسف کے اصرار پر کھول کر بتایا کہ کسی بہت پڑھے لکھے آدمی نے کہا تھا کہ انھیں سیٹرائی ایسس ہے۔ میں سن رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے اُبل پڑے اور یوسف سے لپٹتے ہوئے بولی:

"پاپا ایسے کیوں ہیں؟"

"کیسے؟" یوسف نے پوچھا۔

"جیسے ہیں۔ تمھیں ان کے سارے نام پتا ہیں۔ کوئی مجھے اولڈ کروک کی بیٹی کہتا ہے، کوئی کسی اور... تمھیں نہیں کہتے؟ تمھیں یہ سب کچھ نہیں سننا پڑتا؟"

یوسف عمر میں اس سے صرف دو سال بڑا تھا اور کتنی ہی بار وہ اپنے باپ کو، جب وہ پیے ہوئے ہوتا تھا سنبھالتا ہوا سیڑھیوں پر سے اوپر لے جاتا تھا۔ اس وقت وہ اُن چہروں کی طرف نہیں دیکھتا تھا جو کھڑکیوں اور دروازوں میں سے اُن باپ بیٹے کو دیکھ رہے ہوتے تھے۔ بعض

کے اس سوال پر کہ یہ سب تمہیں نہیں سننا پڑتا، وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا، اور روتے ہوئے اس نے پوچھا: "سنا ہے۔ مگر یہ تو تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے کوئی بیماری ہے جو انہیں ہے۔" لیکن اس کے دماغ میں ساتھ ہی یہ خیال بھی ابھرا: "جو انہیں لگ گئی ہے۔" اپنی سے بڑی عمر کے لڑکوں سے وہ سن چکا تھا دنیا میں ایسی بیماریاں بھی ہیں جو چالو عورتوں سے مردوں کو لگتی ہیں۔ کہیں پپا کو تو ان میں سے کوئی بیماری نہیں لگ گئی ہے؟ ایک دم اسے کراہت سی محسوس ہوئی۔ کسی زمانے میں وہ اکثر اپنے باپ کا چھوڑا ہوا سوفٹ ڈرنک پی لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے ہمت کر کے بہن سے کہا: "ہمیں ان کے جھوٹے گلاس میں پانی نہیں پینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کوئی لگنے والی بیماری ہو۔" اس سے آگے حفصہ کے استفسار پر وہ کچھ نہیں بتا سکا۔ کتنی ہی سیلز گرلز کے نام اس کے دماغ میں آئے؛ مختلف رنگتوں اور مذہبوں والی مختلف عمروں کی لڑکیاں عورتیں جو وہ جانتا تھا سب کی سب چالو مال تھیں جیسا کہ اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ تیرے پپا نے نواں چالو مال اسپورٹ کیا ہے۔ ان سب لڑکوں سے وہ کیسے لڑ سکتا تھا؟ کتنوں کی زبان بند کر سکتا تھا؟ وہ سب اس کے دوست تھے بھی اور نہیں بھی۔ لیکن اندر سے یوسف ان کے اور خود کے بیچ ایک گہری کھاڑی دیکھتا تھا جسے پار کر کے وہ ان کے پاس نہیں پہنچ سکتا تھا۔ کبھی کبھی اپنے کو ان سے کمتر سمجھنے کے تکلیف دہ احساس کو وہ یہ سوچ کر کم کر لیتا تھا کہ فلاں فلاں لڑکا اپنے باپ سے چھپ کر پینے لگا ہے۔ وہ نہیں پیتا تھا۔ سگریٹ اکثر شروع کر چکے تھے جس سے وہ پرے تھا، اور ان میں سے بعض اپنے اسی لائن پر چل پڑنے کے کارنامے کھلم کھلا دوستوں کے حلقے میں سناتے تھے جس پر نہ جانے کب اس کے باپ آدم عیسیٰ قاسمی نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہوگا۔ اس کی زندگی ایسے کارناموں سے انڈیا میں گزارے ہوئے دو سالوں میں بھی خالی رہی تھی جہاں اس پر کوئی نظر رکھنے والا نہیں تھا اور یہاں ساؤتھ میں بھی جہاں ایسی لڑکیوں کی کمی نہیں تھی جیسی --- اور آہستہ سے اس کی سوچ کے پیچھے سے ایک اور سوچ ابھر کر کہتی تھی: "جیسی میرے باپ کے ہتھے چڑھتی رہتی ہیں۔"

پہلے دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے چپٹے روتے رہے پھر بیڈ پر برابر برابر بیٹھ گئے۔ یوسف اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا اور حفصہ نے تکیہ اٹھا کر اپنی رانوں پر رکھ لیا تھا جس میں منہ چھپائے وہ رو رہی تھی۔ پھر باہر سے ممی کی آواز آئی: "ارے یوسف، حفصہ، تم دونوں کتنی دیر سے کمرے میں گھسے ہوئے ہو؟" اور اندر داخل ہو کر وہ ٹھٹک کر رہ گئی۔

"کیا ہوا؟ کیا کوئی بری خبر آئی ہے؟" یہ اور اس طرح کے کتنے ہی سوال اس نے کر ڈالے اور دونوں نفی میں سر ہلاتے رہے۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے سارہ نے کہا: "میں جانتی ہوں، پپا کے بارے میں پھر کسی سے کچھ سنا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے حفصہ کے چہرے کے نیچے سے تکیہ نکال لیا اور اپنے پیٹ میں اس کا سر بھینچتے ہوئے کہا: "مجھے سب معلوم ہے۔ مگر اب تم دونوں

Scanned with CamScanner

بڑے ہو گئے ہو۔ اب تک تو ان باتوں کو سننے کی عادت ہو جانی چاہیے تھی۔ مجھے دیکھو، میں کہیں روتی ہوں؟" اس نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔ پھر ایک ہاتھ سے حفصہ کے سر کو تھامے ہوئے اور دوسرے کی انگلیوں کو یوسف کے بالوں میں کنگھے کی طرح چلاتے ہوئے کہا:

"Your father is not a bad man; beleive me he is good at heart."

دونوں کو ماں کے اس جھوٹ کی بھی عادت تھی۔ وہ شوہر کے دفاع میں یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ پیتا نہیں ہے کیوں کہ جس کام کا نتیجہ اٹھتے بیٹھتے دیکھنے میں آتا ہو اس کی نفی کون کر سکتا ہے، لیکن وہ دوسری بات؟ اس کے نزدیک کس نے کیا دیکھا تھا، یہی نا کہ وہ مشتبہ کردار کی عورتوں اور لڑکیوں کو ان دنوں میں جب اس کا کوئی اسٹور ہوتا تھا سیلز گرل رکھتا تھا اور کبھی کسی ان میں سے کسی کو گھر پہنچانے پر بھی لے آتا تھا۔ محفلوں میں اگر پیے ہوتا تھا تو بغیر اس کی پروا کیے کہ اس کے سننے والوں میں کون ہیں، صرف ہم عمر مرد یا نوجوان لڑکے، لڑکیاں، عورتیں، اور ان کی ٹانگوں کے بیچ میں کھڑے ہوئے چھ چھ سات سات سال کے بچے بھی، وہ جب ایک بار ڈون کی لینا شروع کرتا تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا، اور بچے اس کی باتوں کو کچھ سمجھتے تھے کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے کارناموں کے بیچ بیچ میں وہ عورتوں مردوں کی مستی کے لطیفے بھی سناتا جاتا تھا جو ان لوگوں کے کانوں تک بھی پہنچ رہے ہوتے تھے جو سنجیدہ ہونے کی وجہ سے اس کے حلقے سے دور دور بیٹھے ہوئے تھے۔

ایک بار پھر سارہ بی بی نے اپنے آنسوؤں کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا: "سب جھوٹ ہے۔ I know your Papa، انھیں پی کر ہوش نہیں رہتا ہے کہ کس کے سامنے کیا کہنا چاہیے۔ یہاں کون نہیں پیتا ہے؟ سب پیتے ہیں، پر چھپ کے سوائے ایک دو کے۔ چلو، اٹھو چل کر منھ دھوؤ۔" پھر بیٹی کو خوش کرنے کے لیے اس نے کہا: "آج ہم ماں بیٹی کیک بنائیں گے۔ یوسف کو پسند ہے، ہے نا یوسف؟"

یوسف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا: "کیا لفظ تھا حفصہ؟"

حفصہ نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کاغذ پر وہی لفظ مختلف ہجوں میں لکھا ہوا تھا۔ کاغذ اٹھا کر دروازے کی طرف جاتے ہوئے یوسف نے کہا: "میں اپنے کسی دوست کی بڑی ڈکشنری میں دیکھ کر بتاؤں گا۔"

"کیا؟" سارہ نے تعجب سے پوچھا۔

"وہی جو پاپا کو ہے،" حفصہ نے ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر للکارنے والے لہجے میں کہا۔

"کوئی بیماری؟"

"شاید۔"

"زیادہ پینے سے ڈاکٹر حسین کتنی ہی دفعہ کہہ چکے ہیں جگر خراب ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے پپا کو وہی ہے۔" لیکن اپنی اس توضیح سے وہ خود مطمئن نہیں تھی۔ اس کے دماغ میں بڑے زور سے خطرے کی گھنٹی بجی اور پسینے میں ڈوبتی ہوئی وہ بیٹی کے برابر بیڈ پر ڈھیر ہو گئی۔ تھوڑے توقف سے حفصہ نے ماں کے سر کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ سترہ اٹھارہ سال کی تھی اور ماں میں اور اس میں دوستی کے تعلقات استوار ہو چکے تھے۔

شام کو جب ماں کچن سے کھانا لا کر میز پر رکھ رہی تھی اور حفصہ میز پر پلیٹیں چن رہی تھی اور کھانے کے انتظار میں پہلے سے میز پر بیٹھا ہوا آدم بھائی بے تابی سے گلاس کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں گھما رہا تھا۔ ان دنوں وہ بالکل خالی تھا۔۔۔ نہ کوئی اسٹور چلا رہا تھا نہ کہیں نوکر تھا۔ یوسف نے باہر سے آتے ہوئے ماں باپ کی نظر بچا کر حفصہ کے ہاتھ میں وہی کاغذ کا ٹکڑا تھما دیا جس پر حفصہ نے وہ پراسرار لفظ لکھا تھا۔

کاغذ کو اپنی مٹھی میں چھپا کر حفصہ اپنے کام میں لگی رہی۔ پھر جب باپ نے سب سے پہلے کھانا شروع کر دیا اور ماں اور یوسف اپنی پلیٹوں میں کھانا لینے لگے تو وہ کچن میں جا کر اس کاغذ کی پشت پر لکھی ہوئی معمے جیسی عبارت کو پڑھنے لگی: "مرد میں غیر معمولی جنسی خواہش، جنسی تڑپ۔" اور لفظ کے صحیح ہجے کیپیٹل لیٹرز میں لکھے ہوئے تھے۔

کھانے کی میز پر سے سارہ کی آواز آئی: "ارے حفصہ، وہاں کچن میں کیا کرنے لگی؟"

"میں جھینگوں کا اچار دیکھ رہی تھی،" حفصہ نے باہر آتے ہوئے کہا۔

"وہ تو کب کا ختم ہو گیا۔"

بہن اور بھائی اپنی اپنی جگہوں پر قدرے مطمئن بیٹھے کھانا کھاتے رہے۔ دونوں اندر سے ناخوش تھے۔ اطمینان اس بات کا تھا کہ آدم کو کوئی بیماری نہیں تھی، لیکن جو تھا وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر خوشی منائی جاتی۔

آدم سب سے پہلے کھانا ختم کر کے حسب عادت "گھومنے جا رہا ہوں" کہتا ہوا نیچے چلا گیا۔ باقی تینوں کے کھانے کی رفتار اور بھی سست ہو گئی۔ یکبارگی منہ تک لائے ہوئے لقمے کو پلیٹ میں رکھتے ہوئے سارہ نے انگلش میں کہا: "سو، پپا کو کیا ہے؟"

یوسف اور حفصہ نے ایک ساتھ کہا: "کچھ نہیں۔ ہمیں معلوم نہیں۔"

"میں نے دیکھ لیا ہے یوسف نے تمہارے ہاتھ میں پرچہ دیا تھا اور تم کچن میں اسے پڑھ رہی تھیں، جھینگوں کے اچار کی باٹلی تلاش نہیں کر رہی تھیں۔"

Scanned with CamScanner

یوسف اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں جیسی سیر پر بیٹھی رہ گئیں۔

یوسف دیر تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ اتنے بڑے شہر میں حقیقت میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ سب ہی اُسے اس کے باپ کی نسبت سے جانتے تھے۔ اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں تھی۔ اس کے دن ہمیشہ سے ساؤتھ میں بہت بُرے گزرے تھے۔ علی گڑھ جانے سے پہلے بھی، اور وہاں سے آنے کے بعد بھی۔ اُسے اس کا کوئی غم نہیں تھا کہ وہ بغیر کوئی ڈگری لیے انڈیا سے واپس آیا تھا۔ سب جانتے تھے ایسا ہی ہوگا کیوں کہ آدم اُسے اپنے پاس سے مشکل کوئی رقم بھیجتا تھا اور رشتے داروں کی بھیجی ہوئی رقم پر وہ ہمیشہ گزارا کرتا رہتا تھا۔ یوں بھی سوسائٹی میں خفّت کا بار وہ بچپن سے اپنے سر پر اٹھائے ہوئے تھا۔ بغیر کوئی ڈگری لیے واپس آ جانے پر اس بار میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ اس نے بچپن سے لے کر آج کے واقعے تک کے درمیانی عرصے پر جگہ جگہ ٹھہر کر نظر دوڑائی۔ ایسا کرنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ کب اُسے اسکول میں پہلی دفعہ ایک لڑکے نے اس کے باپ کی وجہ سے چھیڑا تھا، کب پہلا اسٹور کھلا تھا، اور کب اس کے باپ نے اپنی سیلز گرل کی کمر میں ہاتھ ڈال کر گاہک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا: دیکھو انھیں کیا چاہیے۔ اس پر گاہک کھلکھلا کر سیلز گرل کی طرف بڑھا تھا۔ اس دن رات کو سونے سے پہلے اسے خود سے ایک جنگ لڑنی پڑی تھی۔ پپا ابھی باہر تھے، ممی سونے کے لیے لیٹ چکی تھیں اور حفصہ پڑھتے پڑھتے سو گئی تھی۔ مجھے آج کی بات ممی کو بتانی چاہیے یا نہیں؟ جو کچھ اس نے دیکھا تھا ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔ کیا اور دن بھی پپا اسی طرح کرتے ہیں؟ ممی کو سب کچھ پتا ہوگا۔ میرا خیال ہے کچھ ممی پتا نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے میرے اس بتانے پر کہ پپا اپنی سیلز گرل کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہیں، ممی کو دکھ ہووے۔ ہو سکتا ہے وہ پپا سے گھر آتے ہی کہہ بیٹھیں کہ آپ کو جو کچھ کرنا ہے کریں لیکن گھر سے کم بیٹے کو تو نہ بگاڑیں، اور آدم عیسیٰ قاضی، اس کا باپ، اس کی دُھنائی شروع کر دے کیوں کہ اکثر پی کر وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

اُن دنوں ممی کو بتانے کے لیے اُس کے پاس بہت سی باتیں ہوتی تھیں۔ پپا کا کسی سیلز گرل کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دیر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرنا، اُسے اپنی طرف کھینچنا اور اُس کا مچھلی کی طرح تڑپ کر اس کے ہاتھ سے نکل جانا۔ کبھی کبھی یہی حرکتیں اسٹور میں آنے والی عورتوں سے بھی ہو جاتی تھیں جن کے بارے میں یوسف رائے قائم کر لیتا تھا یہ چالو مال ہے۔ یہ جملہ اس نے اپنے دوستوں میں سنا تھا اور اس کے دماغ نے لڑکیوں اور عورتوں کو بہت کم عمری سے دو خانوں میں بانٹنا شروع کر دیا تھا: یہ چالو ہے، یہ چالو نہیں ہے۔ اور آہستہ آہستہ ساؤتھ کی تمام مونث مخلوق — گوری، مخلوط خون والی (کلرڈ)، ایشین، کالی — خود بخود ان دو خانوں میں بٹنے لگی۔ یہ ایک طرح کا اس کا ذہنی کھیل تھا جو وہ دوستوں میں چلتے ہوئے بھی، جن سے

س کی ذہنی دوری تھی، خود سے کھیل سکتا تھا، جس طرح لڑکوں کا یہ اندازہ لگانا کہ یہ عورت سکرٹ کے نیچے انڈرویر پہنے ہے یا نہیں۔ اس پر وہ لڑکے شرطیں لگاتے تھے اور جیت جانے والے کو ہار جانے والا سگریٹ پلاتا تھا۔ لیکن یہ ذرا بڑا ہو جانے کی بات تھی اور جرأت کی۔

اس نے زندگی کو پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے لوگ، یعنی انڈین، پریشانی کا شکار تھے۔ وہ اس طرح باتیں کرتے تھے گویا کوئی بڑا فساد ہونے والا ہے اور وہ ساوتھ چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ سنتے معلوم تھا وہ جس قوم سے تعلق رکھتا تھا اسے گورے حاکم لوگ پسند نہ تھے، اب وہ خواہ انگریز ہوں خواہ افریکانیر (Afrikaner)، ور انھیں اپنا مستقبل انھیں گوروں کے زیرِ سایہ محفوظ نظر آتا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ افریکانیر اپنی گفتگو میں ہمیشہ، اور سرِعام کبھی کبھی، اُن کے لیے کُولی کا لقب استعمال کرتے تھے۔ ان کے نزدیک سب انڈیا سے آ کر یہاں رہ بسنے والے وہ قُلی تھے جنھیں انگریز یہاں مزدوری حمالی کے لیے لائے تھے۔ اس سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا کہ ایسپ قاضی کا باپ یہاں تجارت کرنے آیا تھا بوجھ ڈھونے نہیں، ور کون ٹیچر کی حیثیت سے آیا تھا اور کون نوکری کرنے۔ خود سارہ کا باپ ایک پڑھا لکھا، عزتِ نفس کا مارا، خودساختہ انسان تھا جس نے بُڑھاپے میں مرنے کے لیے ننگے بھوکے انڈیا کو دولت مند ساوتھ افریقا پر ترجیح دی تھی۔ لیکن آدم عیسیٰ قاضی خود کو کولی پکارے جانے کا بھی بُرا نہیں مانتا تھا۔ اس کے ہم قوم افراد کالوں کا ذکر ما کے لیے باسٹرڈ (حرام زادے) کا لفظ استعمال کیے بغیر نہیں کرتے تھے؛ وہ اس کا بھی عادی نہیں تھا۔ اسے سیاہ عورتیں بھی پسند تھیں۔ وہ جہاں تھا خوش تھا۔ اگر انسانوں کی اس بڑی آبادی کو جس کا نام جنوبی افریقا تھا علاقہ وار آبادیوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا تو کیا ہوا؛ سفید علیحدہ، ملے جلے خون والے علیحدہ، انڈین علیحدہ، زُولو علیحدہ، تو کیا ہوا۔ جہاں لوگ سنجیدگی سے سیاست پر بات کر رہے ہوتے تھے وہ وہاں سے اُٹھ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کالے اور گورے دونوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں اور انڈیا سے آ کر یہاں بس جانے والوں سے دونوں کو نفرت ہے۔ وہ کہتا تھا: نفرت ہے، میں برابر مانتا ہوں۔ پن اپن کو اس سے کیا لینے کا ہے؟ جا کے انڈین وشن میں جمپ مار دیویں؟" واپس انڈیا جا کر وہاں بسنے کا خیال اُس کے ذہن میں کبھی نہیں آیا تھا۔

لیکن یوسف کے لیے یہ باتیں اہم تھیں۔ یہ لوگ جن کے پاس پیسہ تھا، اگر ایسا ہونا ہے جیسا کہ سننے میں آ رہا ہے تو وقت آنے پر اپنا پیسہ لے کر کدھر کو بھی نکل جائیں گے، انگلینڈ، انڈیا، پاکستان یا کہیں اور۔ لیکن خود اُس کے پاس کیا تھا، مہینے کے آخیر تک کا خرچ جو چھوٹی موٹی نوکری سے اُسے ملتا تھا اور اُسے اپنے مالکوں سے نفرت محسوس ہوتی تھی جو اُس پر ترس کھا کر۔۔۔ کہ اس کا باپ رنگیلا ہے، ایک دم کڑکا!۔۔۔ اسے نوکری دے دیتے تھے۔

اُنھیں لوگوں نے ترس کھا کر، جب آدم عیسیٰ قاضی کا کاروبار۔۔۔ اگر اسے کاروبار کہا جا سکتا

Scanned with CamScanner

ہو۔۔ بادل ٹھپ ہو گیا تھا، اس کی پڑھنے کی لگن کو دیکھتے ہوئے اسے علی گڑھ بھیجنے کا سوچا تھا۔

ان کے اس فیصلے کے بعد مئی جون کی وہ صبح آئی جب لوگ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے ڈربن ایرپورٹ پر جمع ہوئے۔ اس وقت اس کے پاس اپنا کیا تھا؟ کچھ بھی نہیں، سوائے اپنے جسم کے جسے زندہ رکھنے میں باپ سے زیادہ ماں نے محنت کی تھی۔ نیا گرم سوٹ جو وہ اس وقت پہنے تھا، کمبل، انڈیا پہنچ کر پہننے کے لیے ٹھنڈے کپڑے، نئے جوتے، سب چیزیں 'بے چارے کا باپ رنگیلا ہے' کو ان لوگوں نے تحفتاً دی تھیں اور اس کا ٹکٹ اور ماہ دو ماہ کا خرچ سب ان لوگوں کی جیب سے آیا تھا جو اسے نصیحت کر رہے تھے: "ماں بہین کے چھوٹنے کا غم مت کرنا، بی اے کر پڑھنا اور ڈاکٹر بن کر لوٹنا۔"

باپ کے چھوٹنے کے غم کی بات کسی نے نہیں کی جو اس سردی میں ایک بوسیدہ سا اوور کوٹ پہنے ٹھٹھر رہا تھا اور ایک ایک سے یوسف کو جہاز پر چھوڑنے آنے کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ اسے نہیں معلوم تھا تمام خرچ کون کر رہا ہے۔ اس کے کان میں اس قسم کی باتیں پڑی تھیں کہ یوسف علی گڑھ جا رہا ہے، وہاں وہ پڑھے گا جس طرح اور بہت سے ساؤتھ کے لڑکے بمبئی اور علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ اس نے اس سلسلے میں سارہ کو بھاگ دوڑ کرتے دیکھا تھا اور اپنے ٹمبری اسٹور میں، جس پر بے کسی برستی تھی اور مشکل ہی سے کوئی گاہک آتا تھا، کھڑے کھڑے وہ سوچتا تھا یہ سب کیسے ہو رہا؟ اور پھر اس خیال کو جھٹک کر دماغ سے نکال دیتا تھا جس طرح ساؤتھ کی سیاست کے جھمیلوں کو۔ اس وقت تو وہ خوشی کے آنسو آنکھوں میں بھرے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بیٹے کو جو اس کی آنکھ کا تارا تھا، سی آف کرنے آنے کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

جیٹی سے دور ہوتے ہوئے جہاز پر سے یوسف دیر تک اس سین کو دیکھتا رہا۔ لوگ اسے ہاتھ ہلا رہے ہیں، ماں اور حفصہ ایک طرف کو، سب سے الگ، کھڑی اسے دیکھ رہی ہیں اور کبھی کبھی ماں رومال اپنی آنکھوں سے چھو لیتی ہے۔ پھر دور سے اسے، اتنی دیر سے خاموش کھڑی حفصہ ہنسی ماں سے چپٹتی نظر آئی۔ ان دونوں سے پرے، سرکس کے مسخرے کی طرح اس کا باپ کبھی اچک کر دونوں ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اسے الوداع کرتا تھا، کبھی اِس بھائی اور اُس بھائی سے لپٹ کر اپنے گریہ کا اظہار کرتا تھا۔

سارہ نے اسے بار بار کہتے سنا: "غم سے میرا سینہ پھٹ جائے گا۔ یوسف میرا اکلوتا بیٹا ہے۔"

لیکن لوگ اس کے ان جملوں پر ہنس رہے تھے، یہاں تک کہ وہ ڈیک پر کھڑے ہوئے یوسف کی اور یوسف اُن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

کسی دوسرے ملک اور اجنبی ماحول میں ہونے سے جو سکونِ قلب ملتا ہے اُسے صرف وہی

سمجھ سکتا ہے جس کی زندگی اپنے ماحول، اپنے شہر میں ہر طرح کے عذاب سے گھری رہی ہو۔

علی گڑھ کے لڑکے اُسے یوسف کہتے تھے یا گجراتیوں کے طور طریقوں سے واقف لڑکے یوسف بھائی۔ کسی کے لیے وہ "بےچارے کا باپ رنگیلا ہے" نہیں تھا جس حوالے سے وہ جوہانس برگ میں بالخصوص اپنی کمیونٹی میں پہچانا جاتا تھا۔ سب کا خیال تھا گجراتیوں کاٹھیاواڑیوں کی طرح وہ بھی کسی سیٹھ کا بیٹا ہے۔ آہستہ آہستہ یوسف کا سہما سہما رہنا ختم ہوتا گیا۔ جس دن حفصہ اور اس کی ماں کا مشترکہ خط آتا تھا اُس پر جنت کے دروازے کھل جاتے تھے۔ وہ سوچتا تھا کسی دن۔۔۔۔

لیکن اُس کسی دن کے خواب کو خرچے کی تنگی اس طرح پریشان کرتی رہتی تھی جس طرح سونے والے کو پلنگ میں چھپے کھٹمل یا کان پر بھن بھن کرتے ہوئے مچھر۔ جن ہمدردوں کی ایما اور دلاسے پر سارہ نے اسے علی گڑھ بھیجا تھا اُن کی مدد غیر مستقل تھی حالاں کہ معاہدہ جو رہا تھا یہی تھا کہ وہ یونیورسٹی کے دو اور میڈیکل کالج کے پانچ سالوں کا خرچ اُسے دیتے رہیں گے جس میں جتنا بن پڑے گا وہ اپنی اور حفصہ کی محنت سے شامل کرے گی۔۔۔ آدم عیسیٰ کیا دے گا اس پر تکیہ کرنا بے سود تھا۔۔۔ اور جب یوسف ڈاکٹر بن جائے گا تو ان کے اس قرضِ حسنہ کو آہستہ آہستہ اتار دے گا۔

لیکن خرچے کے بارے میں متفکر رہ کر پڑھنا آسان کام نہیں ہے۔ اپنے ملک کی سیاست اور خطرے کو بھول کر وہ بھی مقامی لڑکوں کی طرح مسلم لیگ اور کانگریس کی سیاست میں دلچسپی لینے لگا، یہاں تک کہ ایک دن اُس نے محسوس کیا کہ باہر کے ملکوں سے آئے مسلمان طلبا جن میں گجراتی کاٹھیاواڑی بھی تھے، پاکستان جا رہے ہیں جو اب تک خیالات کی دنیا سے عالمِ وجود میں آ گیا تھا۔

سارہ کے خطوں سے پتا چلتا تھا اس کے لیے اُسے علی گڑھ میں رکھنا یا پاکستان بھیجنا دشوار سے دشوار تر ہوتا جا رہا ہے۔ یوں ایک دن پھر اس نے خود کو ڈربن کی جیٹی پر کھڑے دیکھا جہاں اس کی ماں، حفصہ اور باپ کھڑے تھے ور چند رشتےدار۔ سارہ کی آنکھوں میں آنسو تھے، بیٹے سے دو سال بعد ملنے کی خوشی کے، لیکن اُن آنسوؤں میں کتنی آمیزش ہر سمت خوردگی کی تھی یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔ حفصہ اس سے چپٹ کر ملی۔ وہ بھی رو رہی تھی۔ یوسف کا چہرہ خفّت سے سُتا ہوا تھا جتنے آنسو تھے وہ انھیں علی گڑھ سے بمبئی اور بمبئی سے ڈربن کے طویل سفر میں زادِ راہ کی طرح خرچ کرتا آیا تھا اور اب اُس کی آنکھیں کھوکھلی سی لگ رہی تھیں۔ ان تینوں سے ذرا ہٹ کر آدم عیسیٰ قاسمی کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کی رات بےچینی سے کٹی تھی کیوں کہ رات اُسے بالکل پینے کو نہیں ملی تھی لیکن اُسے امید تھی وہ جلد ہی کسی دھندے سے لگ جائے گا، اپنا یا کسی اور کا، اور پھر

Scanned with CamScanner

یہ کہ سارہ اُس سے کہہ چکی تھی یوسف بے چارے کے پڑھائی کے دن ختم ہو چکے، اب اُسے روزی کمانی پڑے گی۔ اور اس کا مطلب آدم عیسیٰ قاضی نے یہ لیا تھا کہ یوسف کی تعلیم پوری ہو چکی ہے اور اب وہ بھی گھر کا کمانے والا فرد ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ اُسے کیا چاہیے تھا۔

***

رات کو سوتے وقت یوسف کے دماغ میں وہی لفظ بار بار گونجا جو اُسے معلوم تھا اپنے ذہن میں لیے اُس کی بہن سوئی ہو گی؛ جو اُس کا باپ تھا اور شکر ہے اُس کی ماں نہیں تھی۔ ایسی عورتوں کے لیے بھی کوئی لفظ ہوتا ہو گا جیسی اُس نے حساب لگایا سوسائٹی میں کون کون تھی -- چھوٹی بڑی ہر عمر کی، گوری، کرڈ، ایشین اور کالی سیاہ -- جن کی ریپوٹیشن اچھی نہیں تھی۔ ان میں سے چند ایک کے لیے اُس کے دماغ نے بہک جانا چاہا لیکن اُسی لمحے اُسے خود میں اپنے باپ کی جھلک نظر آئی جس سے اُسے بیک وقت شدید نفرت بھی تھی اور ہمدردی بھی۔ محبت نہیں۔ ہمیشہ اپنے اندر ایسے جذبات پیدا ہونے پر اُس کا دل دھڑکنے لگتا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتی تھیں۔ میرے دادا ایسے تھے، میرا باپ ایسا ہے، کہیں میں خود بھی تو ایسا نہیں بننے جا رہا ہوں جو یہ خیالات مجھے گھیر لیتے ہیں؟ یہ سچ ہے اُسے علی گڑھ سے لوٹے تین سال ہو چکے تھے اور اس نے شراب اور عورت کو چکھا بھی نہیں تھا، اور ان تین سالوں میں اس کی بستی پھر سے سکڑ کر بشم کے اس کونے میں بند ہو گئی تھی جس کا نام تھا: بے چارے کا باپ رنگیلا ہے۔

برابر کے کمرے میں لیٹی سارہ کچھ پڑھ رہی تھی اور آدم صاحب نہ جانے کس کے خرچے پر خوب پی کر گھر لوٹا تھا اور اس کے خراٹوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ سارہ نے اس کے ہڈیوں بھرے چہرے کو دیکھا اور پھر سر سے پاؤں تک نظر دوڑائی۔ وہ عام پینے والوں سے کتنا مختلف تھا۔ لگتا تھا شراب اس کے جسم میں سے ہو کر گزر جاتی ہے، اپنا کوئی نشان پیچھے نہیں چھوڑتی، جیسے موٹاپا، بڑھی توند، ہائی بلڈ پریشر یا کوئی اور مرض جن کے شکار ہو کر کمیونٹی میں کتنے ہی مرد خدا کو پیارے ہو چکے تھے۔ اور یہاں اس کے برابر میں لیٹا ہوا ایک دُبلا لمبا جسم تھا، پُرسکون، سیاست، تجارت، گھریلو لڑائیوں کی دنیا سے دور۔ کاش وہ خود بھی اندر سے اتنی ہی شانت ہوتی اور دونوں بچے بھی۔ لیکن ایسا نصیب سب کا نہیں ہوتا۔

آدم جن دنوں کمانے لگتا تھا آدھی کمائی گھر کو دیتا تھا اور آدھی میں اپنا گزارا کرتا تھا۔ کاروبار کی دنیا میں اگر اس کی ساکھ گر گئی تھی تو پینے پلانے والوں کی دنیا میں اس کی ساکھ اتنی ہی مضبوط ہو گئی تھی۔ لوگوں کو اُس کے ساتھ پینے میں مزہ آتا تھا کیوں کہ ایک ہی پیگ کے بعد وہ بہتے ہوئے دن کی طرح اگر ایک بار کھلنے پر آتا تھا تو کھلتا ہی چلا جاتا تھا۔ لوگ پی کر رونے لگتے ہیں یا کمینے پن پر اتر آتے ہیں، وہ پی کر بیک وقت الف لیلہ اور کاما سوترا کا مصنف بن جاتا تھا۔ کس پر کیا

Scanned with CamScanner

بیتی تھی اور کس طرح آن بیاہی لڑکی پر ہاتھ ڈالنا چاہیے۔ اس کی گفتگو سوسائٹی کے اور اپنے تجربات اور ان سے پیدا ہونے والے اُس کے فلسفے سے مملو ہوتی تھی۔ انہیں محفلوں میں کسی کسی اُسے ایک بار پھر اپنی بزنس کی کوشش کرنے کا آسرا کوئی دے بیٹھتا تھا اور اگر وہ بالکل ہی کڑکا ہوتا تھا تو ساتھ پینے والوں میں سے کوئی اُسے کل سے کام پر آجانے کی پیش کش کر دیتا تھا۔

انہیں دنوں جوہانس برگ کے افق پر ابراہیم نمودار ہوا۔۔ایک ہیٹیر گھرانے کا روشن مستقبل۔۔ اور اس کے آنے کی خبر سب سے پہلے آدم عیسیٰ قاضی نے اپنی بیوی کو دی کہ ڈربن پہنچ گیا ہے اور دو ایک دن میں جوہانس برگ پہنچ جائے گا۔ سارہ کے کام میں لگے ہوئے ہاتھ اس خبر پر پہلے سُست ہوئے، پھر رک گئے۔

"ڈاکٹر بن گیا؟"

"میرے کو کیا معلوم۔"

"بالکل لوٹ رہا ہے یا تھوڑے دنوں کو آیا ہے؟"

"میرے کو کیا معلوم۔ اور میرا خیال ہے اس سے زیادہ اس کے باپ کو بھی پتا نہیں ہے جس نے میرے کو یہ خبر سنائی وہ ایسے سنائی جیسے اس کا بیٹا جو دوسروں کے ٹکڑوں پر پلا ہے ہندوستان پاکستان فتح کر کے اب ساؤتھ افریقا کو فتح کرنے کو آیا ہے۔ سالا پیے ہوئے تھا۔"

ابراہیم دوسروں کے ٹکڑوں پر نہیں پلا تھا۔ اُس میں اور یوسف میں بڑا فرق تھا۔ وہ پہلے انڈیا میں اور پاکستان بن جانے کے بعد وہاں پچھلے چھ سات سال سے تھا۔ اس کی ماں کے رشتے دار بمبئی میں بھی تھے اور کراچی میں بھی جو اُسے بخوشی فنانس کر رہے تھے، اور اُسے ڈاکٹر بن جانے پر کسی قسم کے قرضے کو اُتارنا بھی نہیں تھا۔

"لڑکا اچھا ہے،" سارہ نے کہا۔

"میں کب کہتا ہوں بُرا ہے،" آدم نے جواب دیا۔

سارہ نے اس کے چہرے کو دیکھا کہ اس پر کہیں امید بھری خوشی کی رمق ہے جو کسی ایسے شخص کے چہرے پر ہونی چاہیے تھی جس کی بیٹی سترہ اٹھارہ سال کی ہو اور کنواری ہو، لیکن آدم کا چہرہ اس معاملے میں بالکل سپاٹ تھا۔ وہ دیر تک ابراہیم کے باپ کو بُرا بھلا کہتا رہا جو سالا دوسروں سے فرمائش کر کے وسکی پیتا تھا اور خود کسی کو ایک سگریٹ بھی نہیں پلا سکتا تھا۔ گھر سے باہر جاتے ہوئے اس نے جھلاہٹ میں کہا: "اس سالے کے بیٹے کو انڈیا پاکستان میں پڑھنے کا کیا حق تھا؟"

"حق ہے،" سارہ نے کہا "میری طرح کے اُس کی ماں کے بھائی نہیں ہیں۔ ان کے پاس پیسہ ہے اور وہ اپنے بھانجے کو پڑھا رہے ہیں اور اپنی بہن کا گھر بھی چلا رہے ہیں۔" یہ کہتے کہتے وہ رو

Scanned with CamScanner

پڑی۔ آخری الفاظ اس کے سینے ہی میں دب کر رہ گئے کہ نہ اُسے تعلیم ادھوری چھوڑنی پڑے گی، نہ پاس ہو جانے پر اپنے ماموؤں خالاؤں کا قرضہ اتارنا پڑے گا جس کا کھٹکا یوسف کو جتنے دن وہ انڈیا میں رہا تھا ہر وقت لگا رہتا تھا۔

شام کو جب یوسف گھر لوٹا تو سارہ نے اس سے بظاہر بے تعلقی سے پوچھا: "سنا ہے احمد بھائی پٹیل کا بیٹا ساؤتھ لوٹ آیا ہے۔"

"تھوڑے دنوں کو،" یوسف نے کہا۔ "وہ اور اُس کی ماں اس کے لیے لڑکی دیکھ رہے ہیں۔"

سارہ کے سینے میں دُھکڑ پکڑ ہونے لگی۔ وہ مزید کچھ سننا چاہتی تھی۔

یوسف نے جوتے موزے اتار کر دن بھر کے تھکے ہوئے پیروں کو ٹھنڈے فرش پر رکھ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا: "ممی، میرا خیال ہے آپ کے اور میرے ساتھ حفصہ بھی اس گھر کا خرچ چلانے میں تنگی جا رہی ہے۔ کیا بُرا ہے اگر ہم ابراہیم کو ایک دن کھانے پر بلائیں۔"

سارہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ یوسف کہہ گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کہا: "ہاں، کیا بُرا ہے۔ ابھی حفصہ بڑی تو نہیں ہے دیکھنے میں۔"

"بڑی؟" یوسف نے تعجب سے کہا۔ "وہ تو لِلی کی طرح نازک اور سفید ہے۔"

سارہ جانتی تھی یوسف اور حفصہ ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔ بہن کو سوسن کے پھول سے تشبیہ دے کر اس نے گویا خود اپنی ماں کے حُسن کی تعریف کی تھی۔

پھر ایک دن اپنی سوزری سے لوٹتے ہوئے جہاں وہ اُن دنوں کام کرتا تھا، اس کی نظر ابراہیم پر پڑی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کیسے پہچان لیا۔ ابراہیم یوسف سے بالکل مختلف تھا۔ دوسروں کے پیسے پر پڑھنے نے اس کی شخصیت کو مجروح نہیں کیا تھا۔ نہ وہ بات جھجک کر کرتا تھا، نہ یوسف کے ساتھ چلتے ہوئے اُس کے کندھے نیچے کو گرے ہوئے تھے اور نہ سینہ اندر کو دھنسا ہوا تھا جیسا ایک خود سے شرمندہ انسان کا ہوتا ہے۔ دونوں ایک ہی سمت میں جا رہے تھے۔ پہلے وہ پاکستان کی سیاست پر بات کرتا رہا جس سے یوسف ناواقف تھا۔ پھر ساؤتھ افریقا کی سیاست پر جس میں یوسف کو اگر دل چسپی تھی تو بس اتنی کہ یہاں سے جتنی جلدی نکل لیا جائے اچھا ہے۔ پھر ہمت کر کے یوسف نے اسے گھر چلنے کی دعوت دی جسے ابراہیم نے "کسی اور دن سہی" پر ملتوی رکھا۔ ابھی وہ یہاں تین چار ہفتے تھا۔ اس کے بعد اُسے پاکستان جا کر آخری سال کا امتحان دینا تھا۔

"اس کے بعد؟" یوسف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بیک ٹو دی بیو-لیں،" اس نے مسکرا کر کہا، اور پھر ایک دم جوش میں آتے ہوئے بولا:

Scanned with CamScanner

"مجھے انڈیا پاکستان دونوں سے نفرت ہے۔ بھکاریوں کے ملک۔ ہر طرف گندگی۔ میں یہیں واپس آؤں گا اور اپنی پریکٹس جماؤں گا۔"

ایک جوڑا بے پر پہنچ کر دونوں نے ایک دوسرے کو "سو لونگ" کیا اور چند قدم چل کر یوسف نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے کہا: "یاد رکھنا ایک رات کھانا ہمارے ساتھ کھانا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اُسے یقین تھا اس معاملے میں ممی کی اور اس کی رائیں دو نہیں ہو سکتیں۔

تقریباً دو ہفتے بعد وہ دن آیا جب ابراہیم اپنے ماں باپ کے ساتھ آدم عیسیٰ قاضی کے گھر رات کے کھانے پر آیا۔ اتنے دنوں وہ پرسٹوریا، کیپ ٹاؤن، لیڈی اسمتھ، پیٹر میرٹس برگ، ڈربن اور نہ جانے کہاں کہاں گردش میں رہا تھا اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔

حفصہ کو دیکھ کر وہ مبہوت رہ گیا کہ اتنی خوب صورت لڑکیاں بھی دنیا میں ہو سکتی ہیں۔ آدم عیسیٰ قاضی، آج کی دعوت کی سیاست سے بے خبر، ابراہیم سے کھل کر گپیں ہانک رہا تھا جیسے وہ اس کا ہم عمر ہو۔ احمد بھائی پٹیل سے وہ بے رُخی برت رہا تھا۔ بس کبھی کبھی اُس کی بیوی یعنی ابراہیم کی ماں کی کسی بات کا جواب دے دیتا تھا۔ دونوں عورتیں شاید زندگی میں پہلی بار ایک دوسرے سے اتنے قریب سے ملی تھیں۔ پھر سارہ اٹھ کر کھانا لگانے میں حفصہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔

کھانا کھاتے میں ابراہیم نے کئی بار حفصہ سے بات کرنا چاہی لیکن وہ نظریں نیچی کیے کھانا کھاتی رہی۔

اسے ایک کامیاب ڈنر کہا جا سکتا تھا۔

شادی والے دن بھی آدم عیسیٰ قاضی احمد بھائی پٹیل سے کھنچا کھنچا سا رہا۔ اپنے شادی کے لباس میں حفصہ واقعی لنی لگ رہی تھی اور ابراہیم اپنے نئے سوٹ میں لگ رہا تھا اسی کے لیے بنا ہے۔ آدم عیسیٰ قاضی کو نکاح کے وقت تعجب تھا کہ یوسف کی ماں نے شادی کا انتظام کیسے اور کہاں سے کیا۔ دونوں گھرانے کڑکے ہیں، اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سوچا، اور یہ بہت بھی یہی ہو گی کہ ابراہیم کی طرف سے خرچ اس کے ماموؤں نے کیا ہو گا۔ پر سارہ نے کہاں سے؟ خیر، اس نے آمین کی جگہ منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے زور سے کہا۔ اس کے دونوں طرف بیٹھے ہوئے آدمیوں نے چونک کر اُسے گھور کر دیکھا۔ کیا وہ اس وقت بھی پیے ہوئے ہے؟ لیکن ایسا نہیں تھا۔ رخصتی کے وقت سب نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ سارہ کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔

شادی کے کچھ عرصے بعد ابراہیم پاکستان واپس چلا گیا اور حفصہ سے وعدہ کر گیا کہ وہ اُسے اور اس کی ماں کو جلد وہاں سیر کے لیے بلائے گا اور چاہیں تو ماں بیٹی عمرہ کرتی ہوئی وہاں آئیں یا واپسی پر کریں۔ آخر وہ اپنے نانا کی ولادیں واحد لڑکا تھا اور ان کے آنے جانے اور عمرہ کا خرچ بہ آسانی

برداشت کر سکتا تھا۔

***

حفصہ کی شادی کے بعد اگر آدم عیسیٰ قاضی کو تھوڑی بہت گھر کی فکر رہتی بھی تھی تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ اور اس فکر کو ختم کرنے میں بڑا ہاتھ یوسف کا تھا جو اس گھر کا بار بردار گھوڑا تھا۔ حفصہ نے اپنی ماں کے ساتھ عمرہ کیا اور ایک چکر پاکستان کا لگایا۔ پھر ابراہیم جوہانس برگ لوٹ آیا اور اپنی پریکٹس شروع کر دی۔ حفصہ کے پہلا بیٹا ہوا اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد بائیس سال کی عمر میں یوسف کی شادی عائشہ سے ہو گئی۔ اپنے گھر کی اس دوسری شادی کے وقت بھی آدم عیسیٰ قاضی کھویا کھویا سا تھا۔ اُسے تعجب تھا یوسف شادی کر رہا ہے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اٹھائے وہ خود سے بولتا رہا۔ اگر کوئی کان قریب لا کر غور سے سنتا تو اسے پتا چلتا آدم حساب لگا رہا تھا وہ خود کتنا بڑا تھا جب اُس کی شادی سارہ سے ہوئی تھی اور یوسف کی عمر اس وقت کتنی ہے۔ سب کے ساتھ دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھوں کو منہ پر پھیرتے ہوئے اس نے کہا: "بیس یا بائیس۔"

اس پر اس کے آزو بازو بیٹھے ہوئے دونوں شخص چونک پڑے۔ ان میں سے ایک نے اُسے کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے پوچھا: "کس کی شادی ہے؟"

"میرے بیٹے کی،" آدم نے سینہ باہر نکالتے ہوئے کہا۔

توقع کے خلاف آدم کے تعلقات عائشہ سے بہت اچھے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سارہ اور یوسف اس سے بات کرتے ہوئے کتراتے تھے اور عائشہ اس پر ترس کھا کر کھانا ختم ہو جانے کے بعد کھانے کی میز پر بیٹھی دیر تک اس کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ اکثر اُسے آدم کی سانس پر سور شراب کا بھبکا آیا لیکن اس نے اس کا بُرا نہیں منایا اور نہ ہی آدم کو ٹوکا۔ نہ ہی وہ بو کے آنے پر اس سے پرے کو ہٹتی تھی جیسا کہ سارہ، یوسف اور حفصہ کرتے تھے۔ بلکہ حفصہ اگر ماں کے گھر آئی ہوئی ہوتی تو بالعموم باپ سے پرے پرے رہتی تھی۔ عائشہ اس کی چھوٹی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے لگی اور بدلہ چکانے کے لیے آدم کبھی کبھی اس کے لیے کیڈبری چوکلیٹ لے کر آتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے عائشہ کو پرفیوم کی شیشی بھی دی۔

اس رات یوسف نے بیوی سے مذاق میں کہا: "ہوشیار رہو۔ جانتی ہو جوبرگ کی لڑکیاں اُسے کیا کہتی ہیں؟"

"اولڈ رومیو" عائشہ نے کہا۔

"بس؟ تم جوبرگ کی نہیں ہو ورنہ اس کے ناموں کی فہرست تمہیں ازبر ہوتی۔"

"اولڈ کروک،" عائشہ نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، be careful۔"

Scanned with CamScanner

عائشہ نے یوسف کی طرف کروٹ لی اور بازوؤں پر دھڑ کو اٹھاتے ہوئے یوسف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ کیا وہ یہ بات سنجیدگی سے کہہ رہا تھا؟ لیکن یوسف کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس کے اپنے اوپر جھکے ہوئے سر کو ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا: "ڈر گئیں؟"

"کاہے سے؟" عائشہ نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "مگرمچھوں، سانپوں سے میں نہیں ڈرتی۔"

بات آئی گئی ہو گئی۔ دونوں دیر تک مستقبل کے منصوبے بناتے رہے۔ یوسف کا ارادہ کراچی جا کر کوئی کاروبار کرنے کا تھا۔ عائشہ جہاں تھی خوش تھی لیکن اگر یوسف ایک دن جب اس کا کاروبار کراچی میں جم جائے گا اور ان سب کو وہاں بلانے کا کہا گا تو وہ اس کے لیے بھی تیار تھی۔

ابراہیم اور حفصہ ساؤتھ میں اپنی زندگی سے مطمئن تھے اور چھٹی والے دن جب وہ ماں کے گھر آتی تو یوسف کی ان باتوں کی کاٹ کرتی تھی۔ "ہم لوگ کیوں یہ ملک چھوڑیں؟ ہم یہیں پیدا ہوئے ہیں اور یہیں کے ہیں۔ ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی کی طرح مجھے یہاں گھٹن محسوس نہیں ہوتی۔ اگر یہ ملک کالوں اور گوروں کا ہے تو ہمارا بھی ہے۔ ہم لوگوں نے بھی اس کے بنانے میں حصّہ لیا ہے۔"

یوسف کہتا: "اس کو کوئی نہیں مانتا ہے۔ سفید کہتے ہیں تم مزدور بنا کر لائے گئے تھے، اپنی مزدوری لے چکے ہو، اب واپس جاؤ۔ کالے کہتے ہیں تم افریکانیرز کے وفادار ہو، آزادی کی جنگ میں انہیں کا ساتھ دے رہے ہو۔"

حفصہ مدافعت میں کہتی: "ہم کسی کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ نہ کسی کے خلاف ہیں۔"

درحقیقت میں وہ اپنے گھر کام کرنے کے لیے آنے والے نوکر سے بہت اخلاق سے پیش آتی تھی۔ وہ اس کے بیوی بچوں کا بھی بہت خیال رکھتی تھی۔

صابرہ بی بی ایک اچھی ساس تھی جس نے ایک شرابی شوہر کے ساتھ زندگی گزار کر خاموش رہنے کا گر سیکھ لیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے ابراہیم پیتا تھا، پر یہاں ساؤتھ میں سوائے معدودے چند کے کون نہیں پیتا تھا؟ جن کے اب لمبی لمبی سفید یا کھچڑی داڑھیاں تھیں اپنے وقت میں سب کچھ کر چکے تھے اور اب تائب ہو کر تھوڑا بہت دین کا کام بھی کرنے لگے تھے۔ اس کا سسر رنجاں مرنج آدمی تھا۔ بس اس پر شام کے وقت گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی اور وہ گھر سے نکل پڑتا تھا۔ پھر دو چار گھنٹے بعد جب لوٹتا تو ایسی جھیل کی طرح شانت ہوتا جس کے پانی کو ہوا نہ چھیڑ رہی ہو۔ حفصہ گھر میں نہ اس کی موجودگی کو محسوس کرتی تھی نہ غیر حاضری کو۔

آدم کی گھر میں موجودگی کو سب ہی محسوس کرتے تھے کیوں کہ وہ زور زور سے بولنے کا عادی تھا۔ اس کی غیر موجودگی کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا تھا۔ جتنی دیر وہ باہر رہتا تھا عائشہ اور سارہ

مکمل کر ہی نہیں کر سکتی تھیں اور اگر یوسف گھر میں ہوتا تو وہ بھی ان کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی بک سکتا۔ لیکن ایک دن جب آدم صبح کا نکلا رات تک گھر نہیں آیا تو سب کو تشویش ہو گئی۔ وہ کھانا ہمیشہ دونوں وقت گھر ہی کھاتا تھا، شاید اس وجہ سے کہ کوئی اور باہر کھلانے والا ہی نہیں ہوتا تھا۔ یوسف اس کی تلاش میں اس کے دوستوں کے گھر گیا اور ان ٹھکانوں پر جہاں پیسے چلانے کا سلسلہ ہوتا تھا، اور بالآخر ایک جگہ اُسے پتہ چلا کہ ان آدم بھائی عیسیٰ قاضی وہاں ہے اور اپنے آپے میں نہیں ہے کیوں کہ بہت چڑھا گیا ہے۔

جب یوسف بھیڑ میں داخل ہوا تو اس نے اپنے پپا کو سب کے بیچ میں کھڑا دیکھا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے ٹائی کی ناٹ کو ڈھیلا کر کے اس نے قمیص کا اوپر کا بٹن کھول رکھا تھا قمیص بھی جگہ جگہ سے پتلون سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پیلے رنگ کا ڈرنک تھا جو بیئر بھی ہو سکتی تھی اور وسکی بھی۔ لیکن اطوار بتا رہے تھے کہ وہ کافی دیر سے وسکی چڑھا تا رہا ہے۔ دوسروں کے ہاتھوں میں بھی گلاس تھے لیکن ٹائی اور بال درست تھے۔ چند ایک نے گرمی کی وجہ سے کوٹ اتار کر کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ ادھیڑ عمر والے بھی اور دو ایک بوڑھے، یعنی جتنی آدم عیسیٰ قاضی کی عمر تھے اتنے، یا اس سے کچھ بڑے۔ سب کی توجہ کا مرکز آدم بھائی تھا۔

یوسف جہاں تک بھیڑ میں بڑھا تھا وہیں پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ اس کا باپ ایک طرح کا بھاشن کر رہا تھا، اپنی جوانی کی کارگزاریوں کا جنھیں سننے کا بچپن سے اب تک یوسف عادی ہو چکا تھا لیکن اس وقت جو بات ہو رہی تھی اُسے سنتے ہوئے یوسف کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین میں سما جائے یا اس شہر ہی سے ایک دم غائب ہو جائے۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب وہ بیس کا ہو گا اور اس کا باپ چوالیس پینتالیس کا اور جب ابراہیم جو بہت بعد اس کا بہنوئی بننے والا تھا نیا نیا پاکستان سے آیا تھا۔

اس کے باپ نے گلاس سے ایک بڑا سا گھونٹ لے کر کہا: 'میں اس مرد کی عزت نہیں کرتا ہوں جو حقیقت میں مرد نہیں ہے۔'

کسی نے کہا: 'اپنی بدمستی کی کہانی سنانے جا رہا ہے۔'

'ہاں ہاں، اپنی بدمستی کی، تمھاری نہیں۔ اور یہ کہانی نہیں ہے حقیقت ہے۔ میں نے ایک کام زندگی میں کبھی نہیں کیا ہے، کیا؟ جھوٹ نہیں بولا۔ اب میں تمھارے کو بتلاتا ہوں، ابراہیم کو میں نے پہلے ہی ٹیسٹ کر لیا تھا۔ اُن دنوں یک ہی شیلز کی عورت یہاں تھی۔ مارتھا، ماریا یا میری، ایسی کچھ اس کا نام تھا۔ وہ ا' میٹ کی طرح سفید تھی۔' اس نے سامنے رکھی ہوئی خالی پلیٹ کو چھوتے ہوئے کہا۔ 'پورسلین وائٹ۔ تھوڑی بھاری پڑ گئی تھی، پر تھی میری عمر کی، یا مجھ سے کچھ کم یا زیادہ۔ خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پی کر وہ ایسی ہو جاتی تھی کہ کوئین وائڑ کا کام

Scanned with CamScanner

کرتی تھی۔ ایک گھونٹ پی کر ہی بھوک لگنے لگے۔ ایک دم بھوک کھل جاوے۔ very appetising"

ایک نوجوان ڈاکٹر نے کہا: "!A real aperitif"

آدم نے ہنستے ہوئے کہا: "سالی مچھی کی طرح پیتی تھی۔ ایک رات اس نے مجھے سوتے سے جگایا۔ میں نے کہا کیا ہوا؟ مجھے تعجب تھا مجھ سے چار گنا وسکی اس نے پی تھی اور پھر بھی نشے کا اس کے چہرے پر نام تک نہیں تھا۔ اس وقت وہ مجھے ایک دم بوڑھی لگی اور مجھے تعجب ہوا رات کو سونے سے پہلے وہ مجھے بیس بائیس سال کی دکھ رہی تھی۔ یہ ایک دم شراب کی کیسے ہو گئی؟ میں نے سوچا سالی پینک میں ہے۔ اس نے اپنے ڈینچرز منہ میں فٹ کرتے ہوئے مجھے پھر سے بلانا شروع کر دیا حالاں کہ میں پوری طرح سے جاگ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا ہے، اور یوں ہی اس کا دل رکھنے کو اپنی بات کے آخر میں ڈارلنگ کا لفظ جوڑ دیا۔ حالاں کہ اس وقت وہ میرے کو ڈارلنگ کی جگہ ڈائن دکھ رہی تھی اور وہ بھی حقیقت میں بے دانتوں کی۔

نوجوان اس کی گفتگو میں مکمل کے دلچسپی لے رہے تھے، بوڑھے خفیف سے تھے اور یوسف اپنی جگہ پر بے بس کھڑا تھا۔ نہ اس میں اتنی ہمت تھی کہ وہ آگے بڑھ کر باپ کو کھینچ کر وہاں سے لے جائے، نہ ہی تجسس اسے وہاں سے کھسک جانے کی اجازت دے رہا تھا۔ براہیم کا اس قصے میں کیا رول تھا اور یہ بات بھی جو تھوڑی دیر میں پورے جوبرگ کی گجراتی کمیونٹی میں پھیل جائے گی، اور وہاں سے دوسری ایشین کمیونٹیز میں، اس کے باپ کے دماغ پر چڑھی ہوئی شراب کا نتیجہ تھی جیسے پہلے بارہا ہو چکا تھا یا اس کی کوئی حقیقت تھی؟

آدم بھائی ایک بار پھر سی شیلز والی عورت کے نام پر اٹکا ہوا تھا: "یاد نہیں کیا تھا، انجیلا یا گریس۔"

کسی نے کہا: "مارتھا۔"

"تمھیں کیسے پتا چلا؟" اس نے چونک کر کہا۔ "کیا تم بھی اس کے ساتھ سو چکے ہو؟"

وہ نوجوان تھوڑا جز بز ہوا اور جھینپ مٹانے کو بولا: "!Carry on"

پھر آدم خود ہی بولا: "مارتھا ہی ہوگا، بلکہ مارتھا ہی تھا اس کا نام۔ اپنے ڈینٹ فٹ کر کے مجھ سے بولی، ڈارلنگ میں مرنے جا رہی ہوں۔ میں نے کہا کاہے کو؟ وہ بولی، I am dying، مر رہی ہوں۔" یہ کہہ کر آدم عیسیٰ قاضی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ "سالی نے غلطی سے سرہانے رکھا ہوا وہ پانی پی لیا تھا جس میں سونے سے پہلے اپنے ڈینچر ڈبو کر رکھتی تھی اور جس میں ہائیڈروجن پراوکسائیڈ دھوں آدھ ڈالا ہوا تھا۔ تب ہی اس کے دانت دل میں چمکتے تھے۔ اوہ میں یہ بتانا بھول گیا میں اس رات اس کے فلیٹ میں سویا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا تو نے ایسا کام کاہے کو کیا؟ بولی۔۔۔" آدم

Scanned with CamScanner

عیسیٰ لاشی نے اپنے ماتھے کو دونوں طرف سے انگلیوں اور ہتھیلیوں سے پکڑ کر ہنسی سے بےحال ہوتے ہوئے کہا، "نیند میں پیاس لگی تھی، آج زیادہ پی گئی تھی اور وہ بھی جن، گلا خشک تھا۔"

اب آدم عیسیٰ لاشی سے دوہرا ہو کر ہنسنا شروع کیا۔ "کہہ رہی تھی آج زیادہ پی گئی تھی، جیسے اور روز کم پیتی تھی۔ سالی رات دن مچھلی کی طرح شراب میں تیرتی تھی اور مجھ سے کہہ رہی تھی آج پی زیادہ گئی تھی۔ خیر میں نے کہا، اب میں اس وقت تیرے لیے ڈاکٹر کہاں سے لاؤں، الٹی کر لے۔ اس نے منہ میں انگلیاں ڈال کر الٹی کی جس میں سے جن اور جھینگوں کی بو آ رہی تھی۔ پھر مجھ سے پوچھا، مروں گی تو نہیں؟ اور میرے یقین دلانے پر کہ ہرگز نہیں مرے گی، بستر پر گر کر ایسے سو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔" تھوڑی دیر جھوم کر آدم کرسی پر بیٹھ گیا

یوسف کے جسم کا تناؤ، شاید گھنٹے بھر میں تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ باپ پیتے ہوئے لوگوں کے جھگڑے میں گھر اجاڑ رہا تھا، اس سے زیادہ کوئی اور بات نہیں تھی، اس نے خود کو یقین دلانا چاہا۔ تھوڑی دیر میں لوگ گھر سے شروع ہو جائیں گے اور وہ سہارا دے کر باپ کو گھر لے جائے گا جیسے پہلے بارہا ہو چکا تھا۔ لیکن تب ہی آدم نے جیسے نیند سے چونکتے ہوئے کہا: "ابھی دنوں کی بات ہے ابراہیم اُدھر سے چھٹیوں میں آیا ہوا تھا، میرا مطلب ہے پاکستان سے۔ نوجوان تھا، پانچ سال بعد گھر آیا تھا۔ ادھر ساؤتھ افریقہ سے اُدھر ساؤتھ انڈیا گھر والوں نے ڈاکٹری پڑھنے کو بھیجا تھا۔ وہاں اس نے دو سال ایک کالج میں گزارے۔ بتاتا تھا جس شہر میں تھا وہاں ادھر ساؤتھ کا تو کیا کوئی گجراتی بولنے والا نہیں تھا۔ پھر پاکستان میں ڈھائی پونے تین سال کاٹ کے آیا تھا پر اس کی گجراتی ویسی کی ویسی تھی جیسی ادھر ساؤتھ میں بولتے ہوں گی۔ جیسا گیا تھا ویسا ہی لوٹ کے آیا تھا۔ میرے کو تو لگا کو اس کے چہرے پر کل شباب لگ گیا ہے۔ جب پڑھنے کو ساؤتھ گیا تھا، میرا مطلب ہے ساؤتھ انڈیا، اس وقت بھی میں نے سنا تھا سالے کو اگر مل جائے تو چھوڑتا نہیں تھا۔

پھر اس نے اپنے ہونٹ دباتے ہوئے بدمعاشی کے لہجے میں کہا: "کیا؟

سب نے پوچھا: "کیا؟"

"بائبل!" آدم نے ہنسی اور ایسا قہقہہ لگایا کہ سب کو لگا چھت زمین پر آن پڑے گی۔ یوسف کو پسینا آ گیا۔ عیسیٰ ہنسی سے بےحال ہوتے ہوئے آدم سے کہا: "اور تم نے سچ سمجھا؟ ہے نا یہی بات؟

اس کے آنے کی خبر پورے ساؤتھ میں پھیل گئی، کیپ ٹاؤن سے ڈربن تک سب پر۔ ثوریا دونوں کو بھی سالا اتنا بھی نہیں آیا ہوگا۔ شہر کو آ گیا ہے، اور آیا بھی بیٹھنے کے لیے تھا۔ سالا ڈاکٹر بننے والا تھا۔ وہ اس کا باپ جس نے ساری عمر پیسے والوں کی چیرپھاڑ کر رکھی ہے، ایسے اکڑ اکڑ کر چلتا تھا جیسے شہنشاہ ہو۔ اس کی طرح ہر وقت ہر چیز مرتب کرنے کے لیے تیار رہتا تھا جیسے لڑنے

کو اس کے سالوں نے نہیں خود اُس نے ساؤتھ میرا مطلب ہے ساؤتھ انڈیا اور پاکستان بھیج کر پڑھایا تھا اور پڑھا رہا تھا۔ میرے کو دکھتا تھا جوہانس برگ کے زُو میں ایک اوسٹرِچ جالی کے پاس سر اوپر اٹھائے جانچ رہا ہے کس کے پاس کھلانے کو کیا ہے۔"

کسی نے اُس کے گلاس میں اپنے گلاس کی آدھی وسکی انڈیل دی اور آس پاس کھڑے ہوئے نوجوانوں نے بھی اپنے گلاسوں کی تھوڑی تھوڑی وسکی ڈال کر آدم کے گلاس کو بھر کے منھ تک بھر دیا۔ وہ ہر ایک کو سر جھکا کر تھینک یو کہتا گیا۔ یوسف اپنے باپ کی اس دُبری ذلت کو بے بسی سے دیکھ رہا تھا۔

"خیر اُس اوسٹرچ کا ذکر بیچ میں آ گیا،" آدم نے بڑا سا گھونٹ لے کر کہا۔ "میں کہہ رہا تھا کہ ابراہیم جوہانس برگ میں تھا۔ سگریٹ اس نے اسکول کے زمانے میں پینا شروع کر دیا تھا اور اس پر ڈٹا ہوا تھا۔ نہ کھانسی تھی نہ کھرا۔ میں نے اُسے ساؤتھ میرا مطلب ہے ساؤتھ انڈیا، جانے سے پہلے بہت دھیان سے دیکھا۔ جب بھی اُس کی دو انگلیاں پیلی تھیں۔ اب بھی پیلی نہیں بلکہ تھوڑی سی کالی پڑ گئی تھیں۔ ٹائی کی ناٹ بھی نہیں بدلی تھی، ویسی ہی ایک دم ٹائٹ وِلسن ناٹ! سننے میں یہی آیا جہاں جہاں اِدھر ساؤتھ میں وہ گیا کسی نے یہ نہیں کہا تم پہچان میں نہیں آ رہے ہو۔ سالا دھوئیں اُڑا رہا تھا، ہنسوں ہاتھ لیا جا رہا تھا کیوں کہ آیا ہی پڑھنے کے لیے تھا۔ وہ بھی ٹِپ ٹاپ سے، جیٹ سے نہیں۔ کسی اور کا لڑکا ہوتا جیسے بمبئی، علی گڑھ، ویلور، لاہور یا کراچی پڑھنے کے لیے بھیجا گیا ہوتا تو سال کے سال گھر آتا رہتا ہوائی جہاز سے۔ بے چاری صابرہ بی بی، اُس کی ماں، اس کے غم میں رویا کرتی تھی، پر کیا کرتی، اس کے ہسبنڈ کے ہاتھ میں اتنے بڑے چھید تھے کہ ان میں سے ہاتھی گزر جائے رَینڈ کا کیا ذکر ہے۔ سالا لیچ!

پھر اچانک آدم عیسیٰ قاضی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "سالے نے ہمیشہ مجھ سے پی، کبھی ایک پیگ مجھے آفر نہیں کیا۔ ایک بوند بھی نہیں۔

چند سیکنڈ رونے کے بعد اس نے گلاس کو میز پر ایک چھپاکے کے ساتھ رکھ دیا اور ہنس کر سننے والوں سے بولا: "سالے اوسٹرچ کا ذکر پھر بیچ میں آ گیا۔ میں ابراہیم کی بات کر رہا تھا۔ ایک پارٹی میں وہ میرے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا، تم وہاں ساؤتھ کو مس کرتے ہو؟ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گولڈ فلیک کے ڈبے سے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے کہا، میں صرف اسے مس کرتا ہوں۔ میں نے کہا، کیوں؟ اس نے کہا، ایسا سگریٹ وہاں نہیں ہوتا۔ پھر اُس نے سگریٹ کا پیکٹ میری طرف بڑھایا۔ پھر پتا نہیں کیسے پروگرام بن گیا۔ کا ہے کا؟"

لوگوں کے خاموش رہنے پر خود ہی بولا: "شراب کا۔ مجھے کیا خبر تھی آگے کیا ہونا ہے۔ آگے کا حال بس اللہ جانتا ہے، اس لیے آدمی بے قصور ہے۔"

Scanned with CamScanner

سب نے کہا: "شیور! شیور!"

"تم بالکل معصوم تھے ہم جانتے ہیں،" کسی نے کہا۔

"پروگرام شاید اُسی لڑکی کے گھر بنا تھا جس نے بائیڈروجن پراوکسائیڈ پی لیا تھا اور جو دو ایک دفعہ میرے گھر بھی آ چکی تھی۔ اب میرے کو کیا پتا تھا سالا میرا داماد بننے کو جا رہا تھا۔ And the girl was real appetising! اُسے بھی اُس سے ملا دیا۔ یاد نہیں اس کا نام کیا تھا، گریس یا مارتھا۔ ہم دو تین آدمی تھے وہاں۔ سب پی رہے تھے۔ وہ عمر میں سب سے چھوٹا تھا پن پینے میں کسی سے کم نہیں تھا اور سالے کا ہاتھ پینے میں ڈگمگاتا بھی نہیں تھا۔ آخری گھونٹ تک گلاس کو یوں پکڑے تھا جیسے پہلا گلاس ہو۔" کسی نے بعد میں پوچھا، how did he fare, Mary? سالی بہت پی گئی تھی۔ ابراہیم کی گود میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی: He gets full marks! اس کے بوجھ سے ابراہیم گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور شاید اس کے اٹھنے میں وسکی کی باٹلی لٹ گئی۔ ہم سب نے اپنے اپنے منھ میز کے بورڈ پر لا دیے اور آخری قطرہ تک پی گئے۔ پھر ہم میں سے دو ایک نے میز پر لگی ہوئی وسکی کو زبان سے چاٹا اور کتوں کی طرح بھونکنے لگے۔

اب آدم قاضی کی زبان اور جسم لڑکھڑا رہے تھے۔ یوسف کے آس پاس کھڑے ہوئے نوجوان اور ادھیڑ عمر والے بے وجہ بار بار اس پر ایک نظر ڈالتے تھے اور ادھر اُدھر دیکھنے لگتے تھے۔ یوسف کی سمجھ میں اس کا ساتھ کب کا چھوڑ چکی تھی جو وہ فیصلہ کرتا کہ کیا کرے۔ یہاں سے باپ کو نکال لے جانے کا خیال کب کا گر چکا تھا۔ اُسے خود پر غصہ آ رہا تھا کیوں حقیقت جاننے کے لیے وہ وہاں خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا۔ اس لے سے پہلے اس کی کمیونٹی میں صرف اس کا باپ ننگا تھا، اب پورا گھر ننگا ہو چکا تھا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ٹوٹتے ہوئے لہجے میں آدم نے ٹھہر ٹھہر کر کہا: "چار دن پہلے میرے سے یوسف کی ممی نے پوچھا، ابراہیم کیسا لڑکا ہے؟ میں نے کہا، فرسٹ کلاس! میرے کو کیا پتا تھا سالا میرا داماد بننے کو جا رہا تھا۔ آدمی بے قصور ہے۔" وہ پھر رونے لگا۔

کسی نے اس کے گلاس کو جو تین چوتھائی بھرا ہوا تھا منھ سے لگاتے ہوئے کہا: "اس وقت تمہیں چند گھونٹ جو کے پانی کی ضرورت ہے۔ حلق تر رکھو۔"

آدم قاضی نے ہوش میں آتے ہوئے قدرے جوش سے کہا: "میرے کو حفصہ کے ابراہیم کی بیوی بننے پر اعتراض نہیں تھا۔ اعتراض تھا تو اس شترمرغ پر جس نے ہمیشہ مجھ سے پی ہے کبھی ایک گھونٹ مجھے نہیں پلایا۔ سالا یہودی! میری بیٹی اور اس یہودی کی بہو بنے، میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

میز کے چھٹ جانے پر آدم عیسیٰ قاضی اپنی کرسی پر بیٹھا رہ گیا۔ اس کا سر میز پر ٹکا ہوا تھا

اور وہ زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ جو چند بوڑھے اس سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھے رہ گئے تھے اور جنھوں نے اتنی نہیں چڑھائی تھی جتنی آدم نے، اُن میں سے ایک نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "قرآن میں ہے، اور یہ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے، اللہ کہتا ہے اس نے انسان کو کمزور بنایا ہے۔" دوسرے بوڑھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

یوسف نے اطراف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ اپنے باپ کی طرف بڑھا اور اُسے گھر چلنے کے لیے اٹھانے لگا۔ اس کام میں پیچھے رہ جانے والے دو ایک نوجوانوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن یوسف نے انھیں جھڑک دیا۔

تمھیں لوگوں نے اس کی یہ حالت کی ہے،" اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

ہم نے؟ ہم نے تو اسے ہمیشہ سے اسی حال میں دیکھا ہے،" ان میں سے ایک نے کہا۔

لڑکھڑاتے ہوئے پیروں پر کھڑے ہوتے ہوئے آدم عیسیٰ قاصی نے کہا: "میں سچ کہتا ہوں، میں اسی غم میں پیتا ہوں کہ میری اکلوتی بیٹی اس سامنے بیٹھے یہودی شتر مرغ کے گھر میں گئی ہے۔ صابرہ بہین سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہے، اس کا بیٹا ابراہیم بھی ٹھیک ہے۔"

■■■

س واقعے کا کمیونٹی پر جو اثر ہونا تھا وہ ہوا۔

پہلی رات آدم کو گھر لا کر اور اُسے اُس کے بیڈ پر ڈال کر یوسف دیر تک اپنے کمرے میں سر پکڑے بیٹھا رہا، اور جب عائشہ اور سارہ نے آ کر پوچھا: "کیا ہوا؟ پپا نے پی زیادہ لی ہے اس لیے روتا ہے؟" تو وہ اوندھے منھ لیٹ کر تکیے میں سر دھنسا کر روتا رہا۔ سارہ نے اس کے بالوں میں انگلیوں کو چلاتے ہوئے کہا: "کیا ہوا؟ اپنی ممی کو نہیں بتائے گا؟ پپا نے پی کر کسی سے جھگڑا کیا؟ بکو اس کی جو مجھے سننی پڑی؟"

یوسف نے بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا: "صبح تک سب پتا چل جائے گا۔"

"کیا؟" سارہ نے کہا۔

"جو سارے شہر کو پتا چل جائے گا۔"

اُسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف حفصہ تھی۔ وہ بہت خوش تھی کیوں کہ اس کے بیٹے نے شام سے انڈین پکچروں ایکٹرسوں کے ڈائلاگ الٹے سیدھے بول بول کر سارے گھر کو ہنسا ہنسا مارا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی: "ممی، آپ لوگ ہوتے تو دیکھتے۔ اتنا زبردست اور بزدوشن ہے اس کا! کبھی وہ بڑھیا ماں بن کر شرابی بیٹے کو مارنے کو لپکتا تھا، کبھی تلوار چلاتا تھا، کبھی کہتا تھا، نکالو پیسے!"

Scanned with CamScanner

پھر حفصہ نے محسوس کیا دوسری طرف اس کی ماں خاموش سی ہے جیسے اُسے اپنے نواسے کے ان کارناموں میں دل چسپی نہ ہو، یا ہو سکتا ہے بیمار ہو۔ اس نے پوچھا: "می، آپ ٹھیک تو ہو نا؟"

سارہ نے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا: "کچھ نہیں، پپا کی وجہ سے یوسف پریشان ہے اور اپنے کمرے میں بیٹھا رو رہا ہے۔"

"میں جانتی ہوں اُس کے دل کو، آخر کو میرا بھائی ہے۔ ضرور اُسے کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ اُسے فون پر بلائیے۔ وہ مجھے بتا دے گا کیا بات ہے۔ آج تک ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں چھپائی۔"

"اچھا، کوشش کرتی ہوں۔" سارہ نے ریسیور کو میز پر رکھنے سے پہلے کہا۔ حفصہ دیر تک اپنے ریسیور کو پکڑے کھڑی رہی۔ پھر دوسری طرف سے عائشہ کی آواز آئی۔

"نہیں، وہ نہیں آ سکتے۔"

رات گئے جب ابراہیم گھر آیا تو حفصہ نے اس سے می کے گھر چلنے کو کہا۔ "وہاں ضرور کچھ پریشانی کی بات ہوئی ہے۔"

ابراہیم نے اس کی بات کو اہمیت نہ دیتے ہوئے کہا: "ہونا کیا ہے، پپا پی زیادہ گئے ہوں گے۔ کہیں توڑ پھوڑ کی ہو گی اور پکڑے گئے ہوں گے، یا گھر آ کر اُدھم دھاڑ مچائی ہو گی۔ میں انہیں جانتا ہوں۔"

بالآخر وہ بسا کچھ کھانے حفصہ کے ساتھ آدم عیسیٰ قاضی کے گھر جانے کو راضی ہو گیا۔ بچے کو اس کی دادی کے کمرے میں لٹا کر وہ دونوں گھر سے نکلے۔ راستے بھر حفصہ آیت الکرسی پڑھتی رہی اور ابراہیم انڈین فلموں کے گانے گاتا رہا۔ ان کے گھر میں آنے کا سن کر یوسف نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔

حفصہ دروازے پر کھڑی اس کی منتیں کرتی رہی۔ 'دروازہ کھولو۔ مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔' یوسف کی خاموشی سے ڈرتے ہوئے اُسے خیال آیا کہیں خود کو پھانسی نہ دے لے۔ اس نے ابراہیم کو آواز دی جو نشے میں چُور بیڈ پر پڑے ہوئے آدم عیسیٰ قاضی کو دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے چڑ کر کہا: "دروازہ کھولو ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔"

اندر سے یوسف کی آواز آئی: "نہیں، تو گھر چلی جا۔"

ابراہیم نے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کہا: "یوسف دروازہ کھولو۔ کیا مذاق ہے؟ پپا تم جیسے سو دیکھے ہوئے ہیں، صرف پی زیادہ گئے ہیں، مرے نہیں ہیں جو تم کمرہ بند کر کے رو رہے ہو۔"

اندر سے یوسف نے زندگی میں پہلی بار ابراہیم کو گھور کر کہا: "نکل جاؤ اس گھر سے۔ میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔" اس کی آواز میں ایسی درشتی تھی کہ ابراہیم اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

سارہ ابراہیم کو یوسف کے کمرے سے پرے لے گئی اور معافی مانگنے والے لہجے میں بولی:

'بیٹا، بُرا مت ماننا۔ وہ اس وقت ہوش میں نہیں ہے۔'

ابراہیم کی ساری بشاشت جو اُس وقت تک اس کے چہرے پر رہی تھی جب وہ دنیا سے غافل آدم کو دیکھ رہا تھا، کب کی غائب ہو چکی تھی۔ کرسی پر بیٹھ کر اس نے رومال سے اپنے چہرے کو کئی بار پونچھا، پھر سگریٹ نکال کر پینے لگا۔

آخری بات جو یوسف نے دروازے کے باہر کھڑی ہوئی تینوں عورتوں سے کہی وہ یہ تھی: "میں سچ کہتا ہوں میرا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ تم لوگ خوش قسمت ہو کہ آج کی رات سوسائٹی میں سر اٹھا کر چل سکتے ہو۔ جس کے گھر چاہو جاؤ۔ چاہو تو آپ لوگ سو بھی سکتے ہو۔ میں ٹھیک ہوں، صرف سو نہیں سکوں گا۔"

حفصہ نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا: 'بھائی، ہم دروازہ توڑیں۔'

یوسف نے کہا: "اگر ایسا کیا تو تم مجھے مُردہ دیکھو گی۔ میں نے وعدہ کیا نا میرا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔"

حفصہ روتی ہوئی ماں سے اس طرح جدا ہوئی جیسے اُس کی جدائی آج ہو رہی ہو۔ راستے بھر وہ دعا میں پڑھتی رہی اور اپنی سیٹ پر ابراہیم کاٹھ کے الّو کی طرح بیٹھا رہا۔

حفصہ کے جانے کے بعد یوسف نے دروازہ کھول دیا۔ سارہ اور عائشہ اس کے سامنے بیٹھی روتی رہیں۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ آخر میں اس نے ہمت کر کے سارہ سے کہا: 'ممی، اگر میرے پاس گن ہوتی تو آج میں ان دونوں کا خون کر دیتا۔'

'کن دونوں کا؟' عائشہ اور سارہ نے ایک ساتھ پوچھا۔

"پپا اور ابراہیم کا۔"

دونوں عورتوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔ یوسف کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ تھوڑی دیر اس کے پاس بیٹھی سارہ اسے تھپکیاں دیتی رہی۔ پھر اس نے سر سے عائشہ کو یوسف کے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود روتی ہوئی باہر چلی گئی۔

عائشہ دروازہ بند کر کے یوسف کے پاس آئی۔

صبح کے قریب جذبات کی شدت سے تھک کر دونوں کو نیند آئی ہی تھی کہ ساتھ والے کمرے میں آدم عیسیٰ قاضی کے زور زور سے بولنے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا:

میرے کو انڈا چاہیے۔ تیرے کو بولا نا، میرے کو انڈا چاہیے۔ اور ایک نہیں، دو۔ اوملیٹ چاہیے۔"

یوسف کھانے کے کمرے کی طرف لپکا لیکن عائشہ نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور اس کے ساتھ ساتھ زمین پر گھسٹتی ہوئی کھانے کے کمرے تک پہنچی جہاں آدم خالی پلیٹ پر کانٹے اور چھری سے کوئی دھن بجا رہا تھا۔

"کیوں بچے ڈر گیا؟" اس نے یوسف سے پیار سے کہا۔

"رات کیا ہوا تھا؟" یوسف نے خوں خوار نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرے کو کیا معلوم۔"

"ابراہیم کی شادی سے پہلے کیا ہوا تھا؟" یوسف نے دانت چباتے ہوئے کہا۔

"کوئی رسم وسم ہوئی ہووے گی۔"

"رسم؟ مارتھا کون تھی؟"

"کون مارتھا؟" آدم نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔

"مارتھا، میری، انجیلینا، یا وہ حرامزادی جو بھی تھی۔"

"جن کون؟" آدم نے معصومیت سے پوچھا۔

"جو بیڈروم میں پر وکسی بیڈ لی گئی تھی۔"

آدم سٹ پٹا گیا۔ پھر اس نے اسی معصومیت سے پوچھا: "کیا میں رات نشے میں کچھ بک گیا تھا؟"

"کچھ بک گیا تھا؟ کچھ؟" یوسف نے کرسی کو اٹھا کر فرش پر پٹختے ہوئے کہا۔

پھر رک رک کر آدم نے سر جھکائے جھکائے رات والا جملہ دہرایا: "مجھے کیا خبر تھی آگے کیا ہونا ہے۔ آگے کا حال بس اللہ جانتا ہے۔ آدمی بے قصور ہے۔"

اس سے آگے اپنے باپ سے بات کرنے کا یوسف کو یارا نہ تھا۔

کئی دن تک عائشہ اور سارہ گھر سے نہیں نکلیں۔ دل کڑا کر کے یوسف کام پر جاتا رہا۔ پہلے اگر وہ خود کو ریشم کے کیڑے کی طرح ریشم کے کوئے میں بند محسوس کرتا تھا تو اب اس نے خود کو لوہے کے خول میں بند کر لیا تھا جس میں سے باہر کی کوئی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ آدم نے دو شبیں بڑی مشکل سے گھر میں چپ چاپ کاٹیں اور تیسرے روز گھر سے کسی پالنے والے کی تلاش میں نکل پڑا۔

حفصہ نے ماں سے فون پر کہا کہ وہ ابراہیم سے طلاق مانگ رہی ہے لیکن ابراہیم اس کے

لیے تیار نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں آپ کے گھر میں لوٹ کر آ سکتی ہوں۔ میں اور بیٹیوں جیسی نہیں ہوں نا جنھیں ڈیوورس کے بعد میکے میں پناہ مل جاتی ہے۔"

"تو ٹھیک کہتی ہے بیٹی،' سارہ نے کہا، 'پر طلاق کی بات مت کر۔'

میرے لیے کوئی تیسرا گھر نہیں ہے ممی، کہاں جاؤں؟ مجھے لگتا ہے... مجھے لگتا ہے جیسے پپا میرے ہسبنڈ ہیں اور ابراہیم میرا باپ۔ میں اس خیال کو کیسے اپنے دماغ سے نکالوں۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟"

ابراہیم نے ہر پوچھنے والے کے سوال کا ایک ہی جواب دیا: 'اس مرض کو ایلکوہولک ڈیمنشیا (alcoholic dementia) کہتے ہیں۔ بڈھا کنفیوزڈ ہے۔ تم نے دیکھی اس رات کی بات اسے یاد تک نہیں۔ یاد ہوتی تو سوسائٹی میں چل پھر نہیں رہا ہوتا، شرم سے سر جھکائے گھر میں بیٹھا ہوتا۔ He confabulates, that's all!'

پھر اپنے دل کی وسعت دکھانے کو وہ ہر ایک سے کہتا تھا: "یہ سب کچھ ہوا پر میں اسے ابھی تک پپا کہتا ہوں۔" لیکن لوگ اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھتے تھے۔

حفصہ کا زیادہ تر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا۔ ابراہیم دوسرے کمرے میں سوتا تھا۔ سارہ گر کبھی حفصہ کے گھر جاتی بھی تھی تو ایسے وقت جب ابراہیم گھر پر نہ ہو۔ حفصہ ایک دفعہ بھی ماں کے گھر نہیں آئی۔ اس نے ابراہیم کے ساتھ رہنے کی ایک ہی شرط لگا رکھی تھی کہ کسی اور ملک میں چل کر رہنے کو تیار ہو جہاں رہ کر اس کا تعلق ساؤتھ والوں سے نہ رہے اور یہ کہ دوسرا بچہ جو اس کے پیٹ میں تھا آخری بچہ ہوگا۔

آخرش، ابراہیم کو اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پڑے۔ طلاق کی صورت میں اسے کون اپنی بیٹی دیتا۔ اس کی پریکٹس فیل ہو چکی تھی اور جو لوگ اس سے پہلے بڑے تپاک سے ملتے تھے اب ایسے ملتے تھے جیسے وہ دنیا کا سب سے بڑا مجرم ہو۔

ایک دن اس نے حفصہ کے کمرے میں آ کر خبر سنانے کے انداز میں کہا: "ہم سانتیا گو چلی، جا رہے ہیں۔ ساؤتھ امیریکا۔ وہاں میرے ایک دو کارآمد تعلقات ہیں۔"

حفصہ خاموشی سے سپاٹ سے کھیلتی رہی۔

ابراہیم نے اس کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا: "ہم تم شادی سے پہلے ایک دوسرے کو نہ جاننے کے برابر جانتے ہوں گے۔ ہماری مشترکہ زندگی تو شادی کے بعد شروع ہوئی ہے۔ بس زندگی کے اسی حصے سے اگر ہم سروکار رکھیں تو یہ ہمارے بچوں کے لیے، ہمارے لیے، اچھا نہ ہوگا؟"

حفصہ پھر بھی خاموش رہی۔

ابراہیم نے باہر جانے سے پہلے اُسے منانے کے لیے کہا: "میں تو دوسرے اپارتھیڈ (apartheid) کا شکار ہو گیا ہوں۔ ایک افریقانر نیشنلسٹ پارٹی کی لائی ہوئی دوسری ایشینز کی۔ نہ گوروں سے مل سکتا ہوں نہ انڈینز سے۔ اور ہاں، ایک تیسری اپارتھیڈ بھی ہے، تمہاری لائی ہوئی۔ گھر میں بھی علاقے بٹ گئے ہیں۔ تمہارا، ممی کا اور طارق کا علاقہ ایک ہے اور مجھ کالے کا ایک۔"

حفصہ ضبط کرنے کے باوجود ہنس پڑی۔

ابراہیم نے اپنی کامیابی پر مسرور ہوتے ہوئے کہا: "کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ تم تینوں گوروں کا ایک بہت بڑی کرال (kraal) پر تسلط ہے اور اس سے دور، بہت دور، جہاں پر تمہارا کرال ختم ہوتا ہے، ایک جھونپڑی میں یہ کالا رہتا ہے۔"

"اور پاپا؟" حفصہ نے کہا۔

"He does not exist. اس کا تو ایک بھوت ہے جو پوری کرال میں ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔"

حفصہ کے چہرے سے ہنسی کا تبسم مٹ گیا۔ اس نے محسوس کیا وہ بھی ابراہیم دوہری تہری اپارتھیڈ کا شکار ہے۔

رخصتی سے پہلے سارہ، عائشہ اور یوسف ان سے ملنے آئے۔ آدم عیسیٰ قاسمی کو سارہ نے حفصہ سے ملنے سے منع کر دیا تھا، اور آئے بھی وہ اس وقت جب ابراہیم گھر پر تھا نہ ان کا باپ احمد بھائی پٹیل۔

چاروں عورتیں روتی رہیں۔ سارہ اور صابرہ بی بی ایک دوسرے سے آنکھ ملانے سے کترا رہی تھیں جیسے اپنی اپنی جگہ پر دونوں خود کو بچوں سے جدائی کا ذمہ دار سمجھ رہی ہوں۔ سارہ سمجھ رہی تھی سارا قصور اس کے شوہر کا ہے اور صابرہ بی بی کے دل میں چور تھا کہ اگر اس کے بیٹے سے یہ حرکت سرزد نہ ہوئی ہوتی تو آج سارہ کو اپنی بیٹی سے عمر بھر کی جدائی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اس واقعے کے بعد سے دونوں آج پہلی بار ایک دوسرے سے ملی تھیں۔

پھر اچانک کہیں سے احمد بھائی پٹیل چھڑی سے خود کو ٹیکتے ہوئے آ پہنچے اور آتے ہی انہوں نے بڑی خوشی اور جوش سے کہا: "سارہ سنتی، سمجھو؟" اور پھر اس کا جواب سنے بغیر بولنا شروع کر دیا۔ "محمد بھی ہمارے ملک کو چھوڑ رہا ہے، اور بیوی بچے کو بھی لے جا رہا ہے۔ میرا اچھا ہے کہ وہاں اسے کوئی اچھی نوکری ملی ہے۔ ادھر ساؤتھ میں جینے کا چارہ نہیں ہے۔ آج افریقن نیشنل کانگریس کا قبضہ ہے، کل یونائیٹڈ پارٹی کا۔ میرے کو لگتا ہے یہ باسٹرڈ کالے اپن کو جینے نہیں دیں گے۔ کبھی زندگی محنت کر کرکے ہمارے لوگوں کے پاس پیسہ آ گیا ہے تو ان کالوں کو جلن آتی ہے۔

ابراہیم، حفصہ اور طارق جاویں تو میں بھی ایک دن ان کے پاس چلا جاؤں گا۔'

چاروں عورتیں خاموش بیٹھی اس کی شکل دیکھتی رہیں۔

پھر وہ بولا: "بہین، تیرے کو داماد اچھا ملا، ہمارے کو بہو اچھی ملی۔ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔"

سانتیاگو پہنچنے کے بعد سارہ کا خط آیا جس میں یوسف اور عائشہ کو بہت بہت پوچھا تھا، اور لکھا تھا: 'میں یہاں بہت خوش ہوں۔ ہمیں کوئی نہیں جانتا۔'

خط میں نہ ابراہیم کا ذکر تھا، نہ پپا کے لیے کوئی لفظ، اور خط پر کوئی پتا بھی نہیں تھا۔

***

آدم عیسیٰ قاضی کے دفن سے پہلے یوسف جوہانس برگ پہنچ گیا۔ ماں اور بیوی سے چھوٹے ہوئے اُسے دو سال ہو چکے تھے۔ قبر پر آخری فاتحہ کے وقت وہ اس کے سرہانے گم متھوڑا کھڑا تھا۔ کسی نے اس کے ہاتھ دعا میں شرکت کے لیے اوپر اٹھا دیے اور وہ انھیں اوروں کے منھ پر ہاتھ پھیرنے کے بعد بھی اٹھائے رہا۔ پھر کسی نے اس کے پہلو میں کہنی ماری تو اس نے چونک کر دونوں ہاتھوں کو منھ پر پھیر کر نیچے کر لیا۔

واپسی پر کتنے ہی لوگوں نے پوچھا: 'ابراہیم نہیں آیا؟ حفصہ کو باپ کے مرنے کا تار تو دے دیا تھا نا؟ ہو سکتا ہے بے چاری کو ابھی تک خبر ہی نہ ہوئی ہو کہ بے چارہ آدم بھائی چل بسا۔ اچھا آدمی تھا۔"

کسی نے کہا: "اب تو سننے میں آیا ہے کہ پڑھنا بھی چھوڑ چکا تھا اور اس کا ارادہ حج پڑھنے جانے کا تھا۔"

ایک آدمی نے کہا: 'میرے کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اندر سے اتنا بیمار ہے۔ اب کون سا مہینا ہے؟ جولائی؟ اسی اپریل ٹیکسی میں تو میرے کو ملا تھا۔ نو اپریل کو پرائم منسٹر ہینڈرک فیروورڈ (Hendrik Verwoerd) پر کسی نے گولی چلائی تھی۔ دس کو وہ مجھے ملا تھا۔ بہت خوش تھا کہ کسی نے تو اتنی ہمت کی۔"

ایک اور آدمی نے کہا: 'میرے کو بھی کسی دن ملا تھا۔ کہہ رہا تھا یہ کالے، کلرڈ اور انڈین سب بزدل ہیں۔ بس ایفریکانیرز سے نفرت کرنی جانتے ہیں۔ ہمت کی تو ایک گورے کسان نے۔"

پہلے آدمی نے کہا: "لیکن وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ اس گورے کسان کو سزا ملنی چاہیے۔ اس کا نشانہ اتنا برا کیوں تھا کہ سالا فیروورڈ بچ گیا۔ یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا رہا تھا

گھر واپس آ کر یوسف ماں اور بیوی کے سامنے خاموش بیٹھ گیا۔ کل سے اب تک سب کچھ اتنی عجلت میں ہوا تھا کہ اُسے سانس لینے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

اس نے ماں سے پوچھا: 'حفصہ تو خیریت سے ہے نا؟'

'پہلے چار چھ مہینے میں خط آ جاتا تھا۔ اب بھی آ جاتا ہے۔ دونوں بچے ٹھیک ہیں۔'

'اسے پپا کے مرنے کی خبر کیسے ملے گی؟' یوسف نے فکر بھرے لہجے میں کہا۔

'اُس کے لیے تو وہ کب کے مر چکے تھے۔ خط میں ان کا ذکر ہی نہیں ہوتا ہے۔'

رات کو جب یوسف اور عائشہ سونے کے لیے بیٹھے تو عائشہ نے کہا: "اب آپ ساؤتھ لوٹ آئیے۔"

یوسف نے کہا: "یہاں بڑی گھٹن ہے۔"

عائشہ نے کہا: 'ہم لوگ جوہرٹ چھوڑ دیں گے۔ اتنا بڑا ملک ہے، کہیں اور سہی۔'

یوسف نے کہا: 'اب میرے پاؤں پاکستان میں جمنے لگے ہیں تو تم کھینچتی ہو یہاں، اس گھٹن کی دنیا میں واپس آ جاؤں جہاں سب کو میرا ایک ہی نام یاد ہے کہ بے چارے کا باپ رنگیلا ہے۔' یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو نکل آئے۔

عائشہ نے جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا: 'آپ کے جانے کے بعد حقیقت میں پپا بدل گئے تھے۔ انھوں نے ہنسی بھی چھوڑ دی تھی اور نماز پڑھنے لگے تھے۔'

'کیا سچ؟' یوسف نے کہا۔ اس کے دماغ میں قبرستان سے واپسی پر سنی ہوئی باتیں گونجنے لگیں۔

'سچ۔' عائشہ نے کہا۔

'قسم کھاؤ۔'

دل میں خدا سے معافی مانگتے ہوئے عائشہ نے کہا: 'اللہ کی قسم۔' اُسے یقین تھا اپنے باپ کے بارے میں وہ کوئی بات یہاں کسی سے نہیں کرے گا۔ اپنے اس چھالے کو وہ سوسائٹی میں سنبھال کر چلتا تھا کہ کسی کی رگڑ سے پھوٹ نہ جائے۔

یوسف نے ٹھنڈا سانس چھوڑتے ہوئے کہا: 'اللہ مغفرت کرے۔ میں سائتھ کو کے لیڈنگ نیوز پیپر میں پپا کی obituary چھپواؤں گا تاکہ حفصہ بھی ان کی مغفرت کی دعا کرے اور فاتحہ دلائے۔'

دونوں خاموش ایک دوسرے کے پہلو میں لیٹے رہے۔

دفعتاً عائشہ نے ہمت کرتے ہوئے کہا: "جو نئے بچے پیدا نہ ہونے کی قسم کب تک کی ہے؟ اب تو ہو جانا چاہیے۔ میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ ممی بھی۔"

Scanned with CamScanner

یوسف کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"میں تم دونوں کو کراچی بلالوں گا۔ پھر اکیلا نہیں لگے گا۔"

"صرف اس سے کام نہیں چلے گا۔ گھر میں کوئی چوتھا آدمی بھی ہونا چاہیے، اور اب تو پپا بھی نہیں رہے۔"

کوئی اور موقع ہوتا تو یہ آخری فقرہ یوسف کی ساری خوشی غائب کر دیتا، لیکن اس کے دماغ میں باپ کا نیا روپ اُبھرا۔ ایک نمازی پرہیز گار آدمی کا، جو حج پڑھنے جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور واپسی پر شاید اس کے پاس کراچی ٹھہرتا ہوا جوہانس برگ کو لوٹتا۔

اگلی صبح جب یوسف ابھی غافل سو رہا تھا، عائشہ دبے پیر اپنے کمرے سے نکل کر سارہ کے کمرے میں گئی جو شاید ابھی ابھی فجر کی نماز پڑھ کر لیٹی تھی اور جاگ رہی تھی۔

سارہ نے عائشہ سے پوچھا، "کیا ہے بیٹی؟"

ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے عائشہ نے سرگوشی میں اس سے کہا: "ممی، اُس بیفہ من والی بات کو زبان پر مت لانا۔ میں نے یوسف سے قسم کھا کر کہا ہے پپا پینی چھوڑ چکے تھے، اور اس نے یقین کر لیا ہے۔"

سارہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے کھڑی ہوئی عائشہ کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

تھوڑی دیر بعد عائشہ نے سارہ کے سینے سے اپنے سر کو اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "ممی، میرے کو جھوٹی قسم کھانے کا کفارہ دینا پڑے گا۔ ہے نا؟ نہیں تو کوئی اور مصیبت یا آزمائش ہم پر نہ آن پڑے۔ میں ڈر رہی ہوں۔"

**

سیّد محمد اشرف

آدمی

کھڑکی کے نیچے سمیں گرتی ہوئی دیکھتا رہا۔ پھر یکایک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑ کر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز سے پاس کرسی پہ ٹک کر دھیمے سے بولا:

آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔

سرور نے سنبھل کر اسے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ تم نے تو دو ہی دن دیکھے ہیں نا!

میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے۔ کھولوں تو ان کو اور زیادہ کر رہا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب وہیں آ رہے ہوں۔ سرور اداس چپ ہو گیا

پھر ایک لمحے کے بعد بولا:

آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا، کہ پھر یہ لوگ---

میں نے تمہیں ان کا وجود بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل سی حالت ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا۔

سرور نے بہت ہمدردی نظروں سے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔

دونوں کی بہت سی یادیں ایک سی تھیں۔

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی سے حافظ جی کے گھر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ سرور کا گھر ایک بڑے

Scanned with CamScanner

دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر پنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول مٹا کر ایک لیمپ نما بطخ بنا کر اس کی ربڑ واپس کر دی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام معلوم ہوا تھا۔

"سید انوار علی!"

"حاضر جناب!"

سرفراز دھیرے سے بولا: "سید انوار علی۔"

"حاضر جناب۔ تمھیں اسکول یاد آرہا ہوگا۔"

"ہاں۔ تمھیں کیسے معلوم؟"

"یار تم سب ہی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماساب کے علاوہ اور کون جانتا تھا۔"

سرفراز یہ سن کر مسکرایا۔ حالاں کہ کڑوا جملہ اسے برا لگا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ میرے بچپن کا یہ دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساسِ کمتری پہ قابو پانے کے لیے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہییں۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل، سنسان باغوں اور خاموش کھیتوں میں سے ہو کر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں، بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور سست چال سے، بستے کندھے پر ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہما سہما، دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا۔ انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا کبھی نہیں ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیوں کہ تالاب کے بعد سڑک مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

"تم ڈرو مت سرفراز۔ نہر کی پٹری پار کرو گے تو باغ میں داخل ہوتے ہی کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا۔"

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر ظاہر نہ ہو، چہرے پر بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا:

Scanned with CamScanner

نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے۔ اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں۔ یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آ جاتی تھیں۔ نہر کی پٹری پر مڑنے سے پہلے بھی سڑک پر اکادکا آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جاتے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹری پہ مڑتے ہی بالکل سناٹا ہو جاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا یا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سناٹے کو اور ڈراونا بنا دیتی۔ وہ قل ہو اللہ پڑھنا شروع کر دیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اول کلمہ طیب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں گھرے ہوئے اس باغ میں اس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا کیوں کہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ گولر کے درخت کے نیچے سے ہو کر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس والی مینڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے منارے اور مندر کے کلس نظر آنے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا۔ ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آ جاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جا رہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر سرفراز باغ ہی میں فلمی گانا شروع کر دیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھتا۔

"رام رام بیٹا! پٹواری صاحب کے بھانجے ہو؟ انہیں ہماری رام رام بولنا۔"

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر پاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ بھروسہ نہ ہوتا تو وہ رو پیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جا چکا ہوتا۔

لیکن آدمی روز نہیں ملتا تھا۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہو گئی۔ وہ گراؤنڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہو کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آنچ دھیمے میں ہی زرد ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔ نہر کی پٹڑی پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہو گا۔ اس نے ماتھے کا پسینا پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے سے گزرا۔ درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت سے اتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کا حلق بند ہو رہا ہے۔ وہ سہما سہما دھیمے دھیمے قدموں سے آگے بڑھا۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔ اسے لگا جیسے جنات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ ایک بڑا بندر تھا جو چلتے چلتے اچانک رک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خُرخُر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جنات بابا کے مقابلے میں کم۔ اس نے بستا بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ آج آگے کا راستا بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔ آگے سنسان باغ تھا جس میں اب آدمی کے ہونے کی اسے کوئی امید نہیں تھی، اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آوازمیں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بڑھا۔ بوڑھے قبری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی:

"آج بہت دیر کی بیٹا!"

ارے! آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماسٹر صاحب نے مائی کاؤ لکھنے پر سے وری گڈ دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا، اس کا چاوڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا، دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا ہو کر لگا۔

"آدمی سلام،" وہ چہک کر بولا۔

جیتے رہو بیٹا۔ پٹواری صاحب کو ہماری رام رام بولنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آ کر کھانا کھا کے دالان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انہیں بندر والا قصہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ

Scanned with CamScanner

راستے میں واپسی کے لیے اسے کیسی جوکھم اٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہو کہ دلی ہاں کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے الٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا، اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو دادا سے بھی چھوٹا لگتا ہے، ابھی نہیں مرے گا۔

سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں۔ اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔"

سرفراز کو یہ سن کر سخت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے مگر کھلی آواز میں انور کو بتایا کہ سرکاری ملازمت خصوصاً ذمے داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ پھر اسے عائشہ کی یاد آئی جسے اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی اتنی بڑی ہو گئی۔

شادی کب ہے؟

"پرسوں بارات آئے گی۔"

ارے! ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے؟ تم نے دیکھا نہیں کیسے دیوانے ہو رہے ہیں سب۔ لال بھبھوکا چہرے لیے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے۔۔۔

انور اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

میں نے بھی خالہ سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے کا وقت نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔ خود ہمیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔ مگر خالہ کی بھی مجبوری ہے۔ خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے جو دس دن بعد دوبئی چلا جائے گا۔ خالو بھی اب بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ نہیں تو آج ہی جانا ہو گا سرفراز۔ امی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو۔

کیا تم نے خبر نہیں پڑھا تھا؟ پرسوں ریل گاڑی سے اتار کر۔۔۔ وہ چپ ہو گیا۔ انور بھی خاموش ہو گیا۔ پھر بولا:

اچھا تو بھابھی اور بچوں کو یہیں رہنے دو۔'

'ہاں، ان لوگوں کو نہیں لے جا پاؤں گا۔'

گیارہ بجے ہیں۔ اگر ہم دونوں ابھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک وہاں پہنچ

جائیں گے۔"

"ہاں۔ تقریباً ڈھائی تین سو کلومیٹر کا سفر ہے۔"

راستے میں نہر کے پل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آ کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیوں کہ بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سامنے پل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آ رہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ سرفراز نے آیت الکرسی یاد کی۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا۔ اس سے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا:

"کھلے عام سڑک پر اکادکا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اکادکا آدمیوں سے نپٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعے کو جب احمد نہر کی پٹڑی سے گاؤں کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے۔۔۔"

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔ انوار بتاتا رہا:

"اگر پورا جلوس اکادکا آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہو گی۔ ویسے اِس طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔" اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹڑی پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ سرفراز کو بچپن یاد آ گیا۔ تب اُسے یہ خاموش نہر، سنسان پٹڑی اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگتے تھے۔

اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈلائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی بندر نے پہلو بدلا تو پھڑپھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا، پہلے اس پھڑپھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

"تو یہ احمد دکان دار والا معاملہ کب ہوا؟"

"آج چار دن ہوئے۔"

Scanned with CamScanner

ارے! سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیئرنگ وہیل پر نم ہو گئیں۔

کیا ہوا؟ انور نے پوچھا۔ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

نہیں کچھ نہیں۔ ابھی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ کچھ پتا چلا؟

پتا کیا لگتا۔ اُلٹے تھانے دار نے دلی کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج غروب ہونے کے بعد گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے۔"

پٹری سے اترتے ہی باغ سامنے آ گیا۔

گاڑی یہیں روک کر بیک کر کے لگا دو۔ آگے راستہ نہیں ہے۔ انور بولا۔

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگا دی اور باغ کے سامنے پر کھڑا ہو گیا۔

کمرے میں اپنا باغ ست دن بعد دیکھا تھا۔ آج سے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہو لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر موجود تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انور کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ ٹیس ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انور نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انور کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین ہی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا، گرتا سنبھلتا باغ سے باہر نکلا۔ گاڑی میں انور کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹری پر چڑھا کر پل پار کر کے پکی سڑک پر آ گیا۔ سرفراز شدید گھبراہٹ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ سوکھے ہوئے کاغذ جیسا ہو رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟" سرفراز نے گاڑی روک دی۔

باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہتھیار تھا جسے وہ زمین پر لگائے ہوئے تھا۔"

**

سیّد محمد اشرف

روگ

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی، یا شاید ابھی ابھی ڈوبا تھا، کہ سڑک کے داہنی طرف گھوم کر جنگل جانے والے ڈھلان دار راستے پر وین آہستہ سے اُتری اور پورا موڑ کاٹ کر ابھی انجن نے رفتار بھی نہیں پکڑی تھی کہ گاؤں کی پُلیا کے پاس اوور کوٹ پہنے کھڑی اس عورت نے ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا جس کے دوسرے ہاتھ میں ایک نوعمر لڑکے کا سیدھا ہاتھ تھا۔

اضطراری طور پر ندیم نے بریک لگائے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور اس جھٹکے میں اتنی دھول اڑی کہ عورت کی پنڈلیاں اور لڑکے کے گھٹنے کچھ دیر تک گرد میں چھپے رہے۔

دھول زمین پر بیٹھنے اور انجن کی گھرگھراہٹ کے خاموش ہونے تک کے وقفے کے درمیان ندیم نے گاڑی کے اندر تین جملے سنے اور شرمندہ ہوا۔

ڈاکٹر وقار نے سیٹ پر رکھی رائفل ہاتھ میں لے کر کچھ تیز لیکن سمجھانے والے انداز میں کہا تھا:

"گاڑی کاہے روک دی یار! ڈی ایف او صاحب وہاں رینجری میں انتظار کرتے کرتے سو گئے ہوں گے۔ ویسے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔۔۔"

آصف نے کھڑکی کا شیشہ کھسکا کر باہر کھڑی عورت اور بچے کو دیکھ کر پھر اندر منھ کر کے مسکراتے ہوئے کہا تھا:

پاگل ہاتھی کے شکار کو چلے ہیں اور عورت کو دیکھتے ہی ہیرو بن جاتے ہیں۔

راشد نے کچھ سوچتے ہوئے خواہ مخواہ تشویش والے انداز میں کہا تھا:

پوچھ تو لے نیچے اتر کر۔ کون ہے؟ کیا چاہتی ہے؟'

ندیم نے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھولا۔ باہر دسمبر کی ہوا تھی۔ وہ نیچے اتر کر عورت کے پاس پہنچا۔

ارے ظالم، دروازہ تو بند کر جاتا۔ اب کے بڑی ٹھنڈ ہے۔ لگتا ہے پہاڑ پر کہیں برف پڑی ہے۔" ڈاکٹر وقار خود سے مخاطب تھے۔

ندیم نے واپس آ کر سیٹ پر بیٹھ کر دروازہ بند کیا اور مڑ کر اندر والوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہی تھا کہ اسے کچھ دھیان آیا۔ اس نے دروازہ پھر کھول دیا۔

راشد نے دیکھا کہ عورت کے چہرے پر دروازہ بند ہونے سے جو کھنچاؤ پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ چھٹ گیا اور چہرہ بشاش ہو گیا۔

اصل میں ۔۔۔ اس عورت کے پاس دس ہزار روپے ہیں۔ ندیم یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ جیسے اسے احساس ہو گیا کہ بغیر تمہید کے یہ جملہ کچھ ناموزوں سا تھا۔

کیا بات ہوئی؟ کس کے روپے ہیں؟ بلکہ اتنے روپے کیوں ہیں اس عورت کے پاس؟ وہ بھی جنگل کے راستے میں۔۔۔'

ندیم نے ڈاکٹر وقار کی بات کاٹی اور کچھ خود اعتمادی کے انداز میں ایک ساتھ بول گیا:

بروٹی گاؤں میں کپڑے کے تاجر ہیں نا، رومال، ان کے ہاں سے یہ روپیہ لائی ہیں۔ کینیڈا سے آئی ہوئی ہیں۔ رستوگی لکھنؤ کی ہیں۔ رومال کو یہ روپیہ انھوں نے کینیڈا ہی میں دیا تھا کہ جب یہ ہندوستان واپس آئیں تو انھیں واپس کر دے۔ ان کو آج ہی رات تک لکھنؤ پہنچنا ہے۔ ان کے ساتھ جو بچہ ہے وہ ان کا بھانجا ہے۔ اس کا نام راجو ہے۔ آج بسوں کی اسٹرائک ہے۔ یہ بات ان کو گاؤں سے چلنے کے بعد معلوم ہوئی۔ واپس گاؤں جانا نہیں چاہتیں، کیوں کہ پورے گاؤں میں ایک بھی گھر۔۔۔"

کچھ کہتے کہتے رک گیا کہ اسے ابھی ابھی ڈاکٹر صاحب کے کمپاؤنڈر رمیش کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جو بائیں طرف ایک بندوق لیے پچھلی سیٹ پر خاموش بیٹھا تھا۔

کبھی کبھی پوری صورت حال ایک ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔

[illegible] تک لیے چلتے ہیں۔ وہاں سے ڈی ایف او صاحب کے ساتھ بہرائچ تک بھیج دیں گے۔ بلکہ ان سے کہیں گے کہ بہرائچ کے بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر وقار اس طرح بولے جیسے اپنی تجویز پر تائید چاہتے ہوں۔

Scanned with CamScanner

گاڑی رکنے سے اب تک جو تناؤ پیدا ہوا تھا وہ اس جملے سے ٹوٹ گیا اور سب مطمئن نظر آنے لگے۔

ڈاکٹر وقار اپنی رائفل اٹھا کے پیچھے کی سیٹ پر جا کر آصف کے ساتھ بیٹھ گئے۔

ندیم نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ پکڑ کر دوسرے سے کھلے ہوئے دروازے کا اندرونی ہینڈل پکڑا اور چہرہ باہر نکال کر عورت کو پکارا۔

"آجائیے۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟ ہم لوگ اصل میں اندر جگہ کر رہے تھے۔" اس کے اس جھوٹ پر سب لوگ دل ہی دل میں مطمئن ہوئے۔

اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھول دیا۔ عورت نے پہلے بچے کو چڑھایا اور پھر بورڈ پر جوتے رکھ کر ایک جھٹکے میں اوپر چڑھ گئی۔ وہ فل بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ گاڑی پر چڑھنے سے لے کر سیٹ پر بیٹھنے تک کے وقفے میں سب نے اُسے غور سے دیکھ لیا۔ جس وقت وہ سڑک کے کنارے ذرا دور کھڑی تھی اس وقت گردن موڑ کر اسے دیکھنا ذرا معیوب سا لگ رہا تھا۔

وہ نکلتے ہوئے قد کی ایک جوان اور دلکش عورت تھی۔ اس کے رخساروں کی کھال کے کھنچاؤ اور چہرے کی نرم نرم چمک دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شاداب پھل کثرت سے کھاتی رہی ہوگی۔ ایسا صرف ندیم نے سوچا تھا۔ ممکن ہے اس سے ملتی جلتی بات اوروں نے بھی سوچی ہو۔

عورت نے اپنے اوور کوٹ کی جیب پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر محسوس کیا اور بچے کو کندھے سے پکڑ کر اپنے نزدیک لا کر بغیر چہرہ موڑے سب کو دھیمے سے "تھینک یو" کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے کچھ سوچ کر کہا: "آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔"

سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ اب اتنا اندھیرا پھیل گیا تھا کہ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی فصل بوئی ہوئی ہے۔

سامنے سڑک پر جنگل کی چوکی کا بیریئر تھا۔

چوکی کے سامنے جا کر گاڑی دھیمی ہوئی ہی تھی کہ خاکی وردی پہنے چوکی والے نے گاڑی کے سامنے آکر ہیڈ لائٹس کی روشنی سے آنکھوں کو بچانے کے لیے ماتھے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ٹیڑھا میڑھا چہرہ کر کے گاڑی کو پہچانا اور بیریئر اونچا کر دیا۔ چوکی پار کر کے گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور بڑھی ہوگی کہ آصف نے کہا:

"ندیم، ایک منٹ روکنا ذرا۔ بس تھوڑا سا۔"

"وہی حرکت؟ وہی خوشبو والی بات نا؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"ہاں،" آصف نے دھیرے سے جواب دیا۔

گاڑی رکی تو آصف کے ساتھ ڈاکٹر وقار بھی نیچے اترے اور اس وقت جب دروازہ کھلا تھا تو

Scanned with CamScanner

باہر سے جو ہوا اندر آئی تھی وہ کسی اور سیارے کی ہوا تھی۔ گاڑی جنگل کے اندر داخل ہو چکی تھی۔

آصف اور ڈاکٹر وقار دیر تک گاڑی سے ٹیک لگائے تیز تیز سانسیں کھینچتے رہے۔ ندیم نے بھی اپنا دروازہ کھول لیا تھا۔ اس نے سامنے پھیلے جنگل کی طرف ناک کر کے تیزی سے گہری گہری سانسیں لیں اور جنگل کی خوشبو کو بہت استغراق کے ساتھ محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اس نے سوچا، اس خوشبو میں ساگون کے ہاتھی کے کان جیسے بڑے بڑے پتوں کی مہک، سکھو کے تنے کی چھال کی تیز بو، جنگل کی طرح طرح کی گھاسوں کی مہکار اور جنگل میں بسنے والی سیکڑوں قسم کی مخلوق کی جلد اور بالوں کی حیوانی بو شامل ہے اور کیوں کہ اس وقت اندھیرا ہے اور آنکھیں اپنا کام نہیں کر پا رہی ہیں، اس لیے جنگل صرف ناک کے ذریعے شامہ کے سہارے اندر ہی اندر اترتا چلا جا رہا ہے اور سامنے چاروں طرف پھیلے جنگل میں یہ سناٹا وجود کو کبھی کبھی بے معنی اور کبھی کبھی بامعنی بنا دیتا ہے۔ اور جنگل کے اندھیرے سناٹے کو جب کسی پرندے کی خوابیدہ چہکار یا کسی چرندے کے چرنے یا بھاگنے کی آواز یا کسی درندے کی غراہٹ توڑتی ہے تو لگتا ہے اتنے حصے میں اجالا پھیل گیا ہو۔ کبھی کبھی آواز روشنی بن جاتی ہے۔

بچے نے پہلے ان سب کو لاتعلقی پھر تعلق کے ساتھ، پھر نہایت غور سے دیکھنا شروع کیا۔

ندیم نے سوچا، جیسے آواز کبھی کبھی روشنی بن جاتی ہے تو کیا روشنی بھی کبھی کبھی آواز بن سکتی ہے؟ وہ اس بے ربط بات کو کسی منطقی نتیجے تک لے جانا چاہتا تھا کہ اتنے میں ڈاکٹر وقار نے دروازہ بند کیا اور خود کو سیٹ پر گرا کر اعلان کرنے والے انداز میں کہا:

"ہاں کتنا خوب صورت اور پرسکون جنگل تھا۔ اس سالے پاگل ہاتھی نے سب گڑبڑ کر دی۔"

پاگل ہاتھی کے نام پر عورت اور بچے کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ تبدیلی آ گئی۔

"کتنا اچھا وقت تھا وقار بھائی، جب ہم لوگ کئی کئی دن تک جنگل میں آ کر رکتے تھے۔ کسی طرف بھی چلے جاؤ کوئی جوکھم نہیں۔ پچھلے موسم میں ہم لوگ چاندنی رات میں رانجھری سے لے کر گیرو ندی تک پیدل گئے تھے اور وہاں ریت پر بیٹھے گھڑیال دیکھے تھے۔ کتنا مزہ آیا تھا۔ راستے میں گلدار بھی ملا تھا، بلکہ دو گلدار ملے تھے۔"

"اب تو سورج ڈوبنے کے بعد جنگل میں داخل تک نہیں ہو سکتے۔" پیچھے سے رمیش نے ٹکڑا لگایا۔

ندیم نے دروازہ بند کر کے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس نے دیکھا کہ بچہ عورت سے لپٹ کر اس کے پہلو میں چھپ رہا ہے، اور شاید رو رہا ہے۔

"کیا بات ہے؟" اس نے بچے سے پوچھا لیکن عورت کی طرف دیکھ کر۔

"یہ ہاتھی والی بات سے ڈر گیا ہے۔" اس نے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف کرتے

Scanned with CamScanner

ہوئے کہا۔ مطلب پاگل ہاتھی کا نام سن کر۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ کیا یہاں کوئی ہاتھی روگ (rogue) ہو گیا ہے؟"

ہاں پچھلے دنوں سے جنگل میں ایک روگ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ اسی کو مارنے جا رہے ہیں۔

اب بچہ عورت کی کمر مضبوطی سے پکڑے مگر چہرہ گھمائے ندیم کی بات سن رہا تھا۔ رینجری تک پہنچتے پہنچتے ندیم عورت کو بتا چکا تھا کہ یہ روگ اب تک بہت سی معصوم جانیں لے چکا ہے اور یہ کہ اس روگ کا ایک دانت ٹوٹا ہوا ہے، اور اس ہاتھی کے پیٹ پر ایک دیہاتی کی گولی کے زخم کا نشان ہے اور اس ضلع کے جنگلات کے افسر نے چیف وائلڈ لائف وارڈن کے پاس رپورٹ بھیج کر اس ہاتھی کو روگ ڈکلیئر کیا ہے۔ ڈاکٹر وقار اور آصف کو اس روگ کو مارنے کا اجازت نامہ ملا ہے اور یہ کہ پہلے تو اکا دکا واقعات ہی ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اس ہاتھی کی من مانیاں بڑھتی گئیں۔ پھر لوگوں نے احتجاج کیے، گرام سبھا سے بات بلاک کی سطح پر آئی، پھر ضلعے کی سطح پر، پھر صوبائی اسمبلی میں یہ معاملہ اٹھایا گیا۔ لیکن جنگل اور جنگل کے جانوروں کا تعلق مرکز کے محکمے سے بھی ہوتا ہے، اس لیے مرکزی کمیٹی میں بھی اس معاملے پر کئی مرتبہ زبردست بحث مباحثہ ہوا۔ عورت کے پوچھنے پر ندیم نے یہ بھی بتایا کہ شروع شروع میں اس ہاتھی کو ختم نہ کرنے کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اتنے ہاتھیوں میں روگ کی شناخت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ویسے بھی سرکاری کاموں میں اکثر تاخیر ہو جاتی ہے کیوں کہ دفتری نظام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ستے بڑے علاقے کو۔۔۔۔

کیوں کہ رینجری دور تھی اور وقت کافی تھا اور عورت دلکش تھی، اس لیے ندیم نے اس بات پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی کہ حکومت کے اپنے وسائل کس حد تک محدود ہوتے ہیں، خاص طور پر اس قسم کے ہنگامی حالات میں۔ اس لیے حکومت کبھی کبھی سہولت کے پیش نظر ذاتی اداروں یا افراد سے رابطہ قائم کر کے کچھ ذمے داریاں ان کے سپرد کر دیتی ہے۔ مثلاً اس وقت بھی ہاتھی کو مارنے کا جو اجازت نامہ ہے وہ خود ڈی ایف او صاحب کے نام ہے، مگر ان کی رائفل پرانی وضع کی ہے اور قابل اعتبار نہیں ہے۔

عورت نے اس بیچ ندیم کو مخاطب کر کے لیکن سب کو مطلع کرنے والے انداز میں بتایا تھا کہ وہ پچھلے دس سال سے کینیڈا میں ہے جہاں اس کا شوہر ڈاکٹر ہے اور وہ ہر دو سال بعد آ کر لکھنؤ میں اپنے والدین سے مل لیتی ہے، اور جب وہ پہلی مرتبہ کینیڈا گئی تھی تو اس وقت راجو صرف ایک سال کا تھا اور اس وقت راجو چھٹے کلاس میں پڑھتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ لکھنؤ سے بہرولی ضلع بہرائچ اکیلی ہی آ سکتی تھی، لیکن والدین نے اتنی دور اکیلے بھیجنا معیوب جانا اور حفاظت کے لیے اس مرد کو ساتھ کر دیا۔ مرد کہتے وقت اس نے اپنے بھابے کو محبت سے دیکھا تھا اور مسکرائی تھی۔ راجو بھی ہاتھی کے ذکر سے پیدا ہونے والے خوف کے باوجود مسکرایا تھا بلکہ شاید کچھ شرمایا

Scanned with CamScanner

گئی تھی۔ عورت نے یہ بھی بتایا کہ والدین نے بہت سختی سے تاکید کر دی تھی کہ ہر حالت میں مغرب کے وقت تک واپس ہو جانا کیوں کہ اس پورے علاقے میں آج کل۔۔۔

اتنا کہہ کر اسے خاموش ہونا پڑا کیوں کہ اس کی ان باتوں کو سنتے ہی ڈاکٹر وقار زور زور سے رمیش کا نام لے لے کر اس سے کوئی بے ربط سی بات کرنے لگے تھے۔

اس درمیان رمیش نے اس بات کا اقرار کیا کہ جب سے ترائی کے علاقے میں سکون ختم ہوئے وہ بھی خوف زدہ ہے اور رات کو ہائی وے کے سفر سے بچتا ہے کیوں کہ پچھلے اتوار پیلی بھیت میں پورن پور کے پاس ایک بس روک کر۔۔۔

عورت بیچ بیچ میں بچے کو دھیمے دھیمے کچھ سمجھاتی جا رہی تھی۔ ندیم نے عورت کا کام ہلکا کرنے کے لیے بچے کو اپنے اعتماد میں لینے کی کوشش کی اور اس بات کو محسوس کر کے خوش ہوا کہ دھیرے دھیرے اس کے اعتماد میں آتا جا رہا ہے وہ عورت خوش اور مطمئن ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سوچ کر ندیم اور زیادہ جوش و خروش کے ساتھ بچے سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بچے کو بتایا:

ان جنگلی ہاتھیوں کو مارنے کے لیے کسی کسی رائفلوں کی ضرورت بھی پڑ سکتی ہے۔

آپ کے پاس کیسی رائفلیں ہیں؟

ایک رائفل ہے مگر دو بندوقیں بھی ہیں۔ لیکن بندوق کے کارتوس کا ہاتھی پر زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بڑے بور کی رائفل چاہیے۔

رائفل الگ الگ طرح کی ہوتی ہیں؟ بچے نے پوچھا۔

ہاں۔ رائفل کی گولی کے وزن اور رفتار کے حساب سے رائفل کی الگ الگ قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے تھرٹی اسپرنگ فیلڈ، تین سو پندرہ کاربائن۔۔۔ رشید نے پیچھے بیٹھے بیٹھے محسوس کیا کہ ندیم باتیں تو بچے سے کر رہا ہے لیکن سنا رہا ہے عورت کو۔ شاید اپنی معلومات کا رعب ڈال رہا ہے۔

ندیم بتا رہا تھا:

ہمارے پاس جو رائفل ہاتھی کو مارنے کے واسطے ہے وہ ہے تین سو پچھتر میگنم۔ اس کی گولی کے وزن اور رفتار کے تناسب کا دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے۔

"تناسب کیا؟" بچے نے پوچھا۔

"تناسب۔۔۔ تناسب، یعنی کہ ریشو۔"

"ریشو تو اریتھمیٹک میں ہوتا ہے۔" بچہ بولا۔

وہی والا ریشو اور چیزوں میں بھی ہوتا ہے بھائی! ندیم سمجھانے میں ناکام ہوا تو جھنجھلانے لگا۔

اور اگر رائفل ہاتھی پر چلائیں اور اسی وقت رائفل خراب ہو جائے تو؟ بچے نے سوال کیا۔

Scanned with CamScanner

"کچھ تم بھی بولو یار!" آصف نے مداخلت کی۔
"ایسے موقعے پر ہم لوگ بندوق سے فائر کر کے ہاتھی کو بھگا سکتے ہیں،" ندیم نے بتایا۔
"اگر وہ نہ بھاگے تو؟"
"تو بہت سی آگ جلا کر اسے ہراساں کر سکتے ہیں۔"
"وہ آگ سے ڈرتا ہے؟" بچے نے پوچھا۔
"وہ رات میں روشنی سے ڈرتا ہے،" ندیم کے بجائے راشد نے جواب دیا۔
"آپ کے پاس آگ کے لیے کچھ ہے؟" بچے نے پوچھا۔
"جی ہاں، یہ موجود ہے،" ڈاکٹر وقار نے مسکراتے ہوئے ماچس دکھائی اور سگریٹ نکال کر سلگائی۔

یہ جواب سن کر راجو بہت دیر تک ماچس کو دیکھتا رہا۔ باتوں باتوں میں عورت نے ندیم کو یہ بھی بتایا کہ لکھنؤ میں اس کے والدین نے یہ بھی سمجھا دیا تھا کہ یہ علاقہ بہت پس ماندہ ہے، قدم قدم پر چور اور لٹیرے بھی ملتے ہیں، اس لیے تم رات نہ کرنا، تمھارے پاس رقم ہوگی۔

یہ سن کر ندیم کو سبکی کا احساس ہوا۔ تب اس نے ذرا ہوشیاری کرتے ہوئے اپنی یادداشت کو کھنگالا اور انگریزی میگزینوں کے سرسری مطالعے کی یادوں کو جمع کر کے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: "ہم لوگ اکثر کینیڈا میں بسے اپنے ہم وطنوں کے خیال سے فکرمند رہتے ہیں کہ وہاں سرمنڈے لوگوں نے ایشیا والوں کو بہت پریشان اور ذلیل کر رکھا ہے۔"

ذلیل کے لفظ پر اس نے ضرورت سے زیادہ زور دیا تھا۔

عورت نے ندیم کی چالاکی کو سمجھ کر نمکین موقعے کی رکت کو جانتے ہوئے، بھولے بھولے ذکر کرنے والے انداز میں کہا:

"اس طرح کے گروہ لندن وغیرہ میں زیادہ ہیں۔ کینیڈا میں دوسری طرح کے مسائل ہیں۔"
وہ دیر تک ان مسائل کا تذکرہ کرتی رہی۔

ندیم کو اپنے ناقص مطالعے پر کچھ دیر تک شرمندگی محسوس ہوئی۔ تب اس نے موضوع بدلا اور بتانے لگا کہ جنگل میں روگ ہو جانے سے کیسے کیسے نقصانات ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ جنگل کے تمام نارمل کام رک جاتے ہیں۔ جنگل کی کچی روڈ بنانے والے مزدور علاقہ چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں۔ پتوں کی صفائی کرنے والی عورتیں جنگل میں آنا بند کر دیتی ہیں۔ جنگلات کی گھاس کے ٹھیکے اٹھنا بند ہو جاتے ہیں کہ کون اپنی جان جوکھم میں ڈال کر گھاس کٹوائے گا۔ شہد کے ٹھیکے دار کام چھوڑ دیتے ہیں۔ جنگلات کے نگہباں افسران اس طرح سے جنگل کی لکڑی چوری کرنے والوں کو مدعو نہیں کر پاتے کہ کب کسی درخت کے پیچھے سے یا اونچی اونچی گھاس یا جھاڑی کے پیچھے سے آ نکلیں

Scanned with CamScanner

سُرخ کیے، سونڈ اٹھائے، چنگھاڑتا ہوا روگ نکل پڑے اور کچل کر رکھ دے۔

رینجری پہنچنے سے کچھ دور پہلے ہیڈلائٹس ایک لکڑی کے کھمبے پر پڑیں جس پر ایک تختی لگی تھی۔ اس پر ہندی میں لکھا تھا:

"ہوشیار! یہ ہاتھیوں کے گزرنے کا راستا ہے۔"

راجو نے بھی سے پڑھا اور کھسک کر عورت کے پہلو میں گھس گیا۔

اچانک ندیم نے ہیڈلائٹس بند کر کے گاڑی روک دی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی اور سب کا توازن بگڑ گیا۔ گاڑی رکنے سے جنگل کا سناٹا واضح ہو گیا تھا۔

سامنے ہاتھی سڑک پار کر رہے ہیں، ندیم نے دھیمے سے کہا۔ سب نے سانس روک روک کے دور سڑک پر بڑے بڑے سیاہ دھبوں کو ہولے ہولے قدموں سے سڑک پار کرتے دیکھا۔ گاڑی کے باہر اور اندر سناٹا چھایا رہا۔

کچھ دیر بعد ندیم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بہت تیز رفتاری سے چلاتا ہوا رینجری تک لایا۔ گاڑی روک کر اس نے عورت کو دیکھا، پھر سہمے ہوئے بچے کو دیکھا، اور گاڑی سے اترنے سے پہلے بچے کو مخاطب کر کے بتایا کہ روگ غول میں نہیں ہوتا۔ غول کے ہاتھی عموماً بے ضرر ہوتے ہیں۔ روگ سب سے الگ تھلگ ہوتا ہے۔ رینجری میں الاؤ جلتا اور کئی لوگوں کو تاپتا دیکھ کر راجو کے چہرے کا پیلاپن دور ہوا۔ اس نے اترتے اترتے پوچھا:

کئی پاگل ہاتھی جمع ہو جائیں تو غول نہیں بن جائے گا کیا؟

عجیب بے تکی باتیں کرتا ہے، ندیم نے گاڑی سے اتر کر دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا۔

رینجر صاحب پوری وردی پہنے ہوئے سب سے باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کا بچہ ہے؟" انھوں نے ندیم سے پوچھا۔

نہیں یار، یہ لوگ بہرولی میں ملے تھے۔ اس نے پورا معاملہ سمجھایا

"تب تو بڑی دقت ہو گی۔ ڈی ایف او صاحب تو موتی پور والے راستے سے نیپال نکل گئے ہیں۔ وہاں کسٹم چوکی پر ہمارا ایک آدمی پکڑا گیا ہے۔"

یہ سن کر عورت کے چہرے پر بے چارگی دوڑ گئی۔ وہ ایک ایک کا منھ دیکھنے لگی۔

"میں وائرلیس سے لکھنؤ سوچنا بھیج دوں کہ آپ کے گھر خیریت بتا دیں؟"

لیکن ان کے جانے کا مسئلہ کیسے طے ہوگا؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

ندیم نے عورت کے پاس آ کر کہا: "آپ تو رینجری پر رینجر صاحب کے گھر آرام کریں۔ ان کی بیوی بچے بھی ہیں۔ ہم سب کو جانتی مانتی ہیں۔"

عورت شش و پنج میں تھی کہ رینجر صاحب نے مطلع کیا کہ ان کی فیملی دو روز ہوئے میکے چلی

Scanned with CamScanner

گئی، کیوں کہ روگ کی وجہ سے پورے جنگل میں دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ بچوں کے ماما آ کر پنی بیٹی اور نواسوں کو لے گئے۔

اس وقت منظر یہ تھا کہ لوہے کی تار کی باڑھ میں گھری رینجری کی سُرخ پرانی عمارتوں کے درمیان لاؤ کے پاس رینجری کا پورا اسٹاف، دو موٹر سائیکلیں، اسٹیشن ویگن اور بہرائچ سے آئے شکاری اور وہ عورت اور وہ بچہ، سب کے سب لاؤ کی روشنی میں ہیولوں کی طرح لگ رہے تھے۔ لاؤ کی آگ تیز ہوتی تو ان سب کی پرچھائیاں بڑھ جاتیں۔ لاؤ کی آگ مدھم پڑتی تو پرچھائیاں سمٹ جاتیں۔ رینجری کے چاروں طرف پھیلا جنگل، ساگون اور ساکھو اور شیشم کے اونچے اونچے اور تناور درختوں کا جنگل دبیز کہرے کے نیچے بالکل خاموش کھڑا تھا۔ اس جنگل میں نزدیک یا دور بہت سے حیوانات یا تو اونگھ رہے ہوں گے یا خاموشی لیکن تیزی سے چگ رہے ہوں گے یا چر رہے ہوں گے یا پانی پی رہے ہوں گے یا غول میں کھڑے ہوں گے یا اپنی مادوں کو اپنے سینگوں سے چھو رہے ہوں گے یا اپنے بچوں کے بدنوں کو چاٹ رہے ہوں گے یا اپنے شکار پر حملہ کر رہے ہوں گے یا بھوکے پیٹ جنگل کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں بھاگ بھاگ کر اپنی خوراک یا اپنا شکار تلاش کر رہے ہوں گے۔

عورت بہت بے بسی سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو نکلنے ہی والے ہیں۔

"ہم لوگ لیٹ ہو رہے ہیں،" ڈاکٹر وقار نے خاموشی کو توڑا۔ "کیا آج کی کوئی خبر ہے؟"

"جی ہاں،" رینجر صاحب آگے بڑھے۔ "آج سوتی پور بلاک میں پرانے گیسٹ ہاؤس والے جنگل میں ساگوان کے ۱۹۵۵ پلانٹ کے آس پاس پگ مارک دیکھے گئے ہیں۔"

"آج تو آپ شیر کے شکار کی زبان بول رہے ہیں،" عصمت مسکراتے ہوئے بولے۔

"نہیں جی، بات ایسی ہے کہ سب لوگ بہت ڈرے ہوئے ہیں۔ اُسے سامنے دیکھ لیں تو وہیں تصور دم نکل جائے۔ رینجری چھوڑ چھوڑ کر سب کے پریوار چلے گئے ہیں۔ جس دن سے رینجری میں گھس کر اُس نے چوکیدار کو کچل کر مارا اُسی دن سے یہ حالت ہوئی ہے۔ آج تو آپ لوگ اس کا بھُس ہی بنا کر جانا۔"

"اللہ مالک ہے!" ڈاکٹر وقار بولے۔ "پھر کیا سوچا بھائی؟" انھوں نے ندیم اور عورت کے پاس آ کر پوچھا۔ ندیم خاموش کھڑا راجو کو ماچس سے ایک چھوٹا سا الاؤ جلاتے دیکھتا رہا۔

عورت نے دھیرے سے لیکن اعتماد کے ساتھ کہا:

"آپ میرے گھر والوں سے انتظام کرا دیجیے اور مجھے بھی گاڑی میں لے چلیے۔ یہاں رینجری میں مت چھوڑیے گا۔"

Scanned with CamScanner

آپ سوچ رہی ہیں، آپ کے ساتھ بچہ ہے۔ آپ لوگ روشنی کو دیکھ کر ڈر جائیں۔

اب جو ہونا تھا سو ہو گا۔ مجھے جنگلی جانوروں سے ڈر نہیں لگتا۔ میں۔۔۔۔ ہم لوگ شادی کے بعد افریقا کے جنگل میں، ممباسہ میں شکار۔۔۔ کئی موقعوں پر گئے تھے۔ پرمٹ لے کر گئے تھے۔ میں نے خود ایک بھینس مارا تھا۔"

ندیم کو یہ سن کر حیرت ہوئی اور شرمساری سی۔

"مگر راجو۔۔۔" ندیم بولا۔

"میرے پاس چپکا بیٹھا رہے گا،" عورت نے جواب دیا۔

ویگن میں دوبارہ پٹرول ڈالا گیا۔ لوگ کے چاروں طرف بیٹھ کر سینڈوچ کھائے گئے۔ چائے پی گئی۔ تھرموس بھرے گئے۔ باتھ روم جایا گیا۔ رائفلیں اور بندوقیں ایک بار پھر چیک کی گئیں۔

سٹرنگ کی وجہ سے لی کہ اگر قریب سے موقع دیتا ہے تو فائر ہو گا، ورنہ بندوقوں سے فائر کرنے کا فائدہ نہیں ہے۔ ہاں اگر گولی چھوٹ گئی تو وہ زخمی ہو کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر وقار، عصمت، راشد اور ندیم کو سمجھا رہے تھے۔

ڈرائیور کا ساتھی اور رمیش کپڑے سے ویگن کے شیشوں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے تھے۔ ان پر کہر جم گیا تھا۔ سردی اتنی شدید تھی کہ دو تین منٹ بعد پھر کہر جم جاتا تھا۔

"سرچ لائٹ چیک کر لی ہے؟" ڈاکٹر وقار نے پوچھا۔

"جی ہاں،" رمیش نے کپڑا نچوڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کہر پریشانی پیدا کرے گا۔ گاڑی کے شیشے بند ہوں گے تو اندر بھی جم جائے گی،" ڈاکٹر وقار نے اندیشے کا اظہار کیا۔

"اب اس کا کوئی علاج بھی نہیں ہے۔ آج کی کمبخت ستاروں بھری اور کہر والی رات تھی،" ندیم نے بڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

رسوئی کی طرف اندر آنے والی کچی سڑک پر دور ایک روشنی نظر آئی اور پھر موٹر سائیکل کا دھیما دھیما پھٹ پھٹ کا شور سنائی دیا۔ موٹر سائیکل قریب آ کر رک گئی اور اس پر سے دو آدمی مفلر لپیٹے ہوئے اترے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بندوق تھی۔

"[illegible] ہیں؟ آپ سے تو میں نے بندوق نہیں [illegible]"

"جی ہاں،" [illegible] کہتے ہوئے ان کی طرف بڑھے۔ ادھیڑ [illegible] کھڑے ہوئے [illegible] پیچھے سے [illegible] رہے تھے۔

"یہ آپ نے [illegible] کہیں۔۔۔"

"جی نہیں، یہ بجنور سے شوٹنگ آئی ہے [illegible] آپ کے [illegible]

فیملی--- وہ دھیرے دھیرے سرگوشیاں کرنے لگے۔

ر۔بر صاحب اپنے بچوں کے نام لے لے کر چیخ مار مار کر رونے لگے۔

ڈاکٹر وقار نے اُنھیں ڈانٹنے کے انداز میں سمجھاتے ہوئے مصنوعی غصے کے لہجے میں کہا:

'پوری بات تو سن لیں۔ کیا کوئی سیرئولٹی ہوئی ہے؟'

'پوری بات فون پر صاف صاف سنائی نہیں دی۔ بہت دھیمے دھیمے کٹ کٹ کر آواز آ رہی تھی،" ان میں کا معمر شخص بولا۔

'کیا چوروں ڈاکوؤں والا معاملہ ہے؟' عورت نے ندیم کے پاس آ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

'معلوم نہیں۔ بتا رہے ہیں فون پر آواز صاف نہیں آ رہی تھی۔'

'اُدھر تو آج کل وہ دو لے جھگڑے بھی بہت چل رہے ہیں،" مصحف نے دھیمے سے کہا۔

'ہو سکتا ہے وہی والا معاملہ ہو،' راشد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

'وہ تو وہاں سے دور ہے یار،" ندیم بولا۔

'دور ہے لیکن اصل جگہ تو پاس ہے۔'

'ویسے ہی ٹامک ٹوئیاں مارنے سے فائدہ؟ تم لوگ باتیں بہت کرتے ہو۔' اچانک ڈاکٹر وقار کا لہجہ بہت خوفناک ہو گیا تھا۔ سب ان کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے انھوں نے کہا:

'آپ لوگ موٹر سائیکل پر روانہ ہو جائیں اور پہلے برانچ جا کر بجور فون کریں، سب سفر کا ر دہ کریں۔ اسٹاف میں سے کسی کو ساتھ لے جائیے۔ موٹر سائیکل خود نہ چلائیے گا۔'

ر۔بر صاحب کے جانے کے بعد سب لوگ بہت دیر تک خاموش رہے۔ البتہ لکڑی کا کوئی ٹکڑا الاؤ میں چٹختا تو سناٹا ٹوٹ جاتا۔

'اصل میں بات یہ ہے،' ڈاکٹر وقار نے لڑکی کی طرف منہ کر کے ہاتھ تاپتے ہوئے کہا، 'آج کل ہر طرف... یعنی ہر علاقے میں... مطلب یہ کہ سب لوگوں میں....'

پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد انھوں نے کہا:

'اب جس کام سے آئے ہیں پہلے اس کی رسم ادا کی جانی چاہیے۔ چلیے گاڑی میں بیٹھیے۔'

ندیم کے ساتھ آگے ڈاکٹر وقار بیٹھے، پیچھے کی سیٹ پر مصحف، عورت، راجو اور راشد، اور سب سے پچھلی سیٹ پر رمیش بھی صندوق لے کر بیٹھ گیا۔

راشد نے محسوس کیا کہ عورت بار بار انکھیوں سے رمیش اور اس کی صندوق کو دیکھ رہی ہے۔

راشد کچھ سوچ کر مسکرایا لیکن مسکراہٹ کی لکیر ابھی ہونٹوں تک بھی نہیں گئی تھی کہ راشد کے ماتھے

Scanned with CamScanner

پر لکیریں پڑ گئیں۔ وہ بھی آنکھ بچا کر رجیش اور اس کی بندوق کو دیکھنے لگا۔

جس وقت رہبر صاحب کے بیوی بچوں پر حملے کی اطلاع دی جا رہی تھی اس وقت رجیش کا چہرہ کیسا مسرت ہو گیا تھا، آصف نے سوچا۔

پھر کچھ یاد آیا کہ اسی وقت رہبر جی کے اسٹاف میں سے کسی شخص نے سرگوشی کی تھی کہ منور کے علاقے میں آج کل وہ والے جھگڑے بھی تو چل رہے ہیں۔ یہ بات رہبر جی کے اسٹاف کے کسی شخص نے کہی تھی یا ندیم نے، یا دونوں نے؟ یا دونوں نے نہیں کہی تھی، صرف میں نے یہ سوچا تھا؟ یا میں نے یہ سب کہا تھا؟ آصف کے ذہن نے کام کرنا بند کر دیا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔

ڈاکٹر وقار نے میگزین میں گولیاں ڈالیں، بولٹ کھینچ کر برابر کیا اور رائفل تیار کر کے چوکس بیٹھ گئے۔

آصف نے بھی بندوق میں گولی والے کارتوس ڈالے اور کھڑکی سے لگ کر بیٹھ گیا۔

راشد نے اسٹیئرنگ کا ہینڈل کس کے پکڑا اور آنکھیں ونڈ اسکرین پر ڈال دیں۔

عورت نے اپنے دوپٹے کے بند کو کسا اور بچو کو اپنے پہلو سے چمٹا لیا۔

رجیش نے ایک نالی میں کارتوس بھرا اور کھڑکی کے پاس جم کر بیٹھ گیا۔

"آپ لوگ اب آواز نہ نکالیے گا۔ ہاتھی کے کان بہت تیز ہوتے ہیں،" ڈاکٹر وقار دھیمے سے بولے۔

"ابھی تو وہ اسپاٹ دور ہے،" ندیم نے کہا۔

"پھر بھی خاموش رہنے میں کیا حرج ہے؟"

ندیم نے ڈیش بورڈ سے کپڑا نکال کر اندر سے شیشہ صاف کیا لیکن باہر بھی کہرا جما ہوا تھا۔ اس نے وائپر آن کیا۔ وائپر کا بلیڈ پوری تیزی سے شیشے پر چلا۔ تب معلوم ہوا کہ شیشے کی اندرونی سطح پر نمی ہے۔ باہر سب کچھ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ صرف ہیڈلائٹس کی دونوں شعاعیں واضح تھیں۔

"گاڑی کے شیشے کھول دیں تو اندر کی نمی چھٹ جائے،" ندیم نے کہا۔

"یہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ مطلب یہ کہ اس وقت خطرناک ہے،" ڈاکٹر وقار دھیرے سے بولے۔

"پھر تو اندر ایسے ہی کہرا جمارہے گا۔ باہر کا کچھ بھی صاف نظر نہیں آئے گا،" راشد نے کچھ تشویش کے ساتھ کہا۔

"مجبوری ہے،" ڈاکٹر وقار نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

آصف نے بیٹھے بیٹھے پوری گاڑی میں نظر دوڑائی اور کہا: "سائیڈ اور پیچھے کے شیشے سے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔"

"ادھر تو باہر کی روشنی بھی نہیں ہے۔ مطلب ہیڈ لائٹس،" راشد نے کہا۔

"جیسے جیسے گیروا ندی قریب آنے گی کہرا اور بڑھے گا،" ندیم بڑبڑایا۔

گاڑی دھیرے دھیرے چل رہی تھی اور ہیڈ لائٹس کی دھندلی روشنی میں کہرے کے دھویں کے مرغولے چکر کھا رہے تھے، اور دھندلی روشنی اور کہرے کے مرغولوں کے آگے سڑک کے دونوں طرف پھیلے جنگلوں میں کوئی بھی شے صاف نظر نہیں آرہی تھی۔

"سامنے کیا چیز چل جا رہا ہے؟" ندیم نے سڑک پر نظر جما کر ڈاکٹر وقار سے پوچھا۔ انھوں نے غور سے دیکھا اور بتایا:

"خرگوش ہے یار۔ کہرے میں سب چیزیں ہیولا سی لگتی ہیں۔ اپنے سے کئی گنا زیادہ۔"

گاڑی کی آواز سن کر خرگوش رک گیا تھا۔ اس کی آنکھوں پر گاڑی کی روشنی پڑی تو اس کے سر پر دو نیلے بلب روشن ہو گئے۔

"ارے اس کی آنکھیں کیسی چمک رہی ہیں،" راجو چلایا۔

"چپ رہو چپ،" ڈاکٹر وقار نے اسے ڈانٹا، پھر پیچھے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔

گاڑی میں اندھیرا تھا، لیکن آنکھیں اتنے اندھیرے سے مانوس ہو چکی تھیں۔

راجو کے علاوہ سب کے سب ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔

راجو نے چہرہ اٹھا کر دھیمے سے پوچھا:

"ایں ـــ نی، دروغہ جی کے بیوی بچوں کو کس نے مارا؟"

ندیم نے بریک لگا دیے۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ ندیم نے لائٹیں بجھا دیں۔

"سامنے روگ کھڑا ہے،" اس کے منہ سے اور کچھ نہیں نکلا۔

خوف کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں سب کی پشت اور شانوں اور کمر کے پاس لہرائیں۔

"کس طرف؟" ڈاکٹر وقار نے رائفل کی سیفٹی "آن" پر کرتے ہوئے اتنے آہستہ سے پوچھا کہ انھیں یقین ہو کہ ندیم نے ان کی آواز نہیں سنی ہو گی۔

"سڑک کی داہنی سمت سے شاید بائیں طرف آرہا تھا، یا شاید سامنے سے دائیں یا بائیں سائیڈ میں آرہا تھا،" ندیم نے بتایا۔

"ندیم، لائٹس ـــ پھر نظر کیسے آئے گا؟" ڈاکٹر وقار نے کہا۔

Scanned with CamScanner

ندیم لائٹ آن کرنے ہی والا تھا کہ رمیش نے بے چینی کے ساتھ کہا:

پیچھے کی طرف سے بالکل گاڑی کے پاس۔

سب نے مڑ کر دیکھا، تاریک سڑک پر کچھ تھا۔

آصف نے اچانک اپنا ہاتھ بڑھا کر ڈاکٹر وقار کا شانہ دبا دیا۔

ادھر ہے۔ میری طرف کی کھڑکی کے پاس۔ بالکل قریب۔

سب نے اس کھڑکی سے پار دیکھا تو وہاں دھند میں کوئی دھبہ سا کھڑا محسوس ہوا۔

سب کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

میری کھڑکی پر بھی اس نے باہر سے سونڈ رکھی تھی۔ راشد نے سرگوشی میں بتایا۔

راشد کی طرف کی کھڑکی کے باہر کوئی لمبی سی شے بل کھاتی محسوس ہوئی تھی۔

ندیم نے سب کو چپ رہنے کا اشارہ کیا اور بتایا: میری طرف والا روگ تو ابھی وہیں کھڑا ہے شاید۔

کیا تمھیں بالکل صاف نظر آ رہا ہے؟ نشانہ لے کر فائر کر سکتے ہو؟ ڈاکٹر وقار نے کہا۔

بالکل صاف تو نہیں ہے۔ شیشہ بہت دھندلا ہے۔ شیشہ گرا دوں؟

ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔ شیشہ گرتے ہی اسے ہماری سانسیں تک صاف سنائی دیں گی۔

عورت نے بچے کے چہرے کی طرف دیکھا جو دہشت سے سفید پڑ گیا تھا۔ وہ پہلو میں گھسا، گردن گھما گھما کر چاروں طرف کے شیشوں کے پار دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عورت نے آنکھیں بند کر کے اپنے چہرے کے ٹھنڈے پسینے پر ہاتھ پھیرا اور اوور کوٹ پر ہاتھ خشک کیا۔

"وہ آہستہ آہستہ ادھر ہی بڑھ رہا ہے،" رمیش نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ وہ شیشے سے ناک چپکائے مسلسل ویسے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

آصف اور راشد نے بھی اپنے اپنے شیشوں کے پار دیکھتے ہوئے یہی بات بتائی۔

ڈاکٹر وقار خوف، تشویش اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں بولے:

یہ دیکھو کہ کس کا دانت ٹوٹا ہوا ہے۔ اصل روگ وہی ہے اور خطرناک بھی صرف وہی ہے۔

سب نے اندھیرے میں آنکھیں گڑ گڑ کر دیکھا اور بتایا کہ ان کی طرف والے شیشے کے پاس جو ہاتھی ہے اس کا دانت ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

کیا سبھی روگ ہیں؟ ڈاکٹر وقار جیسے خود سے بولے۔ انھوں نے عورت کی جانب سوالیہ

Scanned with CamScanner

نداز میں دیکھا جس نے ابھی ابھی ڈرتے ڈرتے باہر جھانکا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں۔ ڈاکٹر وقار کو اپنے شیشے پر باہر سے ایک دھمک سی محسوس ہوئی، یا شاید دل زور سے دھڑکا ہو، یا شاید رائفل کا کند جوتے سے ٹکرایا تھا۔ انھوں نے شیشے سے باہر گاڑھے اندھیرے میں جھانکا۔ اندھیرے میں محسوس ہوکہ اس کی آنکھیں سُرخ ہیں۔ ایک دانت ٹوٹا ہوا اور سونڈ اوپر اٹھی ہوئی لہرا رہی تھی۔

انھوں نے گھُٹی گھُٹی آواز میں کہا: "فائر نہیں ہوگا۔ ہم اتنے ایک ساتھ نہیں مار سکتے۔ ہماری گاڑی چاروں طرف سے روگوں میں گھری ہوئی ہے۔ جب تک شیشے بند ہیں عافیت ہے کہ آواز باہر نہیں جا رہی، ورنہ یہ ہم سب کو کب کے کچل چکے ہوتے۔"

تو اب کیا کریں؟ ندیم نے بیٹھی بیٹھی کمزور سی آواز میں پوچھا۔

سب کو ایک طرح کے خوف، بے بسی اور شرمندگی کا احساس ہو رہا تھا۔

ہم لوگ صبح ہونے کا انتظار کر سکتے ہیں، عورت نے پھنسی پھنسی آواز میں دھیمے سے کہا۔

سب کے سب اس بات سے مطمئن ہو گئے تھے اگر اسی وقت بچے نے جیب سے نکال کر ایک جیبر ہاتھ میں نہ لے لی ہوتی اور پھر بے ہوش نہ ہو گیا ہوتا۔

ندیم نے کسی سے آنکھیں ملائے بغیر گھوم کر ہاتھ بڑھا کر بچے کی مٹھی کھولی۔ ماچس کو دیکھا، ایک لمحے تک کچھ سوچا اور پھر مٹھی کو ویسے ہی بند کر کے مڑا اور باقی سب کی طرح سر جھکا کر خاموش بیٹھ گیا۔

**

اکرام اللہ

پشیمانی

کسی اور شخص نے فون پر احسان کا پیغام دیا کہ وہ کہتا ہے جیسے بھی ہو جلد آ کر مل جاؤ۔ چند دن ہوئے وہ انگلستان سے دل کا آپریشن کرا کے واپس آ گیا ہے۔ اس بات پر خصوصی زور تھا کہ جاتے ہوئے جب وہ تکلیف میں تھا تو تم نہ پہنچ سکے، اب واپسی پر وہ خوش ہے تب تو ملنے آ جاؤ، وہ تمہارے لیے بے قرار ہے۔ یہ آج سے تقریباً دس بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں اس آپریشن کی سہولت یہاں ممکن نہ ہوتی تھی۔ ہم دونوں اگرچہ پچھلے چالیس پینتالیس برس سے ایک ہی شہر میں مقیم ہیں، اور دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور دوستی کے جذبات بھی رکھتے ہیں، لیکن سالہا سال ملاقات نہیں ہوتی۔ اگر سر راہے کبھی مل بھی جاتے ہیں تو اپنے دھندوں میں ایسے گم ہوتے ہیں کہ ایک پُرجوش معانقے کے بعد رسمی سی گفتگو کرنے لگتے ہیں اور پھر جلد ہی اپنی اپنی راہ پر چل دیتے ہیں۔ ہم نے جینے کے لیے اپنے گھریلو، کاروباری ۔۔ اور یہ بھی کہہ لیں کہ سماجی ۔۔ تقاضوں کے پیش نظر نادانستہ طور پر دو الگ الگ کُرّے منتخب کر لیے ہیں اور انہیں کے بے بس قیدی ہو کر رہ گئے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے شہروں میں زندگی کا یہی ڈھب بن چکا ہے۔ نہیں، یوں کہنا شاید پورا سچ نہ ہو گا۔ در اصل ایک وجہ میری بیوی کی ہٹ بھی ہے۔ اُسے اس شخص سے خوف آتا ہے، بلکہ وہ تو سرے سے اسے شخص ہی ماننے سے انکاری ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کوئی بھوت اگر انسانوں کی بستی میں آ کر رہنا شروع کر دے تو اس سے وہ انسان تو نہیں

بن جاتا۔ میں نے اسے بہت مرتبہ سمجھانے کی کوشش کی کہ اس کی ہیئت کچھ تو بچپن ہی سے ایسی ہے، کچھ اپنی عجیب و غریب وضع قطع سے اسے اور بگاڑ لیتا ہے: اس کی بدصورتی پر نہ جاؤ، یہ بہت بھولا اور سیدھا آدمی ہے۔ بناوٹ اس میں نام کو نہیں۔ مزاجاً ہمدرد اور غیرت مند ہے۔ باتیں ایسی پیاری کرتا ہے کہ ایک طرف تو وہ دل موہ لیتی ہیں اور دوسری طرف حیرت ہوتی ہے کہ آج کے زمانے میں بھی کوئی اپنے اور دوسروں کے بارے میں اتنی صاف گوئی سے کام لے سکتا ہے۔ میرا دور کا رشتہ دار ہے، کلاس فیلو ہے اور بچپن کا دوست ہے۔ مجھے تو اس سے مل کر بہت لطف آتا ہے۔ پتا نہیں لوگ اسے کیوں اور کیسے غلط سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے اُس کی سادگی اور بھولپن کو واضح کرنے کے لیے بیوی کو لڑکپن کا ایک واقعہ بھی سنایا۔ اُس زمانے میں تیل میں تلا ہوا یہ بڑا پاپڑ ایک پیسے کا ایک ملا کرتا تھا۔ احسان کو اس کے ماموں نے عید یا کسی اور تہوار پر ایک روپیا دے دیا۔ اب اُس نے کیا کیا کہ اس پورے روپے کے پاپڑ خرید ے اور انھیں دونوں ہاتھوں سے سنبھالتا میرے کمرے میں آگیا اور میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا:

"لو کھاؤ۔"

میں ششدر ہو کر اس کا منھ دیکھنے لگا۔ "اتنے بہت سے پاپڑ؟ کیا بنانا ہے ان کا؟"

"کھائیں گے بھئی!"

"یہ تو بیس آدمی نہیں کھا سکتے۔ ہم دو کیسے کھائیں گے؟"

"تم دیکھتے جاؤ۔"

"یار، یہ بکواس بند کرو اور ٹھیک ٹھیک بتاؤ بات کیا ہے۔"

"کچھ بھی بات نہیں۔ ایک سال سے میرا دل چاہ رہا تھا کہ پاپڑ کھاؤں مگر ایک پیسا کہیں سے ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ جب بھی پاپڑ والے کے پاس سے گزرتا، میرا دل للچاتا۔ آپا سے اگر ایک پیسا مانگ لیتا تو وہ کبھی انکار نہ کرتی۔ مگر مانگتا کیسے؟ فرحان کو پینتیس روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ماں اس کی ایک تنخواہ سے دوسری تنخواہ تک کیسے گزر کرتی ہے۔ میں خود ہی تو سب کچھ بازار سے خرید کر لاتا ہوں۔ مہینے کے آخر میں دکان داروں سے ادھار کرنے کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ تین چار مہینے پہلے میں نے سودے کے پیسوں میں سے ایک پیسا کھسکا لیا۔ ماں نے حساب پوچھا تو کہہ دیا نالی میں گر گیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ میں وہ پیسا ٹینٹ میں اڑس سیدھا پاپڑ والے کے پاس پہنچا۔ بہت دیر اس کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اسی طرح پیسا ٹینٹ میں اڑسے واپس آگیا اور پیسا نکال کر ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ وہ پوچھنے لگی: نالی میں سے نکال کر لایا ہے؟ میں نے کہا: نہیں، میرے پاس ہی تھا۔ بولی: تو رکھ لے اگر تجھے چاہیے۔ میں نے کہا: نہیں آپا، میں نے کیا کرنا ہے، مجھے نہیں چاہیے۔ میں رونے لگا۔ وہ بھی رونے لگی۔ اس کے بعد آج تک مجھے کبھی پاپڑ کا خیال نہیں

Scanned with CamScanner

آیا۔ تین روپیا ملا تو میں نے سوچا اس ملعون نفس کو اسی کی پسند کے ہتھیار سے سزا دی جانی چاہیے۔

دو پاپڑ میں نے کھائے، اور دس پاپڑ وہ نفس کو گالیاں دیتے ہوئے بہ مشکل کھا سکا۔ باقی باون پاپڑ ہم نے گلی بازار میں جا کر بچوں اور فقیروں میں بانٹ دیے۔

بیوی نے طنز میں بھی ہنسی ہنستے ہوئے کہا: واہ واہ، بڑا عقل کا کام کیا آپ کے دوست نے۔ اور آخر میں سے آپ پر جو اتنے قرضے سوار ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ صرف شکل سے بیوقوف نظر آتا ہے۔ وہ تو باقاعدہ پاگل ہے۔

بیوی کی بات سن کر میں یک دم بہت اداس ہو گیا۔ اس وقت وہ مجھے اتنی وحشی نظر آئی کہ اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ سب اچھی چیزوں کی طرح دوسروں کے دکھ کا احساس کرنے اور احساس کی سی کچی اور کھری باتوں کا لطف اٹھانے کے لیے بھی کوئی خاص ذوق پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ غریبی اپنا ردعمل ظاہر کرنے کے کتنے بہت سے ڈھنگ جانتی ہے اور ان کے کیسے ان گنت رنگ ہو سکتے ہیں۔

عجیب بات ہے کہ میرے ماں باپ جب تک زندہ رہے، اُن کے خیالات بھی احسان کے بارے میں کچھ اچھے نہ تھے۔ انہیں اس سے خوف تو نہیں آتا تھا مگر اس سے نفرت بہت تھی۔ بچپن میں اسے ہمارے گھر آنے کی اجازت نہ تھی اور مجھے اس سے ملنے سے سختی کے ساتھ منع کیا جاتا تھا۔ میری بیوی کے خیال میں وہ جہنم سے بھاگی ہوئی کوئی روح تھا اور وہاں کی تپش نے اس کے جسم میں رچ بس کر اسے اندر باہر سے جلا کر کھنگر کر دیا تھا۔ وہ کہتی: یہ منحوس ہے۔ جہاں جائے گا یہی نحوست پھیلائے گا۔ جس سے ملے گا اُسے برباد کر ڈالے گا۔ خدارا اس سے بچیں۔ وہ کبھی میرے گھر نہ آئے۔ نہ کبھی میرے بچوں پر اس کا سایہ پڑے۔

احسان نے تو شادی کی نہیں تھی، اور مجھے اپنی گرہستی بچانے کے لیے ضروری تھا کہ اسے کبھی اپنے گھر نہ بلاؤں۔ آخر بیوی کی مستقل نکتہ چینی پر میرا اس کے فلیٹ پر گاہے گاہے جانا بھی چھوٹ گیا۔ احسان نے میری اس سرد مہری کا کبھی گلہ نہ کیا اور نہ میل جول قائم رکھنے پر اصرار کیا۔ لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس کا دل چاہتا ہے میں کبھی کبھی اسے ملنے آیا کروں، مگر وہ خود اپنی اس خواہش کو کبھی زبان پر نہ لایا۔

وہ کچھ کلاسوں میں پہلے بھی ایک دو بار فیل ہو چکا تھا۔ میں نے ساتویں کلاس پاس کی اور احسان آٹھویں میں فیل ہوا تو ہم دونوں کلاس فیلو بن گئے۔ دوستی تو پہلے سے تھی، اب اور بھی گاڑھی چھننے لگی۔ ہماری آپس میں دور کی رشتہ داری بھی تھی، مگر کس طرح، اس کا کبھی کچھ پتا نہ چلا۔

Scanned with CamScanner

احسان کی ماں، جنھیں وہ آپا کہتا تھا، جب کبھی اچھے موڈ میں ہوتیں تو کئی ایسے مردوں اور عورتوں کے نام گنوا گنوا کے (جنھوں نے ہم سے ملے بغیر اس دنیا سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا تھا) ان سے میرے باپ دادا کے رشتے بتا بتا کے ہم دونوں میں چچا بھتیجے کا، یا چچیرے بھائیوں کا یا ایسا ہی کوئی رشتہ جوڑتیں۔ ان کے یوں محبت سے عجیب ناموں کی گردان کرنے پر ہم پہلے تو کچھ حیرت زدہ ہوتے، پھر اس کوشش کے بے معنی پن اور ناموں کی نحوست پر ہنسنے لگتے۔ اپنی بےوقوفی میں یہ نہ سمجھتے کہ اس زمانے میں متوسط طبقے میں ایسے ہی نام رکھنے کا رواج تھا جیسے نام اب گھٹیا لوگوں نے رکھنے شروع کر دیے ہیں۔ میرے باپ کو احسان کے کنبے سے بڑی نفرت تھی۔ بشیر احمد کا نام سنتے ہی اپنا منھ حقارت سے دوسری طرف پھیر لیتا تھا۔ شاید یہ سمجھتا ہو کہ یہ لوگ اب بہت غریب ہو گئے ہیں، منھ لگایا تو کہیں قرض نہ مانگ بیٹھیں، یا شاید یہ وجہ ہو کہ بشیر احمد نے اپنے وقتوں میں انگریز کی تحصیل داری یہ کہہ کر چھوڑ دی تھی کہ فرنگی کی نوکری کرنا وطن سے غداری ہے، اور کانگریس میں شامل ہو کر بیوی بچوں کو فاقوں کے سپرد کر کے خود جیل پہنچ گیا تھا۔ ممکن ہے یہ بات ایک عملی طنز کی صورت میں میرے باپ کے ضمیر میں چٹکی کاٹتی ہو جب کہ وہ انگریز ڈپٹی کمشنر کا ریڈر ہونے پر فخر کرنا چاہتا ہو گا۔

ہمیں کلاس فیلو بنے دو مہینے ہوئے ہوں گے کہ ایک دن آدھی چھٹی ہونے پر میں نے احسان سے کہا: "آؤ، قلچے چھولے کھائیں۔" کہنے لگا: "میرے پاس تو پیسے نہیں ہوتے۔" میں نے کہا: "میرے پاس ہیں۔" اسکول کے دروازے کے سامنے مولا چھولے والے کے گرد بیٹھے ہوئے اور بہت سے لڑکوں کے ساتھ ہم بھی زمین پر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ہم نے ایک قلچہ لے کر آدھا آدھا کیا اور تام چینی کی چھوٹی سی پلیٹ میں چھولے اپنے سامنے زمین پر رکھ لیے۔ ہمارے چھولے لپیٹتے خوانوں کے درمیان آملے کے دانے جتنا بڑا ایک کوفتہ لڑھکتا پھر رہا تھا جسے ہم ایک دوسرے کے لیے چھوڑے ہوئے تھے۔ میں نے کہا: "احسان، تم یہ کوفتہ لے لو۔ مجھے نہیں کھانا۔"

"میں بڑا گوشت نہیں کھاتا۔ تم کھاؤ۔"

"کیوں؟"

"مجھے اس میں گوبر میں سڑتی بھینس بیٹھی دکھائی دیتی ہے۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا کہ سچ کہہ رہا ہے یا بن رہا ہے، اور پوچھا: "چھوٹے گوشت میں بکرا دکھائی نہیں دیتا؟" اس کی سارس جیسی لمبی اور سانولی گردن ہر وقت اکڑی رہتی تھی۔ اس کے اوپر تلوار کی دھار جیسے تیز نقوش والا چہرہ تھا جس پر منڈھی کاغذی کھال کے نیچے نہ صرف ہڈیاں ابھری نظر آتیں بلکہ ایک ایک ریشے کا تناؤ بھی دکھائی دیتا۔ اس کے جامنی، باریک، بھنچے ہوئے ہونٹوں نے، جو مسکرانا جانتے ہی نہ تھے، کہا: "نہیں۔" اس کی چھوٹی چھوٹی، سیاہ، بغیر پلکوں کی

جیساکہ آنکھیں ہر وقت تیزی سے ادھر اُدھر گھومتی رہتیں جیسے کسی حادثے کی منتظر ہوں جو کسی بھی لمحے ہو جاتا ہو۔ جہاں ان میں خوف جھلک مارتا وہاں ایک اٹل ہٹ بھی دکھائی دیتی جو اپنے موقف کے لیے جان کی قربانی دینے والے ہر شخص کی آنکھوں میں مستقل سی نظر آتی ہے۔ شاید اس کا باپ انگریز سے اپنی بغاوت کے جرم میں پھانسی کا ایسا ہی ایک پھندہ اس کے گلے میں بھی ڈال گیا تھا کہ اس کی آنکھیں پوری عمر پیروں تلے سے تختہ کھسکنے کے انتظار میں ہر لحظہ یہی پیغام نشر کرتی رہیں۔ میں نے آخری نوالے سے پلیٹ کو پونچھتے ہوئے کوفتے کو لپیٹ کر منہ میں ڈال لیا۔ اس کے کرارے ذائقے نے زبان پر جگنو کی چمک جیسے دو تین چٹخارے اور شرارے مارے اور پھر وہ حلق سے نیچے اتر گیا۔ میں اور میری زبان جلد ہی اسے بھول گئے۔ میں نے ہوٹے کو دونّی دی اور اس نے ایک آنہ مجھے واپس کیا۔ میں نے احسان سے کہا: "آؤ، ایک ایک قلچہ اور لے لیتے ہیں۔" کہنے لگا: "نہیں۔ آنہ سنبھال کر رکھو۔ پھر کام آئے گا۔"

ہم مرچوں سے سی سی کرتے، اسکول کے احاطے میں شیشم کے پیڑ کے سائے میں آکھڑے ہوئے۔ لڑکے چلچلاتی دھوپ اور جلاتی لو میں ننگے پاؤں، دھول اڑاتے اسکول کے چھوٹے سے صحن میں لٹ ہل کھیل رہے تھے۔ جس کو گیند مل جاتی وہ جس رخ چاہتا اسے لے کر چل پڑتا اور آس پاس کے لڑکے اس کا راستہ روکنے میں لگ جاتے۔ احسان نے اپنی ٹوپی ـــ جسے میں بہت دیر تک ذہب کی کھال کی سمجھتا رہا اور وہ تھی پلش کی ـــ اتار کر ملیشیا کی قمیص کا دامن اونچا کر کے گھٹے ہوئے سبز سر سے سر کا پسینا پونچھا۔ ٹوپی اس بانس کی طرح لمبے لڑکے کے سر پر سے پھسلتی پھسلتی کانوں پر آ رکتی اور اس کی بوسیدہ اونچی دیواریں اپنا بوجھ سنبھالنے کی سکت نہ رکھتے ہوئے کسی ایک طرف ڈھلکتے ڈھلکتے ڈھیر ہو جاتیں۔ اس ٹوپی کو وہ اپنے ہیرو مصطفیٰ کمال پاشا کے اسٹائل میں ہمیشہ آڑا پہنتا تھا۔ اس نے قمیص اٹھائی تو میں نے دیکھا، اس کا پیٹ شکاری کتے کی طرح پیٹھ سے لگا ہوا تھا۔ اس کے اوپر سوکھی پسلیوں کا ایک پنجر تھا۔ سانس لیتا تو پسلیوں کے درمیان کی کھال اندر باہر ہوتی۔ پسلیوں کے نیچے درمیان میں ایک ہڈی کی تکون سی واقع تھی جو دھڑک رہی تھی۔ مجھے ایک عجیب طرح کی حیرت کا احساس ہوا۔ یہ تو اندر سے زندہ ہے!

احسان بولا: "اب انگریزی کا پیریڈ شروع ہوگا۔ تم گھر کا کام کر کے لائے ہو؟"

"ہاں، تھوڑا بہت کیا ہے۔"

"انگریزوں کا بستر گول ہو رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر ہار رہے ہیں۔ ہندوستان پر جرمنوں کا قبضہ ہونے والا ہے۔ یہ وقت جرمن پڑھنے کا ہے اور اسکول والے بیوقوف ہمیں انگریزی پڑھا رہے ہیں۔ میں تو اب انگریزی کی کتاب کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، چاہے ماسٹر زبیر جان سے مار دے۔"

احسان کی یہ دلیل میرے لیے نہ صرف وزنی تھی بلکہ دل پذیر بھی بہت تھی۔ میں اسے سچے

Scanned with CamScanner

ہی قائل ہو گیا۔ واقعی میں جہاں کہیں جاتا وہاں انگریزوں کی متوقع شکست کا چرچا ہو رہا ہوتا۔ سوچا جب انگریزوں کو ہر صورت میں چلے ہی جانا ہے تو ان کی زبان سیکھنا بے کار کی بات ہے۔ سب سے اچھی بات تو یہ تھی کہ انگریزی سے جان چھوٹ رہی تھی، اور جرمن سیکھنے کی نوبت جب آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ لیکن احسان کی منطق میرے باپ کو مطمئن نہیں کر سکتی تھی جو ہر شام گھونسوں اور گالیوں کی مدد سے انگریزی کو میرے اندر اتارا کرتا تھا۔ احسان کا باپ مر چکا تھا۔ وہ آزاد تھا۔ لیکن میرا باپ زندہ تھا اور میں اس کی قید میں تھا۔

احسان نے کہا: "تو ٹھیک ہے، اب انگریزی تو ہمیں پڑھنی نہیں۔ اس کے بعد دینیات کا پیریڈ ہے، وہ ہمیں آتی ہی ہے۔ آخری پیریڈ جغرافیہ کا ہے۔ دن میں ایک آدھ پیریڈ چھوڑ بھی دیں تو کوئی حرج نہیں۔ چلو کہیں گھومتے پھرتے ہیں۔ کل آ کے درخواست دے دیں گے کہ آدھی چھٹی کے وقت ہمارے پیٹ میں درد ہو گیا تھا۔"

میں انکار نہ کر سکا۔ ہم لپک کر قلعہ نما بوسیدہ اسکول کی دوسری منزل پر واقع کلاس روم سے اپنے بستے اٹھا لائے اور چپکے سے باہر کھسک لیے۔ اسکول گرانڈ ٹرنک روڈ کے کنارے بنا ہوا تھا۔ اسکول کے بالکل سامنے ایک چھوٹی سی بجری سڑک نکل کر میرے محلے حسین پورہ کے اوپر اوپر سے ہوتی، ریلوے پھاٹک سے ریلوے لائن کو عبور کرتی سول لائن کے علاقے میں جا پہنچتی تھی۔ احسان اپنے سلیپروں سے دھول اڑاتا اسی چھوٹی سڑک پر چل پڑا۔ مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ کسی نے دیکھ کر ابا کو بتا دیا تو بہت مصیبت ہو گی۔ اُسے ایسی باتیں سوچنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر چیز پیلی، چلچلاتی دھوپ کی لپیٹ میں تھی۔ لگتا تھا طوفانِ نوح کی طرح یہ صرف آسمان سے نہیں برس رہی بلکہ زمین سے بھی اُبل رہی ہے۔ نظر کو کہیں امان نہ تھی۔ چُندھیاتی ہوئی دھوپ ہر چیز سے منعکس ہو کر سوئیوں کی طرح آنکھوں میں گھُسی جا رہی تھی۔ لُو جھلسائے دیتی تھی۔ کولتار کی سڑک کو جگہ جگہ پسینا آیا ہوا تھا۔ دائیں طرف محلے کے مکان چل رہے تھے۔ بائیں طرف پہلے صوفی نذیر کا کارخانہ آیا، پھر شیخ آفتاب، پروفیسر جعفری اور مسٹر پِک کے بنگلے گزرے اور ان کے بعد چمڑے کے گوداموں اور پاور لُومز کے کارخانوں کی عقبی، اونچی دیوار شروع ہو گئی جو گرمی کے ساتھ پاور لُومز کی دبی دبی دھڑکن بھی نشر کر رہی تھی۔ کمیٹی کا لیسٹر بلس جتنا موٹا، مگر کالا نل شرمشوں کرتا، سیمنٹ کے بنے قبر جیسے چبوترے پر پانی پھینکے جا رہا تھا۔ احسان نے ٹوپی کو نل پر رکھ کر ہاتھ منہ دھویا اور گیلے ہاتھ ٹنڈ پر پھیرے۔ مجھے پکڑے جانے کے خوف نے سُولی پر لٹکا رکھا تھا، پانی سے خود کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش خاک کرتا۔ میں پھرے کو دائیں طرف سے بستے سے چھپائے دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا گیا۔ اپنی گلی کے سامنے پہنچا تو آنکھ چُرا کر اُدھر دیکھا۔ خالی گلی میں سُرخ اینٹوں کے دو منزلہ مکان کندھے سے کندھا ملائے ننگے سر کھڑے دھوپ میں جل رہے تھے۔ مکانوں کی دوسری منزل

پر لکڑی کی بری، نیلی، سفید، قد آدم کھڑکیاں بانس کی پتلی کانیوں کی بنی چقوں کے پیچھے دم بخود کھڑی تھیں اور یقیناً لو سے بچنے کے لیے بند بھی ہوں گی۔ یہ سوچ کر کہ اس وقت میرے گھر کی کھڑکیاں بھی بند ہوں گی، کچھ ڈھارس بندھی۔ پکی گلی کی پکی نالی خربوزوں کے چھلکوں سے اٹ کر بند ہو گئی تھی اور گندا پانی گلی میں پھیل رہا تھا۔ چوک میں قلفی والا ہتھ ریڑھی پر قلفیوں کے مٹکے کو سرخ گیلے کپڑے سے ڈھانپے، ایک مکان کے ساتھ جڑے لکڑی کے لمبے تختے پر دیوار کے سائے میں سر پر کپڑا ڈالے بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ کبھی سنبھل کر ایک آواز لگاتا اور پھر اپنے آپ میں گم ہو جاتا۔ احسان ونٹ کی سی لمبی لمبی ٹانگیں چلاتا جلد ہی میرے برابر آ پہنچا۔

"یار، آج بڑی گرمی ہے۔"

ہوں۔

ٹھنڈی کھوہی سے چل کر پانی پیتے ہیں

ٹھنڈی کھوہی تو بہت دور ہے۔ مجھے چھٹی کے وقت گھر پہنچنا ہے۔

کچھ بھی دور نہیں سعید، تو خواہ مخواہ گھبرا رہا ہے۔ کمپنی باغ کے بیچوں بیچ سے نکل چلتے ہیں، یہ سامنے ٹھنڈی کھوہی کھڑی ہے۔"

ریلوے لائن کے پاس پہنچے تو پھاٹک بند ہو رہا تھا۔ پیدل گزرنے کا راستہ تھا۔ سائیکل سوار بھی اپنی سائیکلیں دونوں ہاتھوں میں سر سے اوپر اٹھائے چرخی میں سے گزر رہے تھے۔ احسان کہنے لگا: یار، گاڑی آ رہی ہے۔ دیکھ کر آگے چلیں گے۔

تیرا گھر تو ریلوے لائن کے ساتھ ہے۔ چوبیس گھنٹے گاڑیاں گزرتی ہیں، انھیں دیکھ دیکھ کر تیرا دل نہیں بھرا؟"

'نہیں، یہ بات نہیں۔ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ اس وقت کون سی گاڑی نکل رہی ہے۔'

'یار، مسافر گاڑی نہیں تو مال گاڑی ہو گی۔ چھوڑ، چلتے ہیں۔

دو منٹ کی تو بات ہے۔ دیکھ لیتے ہیں، مزہ آئے گا۔ ہر گزرتی گاڑی کو دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے کود کر اس میں جا بیٹھوں اور یہاں سے کہیں دور نکل جاؤں۔'

"تم نے پہلے ہی اتنے بہت سے سفر کیے ہیں۔ میانوالی، ملتان، منٹگمری، لاہور، سب دیکھ چکے ہو۔ ابھی تمھارا دل نہیں بھرا؟"

مجھے صرف اپنا آخری سفر یاد ہے جب لاہور سنٹرل جیل گیا تھا۔ اس وقت میں دس سال کا تھا۔ باقی کوئی سفر یاد نہیں۔ سب بہت چھٹ پنے میں ہوئے

پھاٹک والے نے دو چابیاں لائنوں کے قریب لگے لوہے کے بکس میں لگا دیں۔ گھنٹی جو مسلسل بج رہی تھی بند ہو گئی۔ وہ پلٹا تو احسان نے کہا: "مولوی صاحب، سلام علیکم۔' مولوی نے

اسے پہچاننے کی کوشش میں بڑے غور سے دیکھا کہ شاید کوئی پرانا شناسا ہو۔ پھر منہ میں پان کی پیک سنبھالتے ہوئے آسمان کی طرف سر اٹھا کر "وعلیکم السلام ورحمت اللہ وبرکاتہ" کہا۔ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا تھا مولوی کو نیلی وردی پہنے، پھاٹک کھولتے بند کرتے دیکھتے آ رہے تھے۔ زمین پر بچھے ریلوے لائنوں کے جال کے پرلی طرف ریلوے کی حد بندی کی دیوار کے ساتھ بنا دس فٹ ضرب آٹھ فٹ کا چبوترا مولوی کی مسجد تھا جس کے گرداگرد شناخت کے لیے چونا پتی ہوئی اینٹیں کھڑی لگائی گئی تھیں۔ وہاں وہ پانچوں وقت امامت کراتا اور صبح کے وقت بچوں کو قرآن مجید پڑھاتا تھا۔ سب لوگ اُسے ہندوستانی مولوی کہتے تھے۔ انجن نے جب کانٹے والوں کے کیبن کے چوبارے سے ذرا پرے سر نکالا تو مولوی تیل میں بسے دیسی چمڑے کے موٹے موٹے پوربی جوتے پہنے، چرچراہٹوں کی آوازیں نکالتا تیزی سے اپنے ایک کمرے کے کوارٹر کی طرف مڑا جس کے سامنے ذرا سی خالی جگہ کے ارد گرد تار کے اوپر ٹاٹ پھیلا کر صحن بنایا ہوا تھا۔ مولوی ٹاٹ اٹھا کر اندر داخل ہوا اور چارپائی پر پڑی جھنڈیاں اٹھائیں اور باہر نکل کر پھاٹک سے ذرا آگے لائنوں کے رخ بنائے گئے اینٹوں کے بکس نما واچ مین پوسٹ کے سامنے مستعدی سے سبز جھنڈی پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اب دونوں پھاٹکوں کے درمیان لائنوں پر سے پیدل گزرنے والوں اور سائیکل سواروں کا آنا جانا بھی بالکل بند ہو گیا اور پیلی دھوپ کے کھُلے کھیت میں اُس پار چونا پتی سفید اینٹیں چمکتی دکھائی دینے لگیں۔ اس طرف ہندوستانی مولوی کی تیل میں بسی لمبی سیاہ داڑھی اور بھاری پوربی جوتے چمک رہے تھے۔ نیلی وردی انگریز کی تھی اور جوتے پورب کے۔ تیل اور مسجد یہیں کے تھے۔ مُنڈی موچھیں اور لمبی داڑھی مولوی کی اپنی تھیں۔

دھک دھک کرتا انجن بڑی شان سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ خبردار کرنے کے لیے اس نے سیٹی بجائی۔ ذرا سی بھاپ اڑی۔ انجن کی تیکھی چیخ ایک نیزہ تھی جو دھوپ کے ساکت سمندر کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرے لمحے دھوپ ہاتھی کے سر پر آنکس کے زخم کی طرح پھر ویسی تھی۔ کوئلے جھونکتا فائرمین بوائلر کے کھلے منہ کے سامنے خود ایک جلتا ہوا سفید شعلہ لگ رہا تھا۔ پانی کا مشکیزہ ہینڈل سے بندھا، انجن کے ساتھ ساتھ ڈولتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور اپنی نشست پر ٹھٹھ سے بیٹھا سامنے دیکھ رہا تھا۔

احسان بولا: "اوئے، فوجی اسپیشل! میں بھی کہوں یہ کون سی گاڑی کا وقت ہے۔"

مجھے گزرتے ڈبوں میں فوجی وردیوں والے چلتے پھرتے نظر آئے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ لپکتے جاتے پہیوں کا شور اونچا ہو گیا۔ دھول اڑنے لگی۔ احسان چیخا: "توپوں کا چارہ نہ بنو۔ کیوں بیس روپے کے پیچھے جان گنواتے ہو؟ لوٹ آؤ۔" گاڑی نکل گئی۔ احسان کا نعرہ سن کر میں کانپ گیا۔ یہ تو پکڑا جائے گا اور اس کے ساتھ میں بھی۔ نا تو مجھے جان سے مار ڈالے گا۔ اسی لیے مجھے اس

Scanned with CamScanner

سے ملنے سے منع کرتا ہے۔ یہ تو خطرناک آدمی ہے۔ گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مولوی بکس سے چابیاں نکال کر پھاٹک کھولنے کے لیے چل پڑے۔ ہم ریلوے لائنوں کا جال عبور کرنے لگے جو سڑک میں ٹرانسسٹر کے سرکٹ کی طرح جڑا ہوا تھا۔ سڑک پر دیہاتیوں سے ٹھسا ٹھس بھری ایک لاری اور دو تین تانگے اور پھاٹک کھلنے کے انتظار میں رُکے کھڑے تھے۔ کلینر پسینا پونچھتا ہوا لاری کے پیچھے لگے گیس کے سلنڈر میں کوئلے ڈال کر دھونکنی سے ہوا بھرنے میں مصروف تھا۔ پھاٹک کھلنے کے بعد لاری کو پوری طرح تیار ہو کر چلنے میں دو تین منٹ اور لگے۔

حکم سنگھ روڈ پر ہمارے دائیں ہاتھ چھوٹی اینٹ کی بنی، نیچی سی لمبی بارک تھی جو ستر اسی گز تک سڑک کے متوازی چلی گئی تھی۔ اس کے پیچھے بھی ایسی ہی دو بارکیں اور تھیں اور ان کے بعد خوب کھلا پریڈ گراؤنڈ تھا۔ پریڈ گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ ریلوے لائن کے برابر امرود، آم اور آلوچے کے باغات کا سلسلہ دور تک دوڑتا چلا گیا تھا۔ باغات کے مقابل ریلوے لائن کے پار پہلے حسین پورہ تھا پھر شریف پورہ، تحصیل پورہ، مسلمانوں کے محلے تھے۔ بارکیں ختم ہونے پر ایک بہت اونچا، گھنا اور پھیلا ہوا برگد کا پیڑ تھا۔ اس کے ارد گرد اسپیشل پولیس کی عمارت، حوالات اور افسر انچارج کا کوارٹر تھا۔ اس پیڑ کا سایہ سب کے لیے تھا۔ نیچے کچھ لوگ چور سپاہی کے کھیل کو اپنی دانست میں حقیقت سمجھتے ہوئے کھیل رہے ہوتے تھے۔ بائیں ہاتھ پر سڑک سے پرے ہٹ کر کچھ بنگلوں کی عقبی دیوار تھی، پھر سڑک کے متوازی، مگر اس سے تین فٹ اونچی، ہر طرف سے بند، ایک گول محراب دار پکی تعمیر زمین سے نکل کر نمودار ہوتی اور ریلوے پھاٹک تک پہنچتے پہنچتے پھر کہیں گم ہو جاتی۔ کہا جاتا تھا کہ اس کے ذریعے پانی دربار صاحب کے تالابوں کے لیے جاتا ہے۔ یہ شنید ہی رہی، اس کی تصدیق کبھی نہ ہو سکی۔ جب تک تصدیق کرنے کی عمر آتی، تقسیم نے پرانا کھیل ہی مٹا ڈالا۔ برگد کے برابر پہنچ کر ہم پانی پینے کے لیے اس کی طرف چل پڑے۔ ہینڈ پمپ سے پانی پی چکے تو برگد کا سایہ اتنا ٹھنڈا اور آرام دہ لگا کہ وہیں پڑی اینٹوں پر سستانے بیٹھ گئے۔ دفعتاً حوالات کی عمارت کے پیچھے سے کسی کے چیخنے اور بے بسی سے منت سماجت کرتے ہوئے رونے کا شور کچھ یوں بلند ہوا جیسے اُسے قتل کیا جا رہا ہو۔ ساتھ ہی شڑاخ شڑاخ اور مغلظانہ گالیوں کی آوازیں بھی اُبھریں۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور احسان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بولا: بیٹھ جاؤ۔ کچھ نہیں۔ پولیس والے کسی سے پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا: "نہیں۔ فوراً چلو یہاں سے۔

اتنے میں ایک سپاہی حوالات کے پیچھے سے نکل کر تیزی سے دفتر کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو جاتے جاتے سختی سے بولا: اوئے، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ بھاگو یہاں سے۔" ہم پھر سڑک پر آ گئے۔

Scanned with CamScanner

میں نے پوچھا: "احسان، جب پولیس والے تمھارے ابا کو پکڑتے ہوں گے تو ان سے بھی اسی طرح پوچھ گچھ کرتے ہوں گے؟"

"یار، تم تو نرے احمق ہو۔ ابے وہ کوئی چور ڈاکو تھوڑا ہی تھے، وہ تو ہندوستان کی آزادی کے سپاہی تھے۔ انھوں نے تو پہلے ہی دن انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگا کر اپنے جرم کا اعلان کر دیا تھا۔ جب کوئی چیز چھپائی ہی نہیں تو پولیس ان سے کیا پوچھ گچھ کرتی۔ جیل خانے والے انھیں تکلیفیں دیتے تھے مگر وہ تکلیفیں اور طرح کی ہوتی تھیں۔ مثلاً فاقے دیتے، اکیلی کوٹھری میں بند کر دیتے، بیمار ہونے پر علاج نہ کرواتے، دوا دارو نہ دیتے، ملاقاتیں بند کر دیتے، خط نہ پہنچنے دیتے، بی کلاس نہ دیتے، مشقتیں کراتے۔"

"اس مار پیٹ کے سامنے تو وہ کوئی خاص سزائیں نہ ہوئیں۔"

"بچو، ایک دن میں تمھاری ممیں نہ بول جاتی اور تم اماں اماں نہ پکارنے لگتے تو مانتا۔ کوٹھی بند ہونا آسان نظر آتا ہے؟ پتا ہے وہ سب سے سخت سزا ہوتی ہے۔ بڑے بڑے وہاں توبہ پکار اٹھتے ہیں۔"

میں مانا تو نہیں لیکن معاملہ چوں کہ اس کے مرے ہوئے باپ کا تھا اس لیے صرف حیرت کا اظہار کر کے خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں راہ سے مانوس، سوئے ہوئے گھوڑے کی طرح دھیمی رفتار سے سج سج قدم اٹھاتے، لو کے تھپیڑے کھاتے، دھوپ کی سوئیوں جیسی چبھن جھیلتے کمپنی باغ پہنچ گئے۔

پھولوں اور درختوں کی گرم گرم، تیز، مسالے دار مہک نے نتھنوں میں گھس کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ مہک اچھی تو لگی مگر کوئی خاص فرحت نہ ملی کیوں کہ روشن، اندھی دھوپ نے اب تک اس میں سے تازگی کا ایک ایک قطرہ چوس لیا تھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر سگریٹ کی ایک رنگ برنگی ڈبیا پڑی چمک رہی تھی۔ احسان کھنچا ہوا ادھر گیا، ڈبیا اٹھائی، کھول کر دیکھی۔ حسب توقع خالی تھی۔ اس نے جیب میں ڈال لی۔ سگریٹ نہ وہ پیتا تھا نہ میں، لیکن ہم سب کی اپنی اپنی دیوانگیوں کی طرح سگریٹ کی خالی ڈبیاں جمع کرنا اس کی ذاتی دیوانگی تھی۔ قطعی پرائیویٹ، جس میں کبھی کبھی ازراہ محبت مجھے شامل کر لیتا تھا۔ بوٹوں کے تین چار گتے کے ڈبے سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بھرے کسی خزانے کی طرح اس نے سب کی نظروں سے بچا کر اپنے گھر میں کمرے کی چھت اور ٹیڑھے میڑھے بھوری چھال والے شہتیروں کی درمیانی جگہ پر چھپا رکھے تھے۔ اسے یقین تھا کہ کسی کو ان کا علم نہیں۔ ایک دن وہ باہر سے آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ اس کی بڑی بہن صفیہ اس کا ایک ڈبا اتار کر چارپائی پر بیٹھی دیکھ رہی ہے۔ وہ پہلے کمپنی کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھی۔ پھر کسی نے شکایت کر دی کہ اس کا مرحوم باپ کانگریسی تھا اور جیل میں رہا تھا، تو

Scanned with CamScanner

اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ اسے اپنا ڈبا ٹٹولتے دیکھ کر احسان پہلے تو بس کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا، پھر رونے لگا۔ وہ ہنس رہی تھی، جیسے اسکول میں اس کی شکایت کرنے والا آدمی ہنسا ہوگا، اور یہ رو رہا تھا، جیسے اسکول سے نکالے جانے پر وہ روئی تھی بلکہ سارا گھر مل کر رو دیا تھا۔ بولی: لو بھئی، اپنا ڈبا لے لو۔ میں تو ایسے ہی دیکھ رہی تھی۔ قسم سے لو جو میں نے اس میں سے کچھ نکالا ہو۔ اچھا پھر کبھی تمہاری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گی۔ اب معافی دے دو۔

ہم چلتے چلتے پردہ کلب کے پاس سے گھوم کر گھنے درختوں کے شام جیسے سائے کی پناہ میں بچی سڑک پر پہنچ گئے۔ میں نے کہا: آہا، مزہ آگیا۔

"دیکھا نا؟ اسی لیے تو کہتا تھا۔ میں تو کبھی کبھی ساری دوپہر یہاں بیٹھا رہتا ہوں۔ چھٹی والے دن۔"

"اکیلے؟"

"تو اور کیا۔"

"کیا کرتے رہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ بس بیٹھا رہتا ہوں۔"

اسے اس راز میں مجھے شریک کرنے پر افسوس ہونے لگا جو اس کے چہرے پر لکھا گیا۔ اسے شبہ ہوا کہ شاید میں اس کے معمول سے ہٹے ہوئے اس رویے کا لوگوں میں چرچا کروں گا۔ اس نے احتیاطاً اپنی بات میں اضافہ کیا: "ساڑھے چار بجے لائبریری کا ریڈنگ روم کھل جاتا ہے نا۔ پھر میں وہاں اخبار پڑھنے چلا جاتا ہوں۔"

"رنجیت سنگھ لائبریری؟"

"ہاں۔"

یہاں جتنی عمارتیں تھیں سب رنجیت سنگھ نے اپنے باغ -- رام باغ -- کے لیے تعمیر کرائی تھیں۔ ان میں سے کئی ایک عمارتوں میں اب انگریز اور دیسی افسروں کے کلب قائم تھے۔ سب سے اچھی عمارت میں، جو اعلیٰ اس نے اپنے رہنے کے لیے بنوائی تھی، لائبریری واقع تھی۔ سامنے کسی کی بنوائی ہوئی ایک اور عمارت میں عورتوں کا پردہ کلب تھا۔ ایک میں باغ کے انتظام کے لیے میونسپل کمیٹی نے دفتر بنا رکھا تھا۔ باغ کے پاس کی ایک عمارت سول ہسپتال میں شامل کر دی گئی تھی۔ رام باغ کبھی بہت بڑا تھا: جہاں اب رام باغ دروازہ تھا وہاں سے شروع ہوتا تھا۔ دروازے کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ وہ شہر سے باغ میں داخل ہونے کا دروازہ تھا اور جس جگہ ہم کھڑے تھے وہاں سے زیادہ نہیں تو پون میل دور ہوگا۔ انگریزوں نے اسی باغ کو چھوٹا کر کے اس کا نام کمپنی باغ رکھ دیا تھا۔

لیکن اس کا نام کمپنی باغ کیوں ہے؟ کیا کسی کمپنی کو اس کا ٹھیکا دے دیا گیا تھا جو ٹکٹ لگا کر پیسے کماتی تھی؟"

"پتا نہیں انگریزوں نے اس کا نام کمپنی باغ کیوں رکھا۔ کمیٹی باغ رکھ دیتے، اس کمیٹی کے نام پر جو باغ کا انتظام چلاتی ہے، تب بھی کوئی بات تھی۔ یا چوں کہ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں یہاں سیر کرنے آتے ہیں اس لیے کمپنی باغ نام رکھا ہوگا۔'

'یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیلا بھی کوئی سیر کرنے آسکتا ہے، جیسے تم۔

کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔ ہم اسی اُدھیڑبن میں آگے چل پڑے۔ اتنے میں ایک بگھی سکول کے بچوں کو گھر لے جاتی ہوئی وہاں سے گزری۔ کچھ وقفے کے بعد دو بگھیاں اور گزریں۔

میں نے کہا: 'اسکولوں میں چھٹی ہو گئی۔ چلو واپس چلیں۔'

'چھوٹے بچوں کی چھٹی جلدی ہو جاتی ہے۔ ہمارے سکول کی چھٹی تو ظہر کی اذان کے وقت ہوتی ہے۔ ابھی دیر ہے۔ تو فکر نہ کر، بس قدم ذرا تیز کر دے۔"

ہماری عمر کے پانچ چھ لڑکے بستے لیے، صاف ستھرے خاکی نیکر اور سفید قمیصیں پہنے، بائیسکلوں پر ہمارے پاس سے انگریزی میں باتیں کرتے ہوئے گزرے۔ احسان نے پوچھا: 'جانتے ہو یہ کس اسکول کے لڑکے ہیں؟'

"نہیں۔"

'مال روڈ کے آخر میں عیسائی مشنریوں کا اسکول ہے، وہاں کے ہیں۔ پتا ہے وہاں پہلی جماعت سے انگریزی شروع ہو جاتی ہے اور سب مضمون انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں۔'

'یار، اردو کو انگریزی میں کیسے پڑھاتے ہوں گے؟'

'ابے تو، نہیں اردو پڑھنے پڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔ افسر بننے کے لیے انگریزی آنی چاہیے۔ دیکھنا جب جرمن آجائیں گے تو انہیں نانی یاد آجائے گی۔ بیچارے ہمارے برابر ہو کر رہ جائیں گے، جرمن نہ انہیں آتی ہوگی نہ ہمیں۔ بیٹھ کر رویا کریں گے کہ انگریزی پڑھنے میں فضول وقت ضائع کیا، اس سے تو کچھ سیر تفریح ہی کر لیتے تو اچھا تھا۔ سعید، تیرے خیال میں اس اسکول کی فیس کتنی ہوگی؟

میں نے بہت سوچ کر لمبی چھلانگ لگائی۔ 'کوئی دس روپے مہینا ہوگی۔

دس روپے مہینا؟ پاگل ہوا ہے؟ پچاس روپے مہینا ہے۔ کچھ ہوش ٹھکانے آئے؟'

'نہیں یار! اتنی تو میرے باپ کی مہینے بھر کی تنخواہ ہے۔'

'اسی لیے تو تم اُس یتیم خانے جیسے سکول میں پڑھتے ہو۔ ان کا اسکول دیکھو تو لگتا ہے جیسے کسی بڑے سے باغ میں بنا ہوا کوئی بنگلہ ہو۔"

Scanned with CamScanner

"تجھے یہ سب بتایا کس نے؟"

اسکول تو میں نے اس طرح دیکھا کہ ایک دن مال روڈ پر گھومتا گھامتا ادھر نکل گیا تھا۔ تو نے لالہ کرشن لال وکیل کا نام سنا ہے جو سٹی کانگریس کے صدر ہیں؟"

"نہیں۔"

کوئی بات نہیں۔ میں اور فرمان پہلے ان کے بنگلے پر صفیہ کو نوکر کرانے جاتے تھے۔ پھر جب نوکری سے نکل گئی تو بحال کرانے جانے لگے۔ وہاں ان کے بیٹے کشور سے میری دوستی ہو گئی۔ وہ بھی اسی اسکول میں پڑھتا ہے۔ اُسی سے یہ سب کچھ معلوم ہوا۔"

"تم اب بھی وہاں جاتے ہو؟"

نہیں۔ کوئی مشکل آ پڑے تو جاتا ہوں۔ وہ بڑی ہمدردی کرتے ہیں۔"

ہم کمپنی باغ کے مشرقی دروازے سے باہر نکل کر دھوپ اور گرمی کی شدت سے ویران پتلی سی مال روڈ کو پار کر کے ٹھنڈی کھوہی پہنچ گئے۔ گھنے سبز درختوں کے جھنڈ میں ٹین کے شیڈ کے نیچے کوئی سات فٹ قطر کی چھوٹی سی کھوہی تھی جس کے منہ کے درمیان لکڑی کے تختے لگا کر سے دو حصوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ ایک طرف ہندو سکھ اور دوسری طرف مسلمان پانی کا انتظام تھا۔ کھوہی کی منڈیر زمین سے کوئی چار فٹ اونچی ہو گی۔ اس منڈیر کے گرداگرد چبوترا بنا ہوا تھا۔ ہندوؤں کی طرف ایک آدمی دن بھر چبوترے پر بیٹھا شیشے کے گلاسوں میں پانی پلایا کرتا، دوسری طرف لوہے کے ڈرم کے ساتھ ٹین کا گلاس زنجیر سے بندھا چبوترے پر دھرا مسلمانوں کی خدمت کیا کرتا۔ شام میں جب سیر کرنے والوں کا بہت ہجوم ہوتا تو ایک مسلمان ملازم بھی موجود ہوتا۔ اس ایک ڈیڑھ کنال کے احاطے میں مشرق کی نہر سے پانی لانے والا ایک نالا بہتا تھا۔ نالے کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مغربی کونے میں ایک ہندو کی دکان تھی جو شام کے وقت پوریاں بیچتا اور ہندو مسلمان بلا تخصیص کھاتے۔ اس وقت ٹین کے ایک کنستر میں چنے اور ایک کڑھائی میں آلو اُبل رہے تھے۔ دو ملازم میدہ گوندھ رہے تھے۔ دکان کا مالک ٹین کی کرسی پر بیٹھا لاہور سے نکلنے والا ہندوؤں کا اخبار "ویر بھارت" پڑھ رہا تھا۔ ہم نے زنجیر سے بندھے گلاس سے جی بھر کے پانی پیا۔ پانی اتنا ٹھنڈا اور میٹھا تھا کہ طبیعت شاداب ہو گئی۔ ہمیشہ حیرت ہوتی تھی کہ اتنی گرمی میں کھوہی سے بغیر برف کے برف سے بھی ٹھنڈا پانی کیوں کر نکلتا ہے۔ آج پھر حیرت ہوئی۔ احسان نے پوچھا: "کیوں، اخبار بانٹ یہاں آتا؟"

"ہاں۔"

میں ذرا ان سے اخبار لے کر آتا ہوں۔" وہ جا کر اخبار لے آیا اور ہم دونوں نالے کے کنارے بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ اخبار میں جنگوں کی خبریں تھیں کہ برما کی سرحد پر، آسام کی پہاڑیوں،

Scanned with CamScanner

اسپال کے قبائلی علاقے اور دوسرے علاقوں میں جاپانی فوجوں کی اتحادی فوجوں سے جھڑپیں ہو رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے بعد احسان کا دوسرا ہیرو انگریزوں کے خلاف پے در پے فتوحات حاصل کرنے والا جنرل رومیل تھا۔ اس کا ایمان تھا کہ وہ قطعی طور پر ناقابلِ شکست ہے، اور اس کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ اب اسے تصویروں میں رومیل کے سر کے گرد ہالہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ رومیل چوں کہ افریقا کے محاذ پر شکست کھا کر، فوجوں کو اٹلی پہنچانے کے بعد، خود برلن واپس جا چکا تھا اور وہاں فی الحال قطعی خاموش تھا اس لیے اُس کے بارے میں کوئی خبر اخبار میں کیسے ہوتی۔ احسان نے مجھ سے اخبار لے کر اول تا آخر پھر دیکھا۔ اس کے مطلوبہ موضوع پر کچھ نہیں تھا۔ مایوس ہوا۔ "میں نہیں مانتا کہ اُسے وہاں شکست ہوئی۔ وہ محض جنگی چال کے طور پر پیچھے ہٹ گیا ہو گا۔ اور اگر واقعی اسے شکست ہوئی ہے تو ضرور ہٹلر نے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے۔ وہ اس کی فتوحات سے جل گیا ہے۔ رومیل کو افریقا واپس جا کر مصر کو فتح کرنا پڑے گا۔ جب تک سویز پر اس کا مکمل قبضہ نہیں ہو جاتا تب تک جاپانی فوج اور انڈین نیشنل آرمی مل کر برما کے راستے ہندوستان پر حملہ نہیں کر سکتے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکالا نہیں جا سکتا۔"

اندر کے صفحے پر قحط بنگال کی خبر اور تین تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر تھی کہ بڑ کے بہت بڑے درخت کے نیچے ایک ادھ ننگی عورت، ہڈیوں کا ڈھانچا، مری پڑی ہے۔ اس کے سرہانے ایک چھوٹی سی گٹھری دھری ہے۔ ایک ویسا ہی سوکھا سڑا بچہ پاس بیٹھا اسے جگانے کی کوشش کر رہا ہے اور دو آدمی، سائیکل پر سوار، لاش اور بچے کے پاس سے گزرے چلے جا رہے ہیں۔ دوسری تصویر میں کسی سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی اوندھے منہ زمین پر گرا پڑا ہے۔ ایک ہاتھ میں لاٹھی تھامے ہوئے ہے۔ شاید مر چکا ہے یا ابھی مر رہا ہے۔ فاقہ زدہ نیم برہنہ انسانوں کا قافلہ اسے وہیں چھوڑ کر اس کے پاس سے گزرتا جا رہا ہے۔ تیسری تصویر فاقوں کی ماری دس گیارہ سالہ لڑکی کی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب اور بے بسی تھی۔ اس کے جھکے کندھے، لٹکتے بازو، ڈھلکتی گردن، سب اس کے قابو سے باہر تھے۔ بس اس کی بڑی بڑی، ویران اور خشک آنکھوں میں کہیں زندگی کی جھلک باقی تھی۔

میں نے کہا: "اس کی آنکھوں میں امید ہے۔ اب بھی امداد مل جائے تو شاید بچ جائے۔"

"میں نے اپنے باپ کو مرنے سے چار دن پہلے جیل میں دیکھا تھا۔ تپ دق سے اس کا بدن اسی لڑکی کی طرح سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی بات تھی لیکن وہ مر رہا تھا اور چار دن بعد مر گیا۔ آنکھیں شاید سب سے آخر میں مرتی ہیں۔"

میں اخبار میں قحط کی خبر پڑھنے لگا جس میں چاول کے ذخائر غیر ذمہ دارانہ طور پر محاذ پر اور بیرونِ ملک بھیج دینے کو قحط کی وجہ بتایا گیا تھا اور بنگال کی مسلم لیگی حکومت کو قحط کے ماروں کی

Scanned with CamScanner

امداد کے لیے کوئی قدم نہ اٹھانے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا۔ احسان کے خیال میں مسلم لیگ انگریزوں کی پٹھو جماعت تھی اور انگریزوں کے نزدیک تمام کے تمام چالیس کروڑ ہندوستانیوں کے بھوک کے مر جانے کی بھی کوئی حیثیت نہ تھی۔

"انگریز کے نزدیک ہم انسان تھوڑا ہی ہیں، کیڑے مکوڑے ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے بنگال چلا جاؤں۔"

"تمہارے پاس بھوکوں کو کھلانے کے لیے کچھ ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ جہاں وہ مر رہے ہیں وہاں میں بھی ان کے ساتھ مر جاؤں گا۔"

میں نے دیکھا مولوی مالے کے نزدیک پیشاب کر کے کھڑا اوٹوانی کر رہا ہے۔ میں نے احسان سے کہا: "اٹھو چلیں۔ مولوی عصر کی اذان کی تیاری کر رہا ہے۔"

احسان نے اخبار لالہ کو واپس کیا اور ہم نے دیکھا کہ دکان کے اندر پوریوں کا میدہ گندھ کر تیار ہو چکا ہے۔

ہم بستے بغل میں دبائے، کمپنی باغ کے ساتھ ساتھ چلتی مال روڈ پر تیز تیز واپس چل پڑے۔ احسان پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا، مگر میرے ذہن میں ایک ہی خیال چکر کاٹ رہا تھا کہ احسان جو پنجاب میں بھی بھوکا رہتا ہے اسے بنگال جانے کی کیا ضرورت ہے، وہ تو ایک دن یہیں بھوک سے مر جائے گا۔ ہم گرلز کالج کے سامنے پہنچے تو لڑکیاں تانگوں اور بگھیوں میں سوار ہو کر گھروں کو جا رہی تھیں۔ کچھ ہم جیسی بے چاریاں دھوپ میں جھلستی پیدل چل رہی تھیں۔ کالج کے سامنے واقع باغ کے دوسرے مشرقی دروازے سے ہم یک بار پھر باغ کے اندر پہنچ گئے۔ لڑکیوں کے ایک گروہ کے پاس سے گزر کر ہم آگے نکل گئے۔ ایک بار بھی پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت نہ پڑی۔ ایک تو دھوپ بہت تیز تھی، دوسرے فطرت نے ابھی ہماری آنکھوں کے اندر وہ شیشے فٹ نہ کیے تھے جن میں سے لڑکیاں ایک دم بھڑکتی ہوئی، رنگین نظر آنے لگتی ہیں؛ لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ بالکل متوجہ ہی نہ کرتی ہوں۔ وہ ہمیں کچھ کچھ کسی سنیما کے سامنے لگی ہوا میں پھڑپھڑاتی کاغذی جھنڈیوں جیسی لگتی تھیں۔ تیز ہوا کے زور سے ان جھنڈیوں میں سے کچھ پھٹ پھٹا کر اڑ بھی جاتی تھیں جن کا ہمیں کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا۔ ویسے ان دنوں ہمارے ذہن کے بل میں سے کچھ اس طرح کی باتیں نکل کر سرسراتی پھرتی تھیں کہ کیوں نہ سر کے بل کھڑے ہو کر انہیں زور سے پکارا جائے۔ سڑک سے ذرا ہٹ کر مجھے سگریٹ کی ایک خالی ڈبیا پڑی دکھائی دی۔ میں دوڑ کر احسان کے لیے اٹھا لایا۔ وہ اسے دیکھ کر کہنے لگا: "بے کار ہے۔ اس جیسی دو تین میرے پاس پہلے ہی موجود ہیں۔ پھینک دو۔" اپنے تحفے کے رد کیے جانے پر میں نے اس کی طرف دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری نظریں بھوکے بچے کی سی تھیں جو کھانے والے کو روٹی کے ایک ٹکڑے کی طلب میں گھور رہا ہو۔ احسان

Scanned with CamScanner

بولا: "نئے سے نئی، عجیب و غریب ڈبیاں، حیرت انگیز مارکوں اور تصویروں والی، صرف ریلوے لائن کے آس پاس پڑی ملتی ہیں۔ وہیں تلاش کریں گے۔"

وہیں پھاٹک پر پہنچ کر ریلوے لائنوں کے ذرا سا بل کھا کر پیچھے ہوئے بھرت کے کنارے کنارے چلتا، کچے راستے پر زمین کے قریب آؤٹر سگنل تک پہنچتے تاروں سے بچتا، اپنے گھر کی طرف ہو لیا جو آؤٹر سگنل سے بھی ڈیڑھ سو گز آگے، ریلوے لائن کی طرف منہ کیے، پانچ سات چھوٹے چھوٹے بے حیثیت مکانوں کی قطار کا سب سے اگلا مکان تھا۔ اس بستی کے تینوں طرف پھلوں کے باغ تھے، سامنے ریلوے لائن، پھر شریف پورہ اور باقی شہر تھا۔ شریف پورہ محلے کے مکان ریلوے لائن کی جانب ایک اونچی اندھی دیوار کی صورت پشت دیے کھڑے تھے۔ میں نے پھاٹکوں کے درمیان ریلوے لائن پر رک کر احسان کو جاتے ہوئے دیکھا۔ سلیٹی پتھروں کی موٹی روڑی کے بنے چبوترے پر تپتی ہوئی چھ کی چھ پٹریاں دھوپ کو تلواروں کی صورت واپس دھوپ کے سمندر میں اچھالنے کے بے کار کام میں مصروف تھیں۔ آنکھوں کو اندھا کرتی اس چمک میں وہ آلوچوں کے باغ کی گرد آلود، مردہ ہریالی کے نیچے بھنگ باتھو کی سبز رنگ جنگلی بوٹیوں کے ساتھ ساتھ چلا جا رہا تھا۔ ہر قدم پر سلیپروں کی ٹپ ٹپ کے ساتھ بھٹی کی ریت جیسی گرم دھول اڑ کر دوبارہ اس کے پاؤں پر برستی۔ اڑتے ہوئے نیلے رنگ کے تپتے آسمان پر دور، راستہ روکے ہوئے بازو کی طرح تنا سفید آؤٹر سگنل نظر آ رہا تھا۔ اس ٹھہرے ہوئے، ویران اور کھلے کھیت میں میری نظروں کے سامنے صرف ایک ہی انسان موجود تھا، اور وہ جنوب مغرب کی طرف جھکتے سورج کی طرف، کسی پاندھی کی طرح گردن جھکائے، منہ پر سیدھی دھوپ جھیلتا چلا جا رہا تھا۔

احسان کے مکان کا کرایہ پانچ روپے مہینا تھا۔ اس میں سامنے کی طرف دو ستونوں اور پکے فرش والا چھوٹا سا نکوما برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے دونوں کمروں، صحن اور ڈیوڑھی کا فرش کچا تھا۔ سیڑھیوں کے نیچے کی خالی جگہ پر دروازہ لگا کر غسل خانہ بنا دیا گیا تھا۔ میونسپل کمیٹی نے اس بستی سے کوئی تعلق نہ رکھا تھا۔ نالیاں گھروں میں سے نکل کر اطراف کی کسی بھی نیچی جگہ میں جا سماتیں۔ بجلی یہاں ابھی نہیں پہنچی تھی، گرچہ شہر میں پہنچے اسے تیس سال ہو چکے تھے۔ احسان کی ماں ہنستے ہوئے مجھ سے کہتیں: "وے سعید، اپنے باپ سے کہنا ہمیں مٹی کے تیل کا پرمٹ تو لے دے۔ پورے پیپے کا لکھنا۔ اس کے لیے کیا مشکل ہے۔ ڈی سی کے ساتھ کام کرتا ہے۔ اچھا، میں خود ہی تمہارے گھر آ کر اسے کہوں گی۔" لیکن اس کام کے لیے آئیں کبھی نہیں۔ انہیں دیکھ کر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی کہ کتنا بہت سا دکھ انھوں نے اکیلے جھیلا اور پھر بھی ان میں ہمت ہے کہ اپنے بغیر دانتوں کے منہ سے ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں۔ جب کھل کر ہنستیں تو منہ پر دوپٹہ رکھ لیتیں۔ بڑا سا چہرہ تھا ان کا، اور کھلی پیشانی تھی۔ موتیا کے کھلے پھولوں کا سا صاف شفاف رنگ تھا اور بدن

Scanned with CamScanner

بھاری بھر کم تھا۔ مجھے وہ بڑی بہت لگتی تھی۔ ان کا اجلا سفید کرتا پسینے سے بھیگ کر پیٹھ سے چپکا ہوتا اور ایک ہاتھ میں پنکھی مسلسل چلتی رہتی۔ احسان کے باپ کی شہر کے اندر بہت بڑی تین منزلہ حویلی تھی جو ان کے والد نے اچھے وقتوں میں بنوائی تھی۔ ان کے نوکری سے نکالے جانے کے بعد گھر کا خرچ چلانے، مقدمات کی پیروی کرنے اور دور دراز کے جیل خانوں میں ملاقات کے لیے جانے کے سلسلے میں آخر بک گئی، اور یہ لوگ سو روپے ماہانہ کی قدر و قیمت والی حویلی چھوڑ کر پانچ روپے ماہانہ کرائے کے مکان میں اٹھ آئے۔

گلی میں پہنچتے ہی ہر سہ پہر کی طرح ایک بوجھل، باسی بو میرے نتھنوں میں آگھسی۔ چوک میں واقع اپنے مکان کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ چڑھ کر میں پہلے اپنے کمرے میں پہنچا جس کی کھڑکیاں دوسری طرف سے آنے والی گلی میں کھلتی تھیں۔ بستہ رکھا۔ پھر واپس آ کر ایک منزل اور اوپر گیا۔ ماں کمرے میں دونوں چھوٹی بہنوں کو دائیں بائیں لٹائے بے سدھ سو رہی تھی۔ پنکھی ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے صحن کے درمیان لوہے کی سلاخوں کا جنگلا جڑا تھا۔ ان سلاخوں میں سے چھوٹی چیزیں اور بچوں کی ٹانگیں عموماً نکل جاتی تھیں۔ چیزیں تو سیدھی نیچے کے صحن میں پہنچتیں۔ بچے دھم سے گر کر جنگلے سے ٹکراتے، چند منٹ روتے، اور آئندہ کنارے کنارے چلنا سیکھ لیتے۔ میں اس کے اوپر سے گزر کر کونے میں بنے چولھے کے پاس پہنچا۔ پہلے مٹی کے کورے گھڑے سے ایک گلاس پانی غٹ غٹ پیا۔ چنگیر میں دو روٹیاں اور تانبے کے منقش کٹورے میں کچھ شوربہ، دو آلو اور ایک ننھی سی بوٹی میرے حصے کی پڑی تھی۔ میرے سر میں درد تھا۔ صرف چند نوالے کھا سکا۔ سامنے ایک رسی پر میرے باپ کی دو قمیصیں اور پتلونیں، سوکھ کر پاپڑ ہوئی، ہوا سے کھڑکھڑا رہی تھیں۔ چار بجے میری ماں، آدھی سوئی آدھی جاگی، اٹھ کر کوئلوں کی استری گرم کر کے ان پر استری کرے گی۔

چند مہینوں بعد گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور اسکول بند ہو گیا۔ سوائے اتوار کے میں اور احسان صبح سے سہ پہر تک اکٹھے رہتے۔ ہر صبح احسان میرے گھر آ جاتا اور ہم دونوں میرے نچلی چھت والے کمرے میں زیادہ تر گپیں مارتے اور تھوڑا بہت چھٹیوں کے لیے دیا گیا سکول کا کام کر لیتے۔ میں کہانیوں کی کوئی کتاب پڑھنے لگتا جو سیر و سیاحت کی پرانی کتابیں بیچنے والے ایک ریڑھی والے سے خریدی تھیں۔ احسان کو قصے کہانیوں کا کوئی شوق نہ تھا۔ دیووں، پریوں کی داستانیں، شہزادوں کی مشکلات اور ہجر کی ماری شہزادیوں کے مصائب اس کے نزدیک بے معنی باتیں تھیں۔ اسے ٹھوس حقائق جاننے کے لیے تاریخ اور سیاست

Scanned with CamScanner

جیسے موضوعات پر کتابیں پڑھنے کی خواہش رہتی، مگر وہ ہماری دسترس سے باہر تھیں اور مجھے ان سے بالکل لگاؤ نہ تھا۔ کبھی ہم وہاں سے اٹھتے اور شہر کے دور دراز علاقوں میں سیر گشت کو نکل جاتے۔ مجھے باپ کے آنے سے پہلے گھر پہنچنا ہوتا تھا، اور اتنی ہی ضروری بات یہ تھی کہ اس وقت تک احسان گھر سے غائب ہو چکا ہو۔ احسان کا تو میں نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھ پر پڑھائی یا گھر کے کام کا کوئی خاص دباؤ نہیں تھا، مناسب آزادی بھی میسر تھی لیکن طبیعت ایک نئی طرح کی بے اطمینانی اور ناآسودگی سے بےچین سی رہنے لگی تھی۔ دل چاہتا کہ کچھ ہو، مگر کیا؟ یہ کبھی کھل کر سامنے نہ آتا، بکھرے بادلوں کی دھند میں چھپا رہتا۔ ماں باپ کی باتیں جھوٹی اور جعلی محسوس ہونے لگی تھیں۔ گھر برا لگنے لگا تھا۔ کیا اسے چھوڑ کر کہیں بھاگ نہ جانا چاہیے؟ ایک دن چھوٹی بہنوں کی گڑیوں کا ڈبہ میرے ہاتھ آ گیا۔ میں نے انہیں قینچی سے ذرا ذرا کتر ڈالا۔ بہنیں روئیں، ماں ناراض ہوئی۔ میں اطمینان سے مسکراتا رہا، پھر سیڑھیاں اتر کر گلی میں چلا گیا۔

میرے کمرے کی سلاخیں جڑی کھڑکیاں آٹھ دس فٹ نیچے گلی میں کھلتی تھیں۔ اٹھارہ فٹ چوڑی گلی کے دوسرے کنارے پر ہماری کھڑکیوں کے بالمقابل ایک بہت بڑا مکان تھا جو میرے کمرے کی چھت کے پست ہونے کی وجہ سے اور بھی بلند ہونے کا تاثر دیتا۔ اس کی دروازہ نما، اونچی اور بڑی بڑی چار کھڑکیاں، ہماری کھڑکیوں سے قدرے اوپر اسی گلی میں کھلتی تھیں۔ وہ باس کی تیلیوں کی بنی زرد چقوں سے ڈھنپی رہتیں۔ اس گھر میں ہماری عمر کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ ایک سوکھی سڑی، سانولی سی لڑکی پروین ہماری ہم عمر تھی جو اب ہماری طرح آٹھویں جماعت میں پہنچ چکی تھی۔ باقی دن بھر میں وہاں کوئی نظر آتا تو مختلف عمروں کی چند عورتیں۔ رات میں دو تین مرد دن کے کام سے تھکے ہارے مکان میں جاتے دکھائی دیتے۔ پہلے تو پروین لڑکی کیا، کسی اچھی لڑکی کی دم بھی نہیں لگتی تھی۔ مریل چوہیا سی صبح صبح ہاتھ میں کٹورا لیے، ننگے سر، ننگے پاؤں لاتی، گنگناتی، دہی لینے جا رہی ہوتی۔ ہر شام سیپارہ تھامے مولوی داؤد شربت والے سے سبق لینے پہنچی ہوتی۔ امیروں کی بیٹی تھی اس لیے کھڑے کھڑے دو چار منٹ میں سبق لے کر واپس چلی جاتی جبکہ پچیس تیس دوسرے لڑکے لڑکیاں مولوی کی دکان اور قریب کی دوسری دکانوں کے ساتھ بنے تھڑوں کے پھٹوں پر بیٹھے گھنٹوں مل مل کر بلند آواز میں سبق یاد کرتے رہتے۔ ادھر کچھ دنوں سے میں نے محسوس کیا تھا کہ پروین کچھ کچھ عورت سی لگنے لگی ہے۔ چال سنبھل گئی، دوپٹا سر پہ آ گیا، نظریں نیچی ہو گئیں۔ اسے یوں گلی میں جاتا دیکھ کر مجھے بہت رحم آتا۔ زرد چقوں کے پیچھے کبھی رنگین آنچل جھلکتا، کسی رخنوں سے چوڑی کی ہوئی تیلیوں کے درمیان سے سیاہ آنکھیں ہمارا اور کمرے کا جائزہ لے رہی ہوتیں۔ مجھے بہت غصہ آتا کہ پروین ابھی برقعے میں ڈھانپی نہیں گئی اور اس گھر کی عورتوں میں سے کوئی مجھ سے پردہ نہیں کرتی، تو پھر یوں چھپ چھپ کر جھانکنے کا کیا مطلب۔ شاید وہ ہمیں

Scanned with CamScanner

ایسی حالت میں دیکھنا چاہتی تھی جب ہمیں گمان تک نہ ہو کہ کوئی ہمیں دیکھ رہا ہے۔

ایک دن میں اور احسان صبح سے چٹائی پر بیزار پڑے تھے۔ ہمارے ارد گرد کتابیں اور کاپیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ہم دو لاشوں کی طرح بے سدھ تھے۔ تھکے ہوئے بھی نہیں تھے، سو بھی نہیں رہے تھے۔ اس دوران ہم نے کروٹ لیا کیا، انگلی تک نہ ہلائی تھی۔ ہم نہ اداس تھے نہ غمگین، بس بیزار تھے اور بیزاری سے ہماری روحیں ٹھٹھر کر سُن ہو چکی تھیں اور ہمارے ذہن اور بدن اس کے سامنے بے دست و پا تھے۔ نیچے گلی زندہ تھی، اوپر کی منزل پر میرا گھر زندہ تھا۔ سامنے والے گھر میں ریڈیو پر فلمی گانے بج رہے تھے۔ جب کبھی ایسا موقع آتا، ہم ایک گانا بدن کے روئیں روئیں سے اپنے میں جذب کیا کرتے تھے۔ اس وقت کانن بالا ڈال ڈال پہ پھدکنے والی کوئل کی طرح شوخ و رسیلی آواز میں گا رہی تھی۔ ہمارا یہ پسندیدہ گانا بھی اس وقت ہمارے منجمد جذبات میں کسی قسم کا ارتعاش پیدا نہ کر سکا۔ اس وقت ہم میں نہ زندہ رہنے کی خواہش تھی نہ مرنے کی آرزو۔ بہت دیر تک ہم یوں ہی بیزاری کی جھیل کی ٹھہری ہوئی سطح پر دو مُردہ جسموں کی طرح پڑے تیرتے رہے۔ آخر کار میں کرۂ ارض کی کشش سے باہر نکلنے والے راکٹ کی مانند نئی توانائی زور لاتے ہوئے جھرجھری لے کر اٹھا اور نیند میں چلنے والے کسی آدمی کی طرح آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر گیا، باپ کی ایک نالی بندوق غلاف میں سے نکالی، کارتوس پیٹی میں سے کھینچا اور اسی طرح کمرے میں واپس آ گیا۔ چٹائی پر بیٹھتے ہوئے احسان سے کہا:

"دیکھو، یہ بندوق ہے۔ ابھی اسے چلاؤں گا تو زور کا دھماکا ہوگا۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھا، یہ دیکھنے کے لیے کہ کون اجنبی کمرے میں بول رہا ہے۔ اپنی آواز اور اس کی لرزش میرے لیے بھی نئی تھی۔ میں کہہ رہا تھا: یہ کارتوس ہے۔ یوں بندوق کھول کر اس میں ڈالتے ہیں۔ احسان چیخا: نہ چلانا، نہ چلانا۔ کسی کو لگ جائے گی۔ میں نے بندوق کھٹاک سے بند کی۔ یہ سیفٹی لاک ہے۔ اب کھل گیا۔ یہ گھوڑا ہے۔ چڑھ گیا۔ احسان نے پیچھے بیٹھے ہاتھ مار کر نالی کا رخ اوپر کر دیا۔ بندوق میرے ہاتھ سے پھسل کر پیچھے کی طرف اُڑی۔ پہلے اس کا کندا دیوار سے ٹکرایا اور پھر وہ چٹائی پر مردہ سی ہو کر گر گئی۔ کمرہ بارود کے دھوئیں سے اتنا بھر گیا کہ ہم کھانسنے لگے۔ دماغ شل تھے، کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ گلی میں سے حسینے پر چون فروش اور پیچھے تسالی سے گھبرا کر آوازیں دیں: باؤ سعید، کیا ہوا؟ وے، بول تو سہی!

"کچھ نہیں چاچا، پٹاخا چل گیا۔"

سامنے کوٹھی میں پروین کی ماں، بڑی بہن، بھاوج، تین بچے اور خود پروین، خوف کی تصویریں بنے کھڑے تھے۔ اس کی ماں میری ماں کو آوازیں دے رہی تھی: سعید کی ماں، کیا ہوا؟ میں نے کوٹھی میں آ کر کہا: جی، پٹاخا چل گیا ہے۔

"وے سعید، کوئی پسے زور کے پٹاخے گھر کے اندر بھی چلایا کرتا ہے؟ تجھے ایسی ہی تکلیف تھی تو گلی میں چلاتا۔ پاگل، خواہ مخواہ میں جان نکال دی۔"

ننگے سر، ننگے پاؤں سیڑھیوں پر سے دھپ دھپ کرتی میری پریشان حال ماں سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس کے سینے میں سانس سما نہیں رہا تھا۔ "کسی کو چوٹ تو نہیں آئی؟"

"نہیں چاچی، بچ ہی گئے۔" احسان بولا۔

"اللہ تیرا شکر" کہتے ہوئے وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے دھم سے چٹائی پر گر سی گئی۔ یہاں پٹاخے کا بہانہ بھی نہیں چل سکتا تھا کیوں کہ جرم کے ثبوت کے طور پر، مقتول کی لاش کی طرح، بندوق چٹائی پر پڑی تھی اور سامنے دیوار پر سے چھ انچ کے قطر میں پلستر اکھڑ کر فرش پر ڈھیر تھا اور اس کے ساتھ ہی سلگتی ہوئی رسی پڑی تھی۔

"چلالی بندوق؟ چین آ گیا تجھے؟ کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے؟ تیرے ابا نے آج آ کر تیری کھال نہ کھینچ لی تو کہنا۔"

میں کچھ کچھ شرمندہ تھا اور شام کی بازپرس کے خیال سے ڈر رہا تھا۔ لیکن سب چیزوں کے باوجود، اپنی مرضی سے کچھ کر گزرنے پر جو ہنگامہ ہوا اور بیزاری کے ختم ہونے سے طمانیت کا جو احساس ہوا وہ مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

احسان کے چہرے پر خوف اور حیرانی دیکھ کر مجھے اس سے زیادہ حیرت ہو رہی تھی کہ اسے بیزاری کا تسلسل ٹوٹنے پر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ یا شاید وہ بیزار نہیں تھا، میں نے خود ہی فرض کر لیا تھا کہ وہ بھی میری طرح بیزار ہے۔ شاید وہ چٹائی پر لیٹا صرف خواب دیکھ رہا تھا جس میں اُس کا ماضی وہ نہ تھا جیسا حقیقت میں گزرا۔ اُس کے باپ نے نہ کبھی کانگریس میں شمولیت کی، نہ کبھی قید ہوا، نہ کبھی وہ اور اُس کی ماں جیل خانوں میں ملاقاتوں کے لیے دھکے کھاتے پھرے اور نہ اس کا باپ مرا۔ وہ تحصیل دار تھا، اور اب بھی ہے۔ وہ سب ابھی تک اپنی آبائی حویلی میں رہتے آ رہے ہیں۔ ان کے پاس گھوڑا گاڑی ہے اور سب ہر شام اس میں بیٹھ کر ٹھنڈی کھوہی پوریاں کھانے جاتے ہیں۔ ہر صبح وہ بوٹ پہن کر، فرمان کی طرح دو پراٹھوں کا ناشتا کر کے، گڑ کی نہیں چینی کی چائے پی کر، اپنی سائیکل پر سوار ہو کر انگریزی اسکول میں پڑھنے جاتا ہے۔

ماں نے احسان سے کہا: "ساتے، اٹھ اور چل اپنے گھر۔ اب ادھر کا رخ کیا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ صبح صبح یوں چوروں کی طرح کمرے میں آ جاتا ہے کہ کسی کو پتا نہیں چلنے دیتا۔ دنیا بھر کا نکما، اب اس کا بھی بیڑا غرق کر رہا ہے۔ کمرے میں جو گھستا ہے تو جانے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

احسان نے چٹائی پر سے اٹھ کر سلیپر پہنے اور سیڑھیاں کرتا چلا گیا۔

پہلے احسان میری طرف آیا کرتا تھا، اب میں اس کی طرف جانے لگا۔ ایک دن ہم اس کے گھر سے نکل کر ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ چالیس کھوہ دیکھنے چل پڑے۔ احسان نے کہا بھی کہ بہت دور ہیں مگر میں نہ مانا۔ میرے لیے چالیس کھوہ ان دنوں علی بابا چالیس چور کی مناسبت سے بڑی کشش رکھتے تھے۔ میں نے یہ قصہ تازہ تازہ پڑھا تھا اور مجھے یقین تھا کہ چالیس کھوہ کے ماحول میں اس قصے کی باقیات اِدھر اُدھر ضرور معلق ہوں گی۔ چالیس کھوہوں میں چالیس چوروں میں سے دو چار تو یقیناً ابھی تک لمبے جبے پہنے کہیں نہ کہیں بیٹھے ہونے چاہییں۔ علی بابا ان دنوں شہر میں آیا ہوا ہوا تو چالیس کھوہ کا نام سن کر اسے اپنے چالیس چور یاد آ گئے ہوں گے اور وہ سیدھا وہیں پہنچا ہو گا۔ شاید اس سے ملاقات ہو جائے۔ دراصل وہ چالیس ٹیوب ویل تھے جو میونسپل کمیٹی نے شہر کی پانی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے لگوائے تھے۔ انھیں چاہیے تھا کہ ہر کنویں کا نام ایک ایک چور کے نام پر رکھ دیتے۔

تھوڑی دیر تک محلہ شریف پورہ ہمارے ساتھ ساتھ رہا، پھر محلہ تحصیل پورہ آ گیا۔ اس کے گزرنے کے بعد مکانات کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گئے۔ اب دونوں طرف آم اور امرود کے گھنے باغ تھے اور ان کے درمیان سلیٹی روڑی کے لمبوترے ڈھیروں پر سیاہ پٹڑیاں حدِ افق تک دوڑتی چلی گئی تھیں۔ احسان نے بتایا کہ دائیں طرف والی دو پٹڑیوں میں سے آخری دلی سے آنے والی گاڑیوں کے لیے ہے اور دوسری دلی جانے والی گاڑیوں کے لیے۔ تیسری چالیس کھوہ کے قریب پہنچ کر ایک دم تیزی سے بائیں ہاتھ کو مڑ کر پٹھان کوٹ کی طرف نکل جائے گی۔ آتی جاتی گاڑیاں جب اس موڑ پر پہنچتی ہیں تو لمبی وسل بجاتی ہیں۔ وہاں بڑا سا بورڈ بھی لگا ہے جس پر انگریزی میں وسل لکھا ہے، اور یقیناً ڈرائیوروں کو اس کا حکم بھی ہو گا۔ ہم پگڈنڈی چھوڑ کر لوہے کی پٹڑی پر چلنے کی کوشش کرنے لگے۔ احسان کے سلیپر توازن قائم رکھنے میں حائل ہو رہے تھے، اس نے انھیں اتار کر بغل میں دبا لیا۔ چلتے چلتے وہ دو تین بار پھر لڑکھڑایا، پاؤں روڑی پر پڑے اور خون رسنے لگا۔ اس نے سلیپر پھر پہن لیے اور کہنے لگا: دھوپ تیز ہو گئی ہے۔ اسی طرح کھیلوں میں لگے رہے تو دوپہر تک واپس نہیں پہنچ سکیں گے۔ تیز چلو۔ یہاں تک آتے آتے پگڈنڈی کم استعمال ہونے کی وجہ سے بہت کم چوڑی رہ گئی تھی۔ اس پر ہم دونوں برابر برابر نہ چل سکتے تھے اس لیے آگے پیچھے چلنے لگے۔ ایک طرف روڑی بچھی ہوئی تھی اور دوسری طرف باغوں کی اونچی سطح کے ساتھ ساتھ اُگا ہوا بے تحاشا جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ باغوں میں سے کبھی کبھی رکھوالوں کی پرندوں کو اڑانے کے لیے ہو ہو کی آوازیں سنائی دیتیں۔ کبھی نزدیک اور کبھی دور سے۔ مگر ان آوازوں کا اپنا سُریلا پن تھا۔ نہ درد، نہ سوز، بس سُر تھا یا ہلکا سا غم کا شائبہ جھلکتا۔ یہ آوازیں ہمیں اچھی لگتیں۔ شاید اس جنگل میں قریب ہی دوسرے انسانوں کی موجودگی کے احساس سے ہمارے اندر سونے پن کا خوف کم ہو جاتا

ہو۔ ٹیں ٹیں کرتے تین تین چار چار توتوں کی ڈاریں اِس طرف کے باغوں سے اُڑ کر اُس طرف کے باغوں کو جاتی ہمارے سروں پر سے گزرتیں۔ سبز سبز سے تیر رو دور تک شور مچاتے نیلے آسمان کے بیک گراؤنڈ میں لٹکے چلے جاتے۔

میں نے کہا: "یار، یہ توتے چُپ رہ کر نہیں اُڑ سکتے؟ باقی پرندے بھی اُڑتے ہیں، کوئی ا۔ غُل نہیں مچاتا۔ یوں لگتا ہے جیسے ہمارا مذاق اڑا رہے ہوں۔"

"چلو، تم نے توتوں سے ہی جھگڑا کھڑا کر لیا۔ انھیں پتا چل گیا تو تمھارے سامنے درخت پر بیٹھ کے اتنا ہنسیں گے کہ تم رو پڑو گے۔"

"توتے باتیں تو کرتے ہیں۔ کیا ہنستے بھی ہیں؟"

احسان ہنس پڑا۔ اسے دیکھ کر میں بھی ہنسنے لگا بات ہنسی میں گول تو ہو گئی لیکن صاف نہ ہو سکی۔

احسان بولا: "میں اُدھر والی پگڈنڈی پر جا رہا ہوں۔ صبح سے سگریٹ کی کوئی نئی ڈبیا دکھائی نہیں دی۔ تُو بھی اِدھر ذرا آنکھیں کھول کر چلنا۔" وہ پٹریاں پار کر کے دوسری طرف چلنے لگا۔ میں نے دیکھا اُس طرف ٹیلیگراف کی تاروں پر دو تین چھوٹی چھوٹی مٹیالی چڑیاں پر پھُلائے گولا سی بنی پاس پاس بیٹھی ہیں۔ میں نے پوچھا: "احسان، اِس چڑیا کا کیا نام ہے؟"

"کال چڑی۔"

اس نے ایک پتھر اٹھا کر مارا جو ٹَن سے کھمبے پر جا لگا۔ چڑیاں تاروں کے ساتھ ساتھ اڑتی، پانی کی لہروں کی طرح اوپر نیچے ہوتی، گم ہو گئیں۔

میں نے کہا: "تو نے خواہ مخواہ چڑیاں اڑا دیں۔"

"اِدھر آ کے یہ سُن۔ ایسی چڑیاں تو آگے تاروں پہ بہت ملیں گی۔"

میں نے جا کر کھمبے سے کان لگا دیا۔

"کچھ سنائی دیا؟"

"ہاں، جھن جھن ہو رہی ہے عجیب طرح کی اور یوں لگتا ہے جیسے ابھی کچھ اور ہونے والا ہے، لیکن ہوتا کچھ بھی نہیں۔ وہی آواز آئے جاتی ہے بار بار۔"

"ابے وہ تو تاروں کی جھنجھناہٹ ہے، وہ تو اسی طرح ہوتی رہے گی۔ میں ٹَن کی آواز کا پوچھ رہا ہوں۔ کھمبے کے اندر سے عجیب بدلی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ تو نے پہنچنے میں دیر کر دی۔ اچھا اب سننا۔"

وہ ریلوے لائن سے دونوں مٹھیوں میں پتھر بھر کر لے آیا۔ میں کھمبے سے ذرا ہٹ کر تیار کھڑا ہو گیا۔ اس نے پتھر مارا، میں نے دوڑ کر کھمبے سے کان لگا دیا۔ اندر سے آتی ہوئی آوازیں باہر

جیسی چیخ کی سی کاٹ نہ رہی تھی بلکہ گونج کی گولائی کا چکنا پن آ گیا تھا۔ ہوتے ہوتے یہ گونج ختم ہو گئی۔ احسان کے اشتیاق اور اصرار سے مجھے خیال ہوا تھا کہ یہ تجربہ کانوں کی کلیڈوسکوپ قسم کی چیز ثابت ہوگا مگر کوئی خاص بات نہ نکلی۔ دوبارہ سنا، سہ بارہ سنا، میری رائے وہی رہی۔ احسان مایوس ہو کر پتھروں سے کھمبے کا نشانہ لینے لگا۔ میں بھی اس کھیل میں لگ گیا۔ طے ہوا کہ دونوں پانچ پانچ پتھر لے لیں اور پندرہ قدم کے فاصلے سے نشانہ لیں؛ جس کے زیادہ پتھر نشانے پر لگیں وہ جیت گیا۔ جانک احسان چلایا: وہ دیکھو گاڑی آ رہی ہے۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ پوری رفتار سے آتی گاڑی کی شان ہی اور تھی۔ میں یہ نظارہ زندگی میں پہلی بار دہشت زدہ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کالا انجن دھواں اڑاتا، پیچھے گرد وغبار کا طوفان اٹھاتا، بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ایک منٹ بھی نہ گزرا ہوگا کہ گولی کی سی رفتار سے ہمارے سامنے سے پہلے انجن گزرا، پھر کھٹ کھٹا کھٹ کا شور مچاتے ڈبے تیزی سے نکل گئے۔ بیسیوں کے سے چہرے اور کپڑوں کے رنگوں کی جھلک آنکھوں میں گھومی۔ زمین کانپتی رہی اور مٹی اور تنکوں سے لدی ہوئی ہوائیں چلیں جیسے ہم تیز جھکڑ کے بیچ میں ہوں۔

"یہ بمبے ایکسپریس تھی۔ ساڑھے دس بجے اس کا اسٹیشن پر پہنچنے کا وقت ہے۔ لگتا ہے ٹھیک وقت پر جا رہی ہے۔

میں نے پوچھا: احسان، کوئی ڈبیا ملی؟

نہیں۔ نایاب قسم کی ڈبیاں یہاں نہیں مل سکتیں۔ ہم اسٹیشن سے بہت دور ہو گئے ہیں نا۔ میرے مطلب کی ڈبیاں زیادہ سے زیادہ میرے گھر کے پاس تک ملتی ہیں۔ اب کسی دن اسٹیشن کے رخ دورہ کرنا پڑے گا۔"

ہم پھر پٹڑیاں پار کر کے پہلے والی پگڈنڈی پر واپس آ گئے کیوں کہ ادھر سایہ تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک ہم آگے پیچھے تیزی سے چلتے رہے کیوں کہ سفر لمبا تھا اور ہمارے پاس وقت کم رہ گیا تھا۔ ایک نالا بائیں طرف سے دو باغوں کے درمیان سے نکل کر ریلوے لائنوں پر سے پل کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ ہم پل کا تفصیلی معائنہ کرنے کے لیے رک گئے۔ ہمارا سانس پھول رہا تھا اور کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔ پل پر پٹڑیوں کے نیچے لکڑی کے بجائے لوہے کے سلیپر تھے اور ان کے درمیان کی خالی جگہ میں سے نیچے گدلا پانی تیز بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم پتھر اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینکتے رہے اور غڑپ غڑپ کی آوازوں اور پانی کے اچھلنے سے خوش ہوتے رہے۔

"مچھلیاں پکڑیں؟

احسان نے کہا: اس میں مچھلیاں ہوتیں ہی نہیں، پکڑو گے کیسے؟ میں ایک بار کوشش کر چکا ہوں، ململ کے کپڑے کا جال بنا کر۔ نہر کا بیلدار ادھر آ نکلا۔ اس نے بتایا کہ مچھلی تو ساری دریا سے نہر اور بڑی نہر پر پکڑ لیتے ہیں، یہاں پہنچتیں ہی نہیں۔

میں سے ایک سوکھا پتا پانی میں پھینکا اور اس کے ساتھ ساتھ بھاگتا دوسری طرف پہنچا۔ پتا پل کے نیچے سے گزر کر نالے میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میرا بہایا ہوا پتا آگے ہی آگے جا رہا ہے اور وہاں تک جائے گا جہاں دنیا ختم ہو جاتی ہے۔ بہت دور کے بعد پھر کچھ توتے ٹیں ٹیں کرتے ہمارے سروں کے اوپر سے گزرے۔ جب وہ ہمارے سروں پر پہنچے تو میں نے بھی گردن اونچی کر کے ٹیں ٹیں کا شور مچا دیا۔ مجھے لگا جیسے ڈار کے آخری توتے نے اپنی سرخ چونچ کو ٹکلے جیسی سیدھی، لمبی سبز دُم کے پاس لا کر مجھے دیکھا اور ہنسا۔ اس کے بعد وہ اسی طرح تیزی سے اڑتا آگے نکل گیا۔ میں نے یہ سوچ کر افسردہ ہو گیا کہ میرا یہ دوست پھر کبھی مجھے ملا تو میں اسے کیسے پہچان پاؤں گا۔ آج سمجھتا ہوں کہ دوستی تو دل میں رکھنے کی چیز ہے۔ وہ آج بھی میرا اتنا ہی اچھا دوست ہے جتنا اس لمحے تھا جب اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا تھا اور محبت سے ہنسا تھا۔

میں نے احسان سے کہا: 'اب کے پتے پر ایک چیونٹے کو بٹھا دیتے ہیں۔ وہ ہماری کشتی کا مسافر ہو گا۔'

'ٹھیک ہے۔ دو پتے جوڑ لیتے ہیں تنکوں سے۔ کھلی کھلی کشتی میں مسافر خوش رہے گا۔'

احسان باغ میں سے شہتوت کے دو پتے توڑ لایا۔ سوکھے تنکوں کی مدد سے اس نے انہیں کشتی کی شکل میں جوڑ دیا۔ ایک درخت کے تنے پر ایک موٹا سا چیونٹا اپنے کسی کام سے تیز تیز چلا جا رہا تھا۔ میں نے اسے پکڑ کر دونے میں بٹھایا اور اس چھوٹے سے دونے کو پانی میں چھوڑ دیا۔ چھوڑتے ہی دونا ٹیڑھا ہو کر چل پڑا اور اس کے پھندے میں پانی آزادی سے آنے جانے لگا۔ چیونٹا ایک بار نالے کے تیز پانی میں جان بچانے کے لیے اپنی بہت ساری بے ہنگم ٹانگیں بے بسی سے چلاتا دکھائی دیا، پھر پانی کے ریلوں میں پتا نہ چل سکا کہاں گیا۔ میں دوڑ کر دوسری طرف پہنچا۔ ٹیڑھا دونا کنارے کی گھاس میں اٹکا کھڑا تھا اور خالی تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھا پھر پھینک دیا۔ ہم جیسے چیونٹوں کی دنیا کا واسکوڈے گاما بنا رہے تھے اس کے حسرت ناک انجام پر رنج ہوا۔ دل میں ایک دوسرے سے برہم کچھ دیر افسردگی سے خاموش کھڑے رہے۔

میں نے کہا: "یار، تم بلاوجہ استادی دکھانے کی کوشش نہ کرتے تو چیونٹا پار پہنچ جاتا۔

'تم نے بھی تو نہیں بتایا کہ دونا الٹ جائے گا۔'

'میں نے سوچا تم نے پہلے تجربہ کیا ہو گا۔'

'چلو اب کے سیدھے پتے پر بٹھا کے چھوڑتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور غریب چیونٹا پکڑا گیا اور خشک پتے پر بٹھا کر پانی میں چھوڑ دیا گیا۔ وہ پل کے پار سلامت پہنچ گیا۔ ہم نے "آ گیا، آ گیا" کے نعرے بلند کیے۔ جس طرح وہ پتے کے درمیان کھڑا اپنی اگلی ٹانگیں تیزی سے مل رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ مفت کی سواری سے خوش آ رہی

Scanned with CamScanner

ہے اور نہ ہم جولی کا کوئی شوق ہے۔ اس بے وقوف کو دلی خوشی زندہ رہنے میں زیادہ دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ کچھ دور تک تو ہم نے دیکھا کہ وہ پشتے پر کسی طرح نرالی شان بیٹھا نالے کے بیچوں بیچ بہتا چلا جا رہا ہے، پھر پتا نہیں اس کا کیا انجام ہوا۔

ہم واپس آ کر نالے کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے اور پاؤں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے۔ کچھ دیر تو آرام سے بیٹھے رہے، پھر پاؤں سے پانی اچھال اچھال کر ایک دوسرے پر پھینکنے لگے۔ حسان نے ٹوپی اتار کر دور رکھ دی تاکہ بھیگ نہ جائے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کے میک اپ سے باہر نکلتے ہی وہ بالکل کوئی اور ہی شخص نظر آنے لگا۔ پانی کے چھینٹے جیسے ہی ہم پر پڑتے جسم میں زندگی کی نئی لہر دوڑ جاتی۔ جی چاہتا مخالف اور پانی پھینکے۔ اب ہم پیروں کے بجائے ہاتھوں سے پانی پھینکنے پر اتر آئے۔ سارے کپڑے تر بتر ہو گئے۔ میں نے کہا: 'اب کپڑے سکھانے چاہییں۔'

حسان بولا: "گھبراتے کیوں ہو، ابھی سوکھ جائیں گے۔ یہی تو فائدہ ہے گرمی کے موسم کا۔"

"پہنے پہنے تو سکھانا مشکل ہے۔"

'ایسا کرتے ہیں، پتھریوں کے پار چلتے ہیں۔ کپڑے اتار کر نالے میں نہائیں گے، اتنی دیر میں کپڑے سوکھ جائیں گے۔ ادھر پانی تیز ہے اور پل کے نیچے پتا نہیں کتنا گہرا ہو۔ ادھر میری ناف تک پانی آتا ہے، تمھارے زیادہ سے زیادہ چھاتی تک آ جائے گا۔'

ہم گیلے کپڑوں میں شپڑ شپڑ کرتے لانوں پر سے گزر کر دوسری طرف پہنچے۔ احسان نے کہا: 'تم یہیں کھوہ کی طرف منہ کر کے بیٹھ جاؤ اور آنکھیں بند کر لو۔ میں کپڑے نچوڑ کر دھوپ میں ڈالوں گا، پھر نالے میں کود کر کہوں گا، آنکھیں کھول دو، تب کھولنا۔ اگر تم نے ذرا بھی بے ایمانی کی تو خدا کی قسم ساری عمر نہیں بولوں گا۔'

'ایسی کیا بات ہے۔ میں نے بھی تو کپڑے دھوپ میں ڈالنے ہیں۔'

'مجھے نہیں پتا تم نے ڈالنے ہیں یا نہیں۔ وعدہ توڑا تو میں گیلے کپڑوں میں ہی گھر چل پڑوں گا۔'

"اچھا بابا، اب جا بھی۔"

مجھے یوں لگا جیسے آنکھیں بند کیے ایک صدی گزر گئی ہو۔ میں نے آواز دی: 'آنکھیں کھولوں؟'

میری پشت پر سے اس کی آواز آئی: 'کھول دو۔'

میں نے گھوم کر دیکھا تو دس گز کے فاصلے پر وہ اسی طرح کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

حیرت سے پوچھا: "کیا ہوا؟"

میرے پاس آ کر بولا: "یہ کوئلہ چننے والیاں جو چلی آ رہی تھیں۔ کیا کرتا۔"

میں نے دیکھا شہر کی طرف سے گھگھرے پہنے دو پندرہ سولہ سالہ لڑکیاں دلی سے آنے اور جانے والی لائنوں کے درمیان زمین پر نظریں گاڑے آہستہ آہستہ باتیں کرتی اور پٹریوں کے درمیان بجنوں سے گرے ادھ جلے کوئلے کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اپنے ہاتھوں سے چھوتی اور کمر پر جھولتی گٹھریوں میں ڈالتی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے ننگے پاؤں پتھریلی روڑی پر چلتے چلتے اتنے سخت ہو چکے تھے کہ احسان کے پیروں کی طرح زخمی نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ ہمارے برابر پہنچیں، پھر آگے نکل گئیں۔ میں نے کہا: "چلو، اب تو ہماری طرف ان کی پیٹھ ہے۔ تم کپڑے سوکھنے ڈال دو۔ انھیں پلٹ کر تمہاری طرف دیکھنے کی کیا ضرورت پڑے گی۔ اور تم کوئی کوئلہ بھی نہیں ہو جسے اٹھا کر وہ گٹھری میں ڈال لیں گی۔"

وہ چڑ کر کہنے لگا: "ایسا ہی ہے تو پہلے تم کپڑے اتارو۔"

میں نے قمیص اتار کر دھوپ میں ڈال دی اور پاجامے سمیت نالے میں اتر گیا۔ وہاں پانی میں پاجامہ اتار کر نچوڑا اور نالے میں کھڑے کھڑے کنارے پر دھوپ میں پھیلا دیا

احسان کہنے لگا: "یار، یہ ترکیب مجھے نہ سوجھی۔"

ہم ایک دوسرے کو تیرنا سکھانے کی کوشش کرتے رہے جو ہم دونوں کو نہیں آتی تھی، پھر نہاتے پرندوں کی طرح بہت دیر تک پانی اڑاتے رہے۔ ایک دم انجن کی بھاری دھمک نے ہمیں دہلا دیا اور تھوڑی دیر میں انجن اور ڈبے خواب کی مانند ہمارے سامنے سے گزر کر گم ہو گئے۔

احسان بولا: "گاڑیوں کی ملکہ۔ فرنٹیئر میل۔ ساڑھے گیارہ بجے اسٹیشن پر پہنچے گی۔"

میں بڑبڑایا: "سر پر سے گزری تبھی پتا چلا۔" پھر احسان سے پوچھنے لگا: "اس میں چاندی جیسی چمکتی دو بوگیاں تھیں۔ ان پر انگریزی میں کچھ لکھا تھا۔"

"ان بوگیوں کے نام لکھے تھے۔ گلِ یاسمین اور گلِ نیلوفر۔ اس موسم میں ان کے اندر دسمبر کے مہینے جتنی سردی ہوتی ہے۔ ان میں انگریز، راجے مہاراجے اور بڑے بڑے افسر سفر کرتے ہیں۔"

"برف کی سلیں رکھ کر انھیں ٹھنڈا کرتے ہوں گے۔"

"نہیں جی، مشینوں سے ٹھنڈا کرتے ہیں۔"

"گرمیوں میں ان کے اندر اتنی سردی ہوتی ہے تو سردیوں میں تو بہت ہی سردی ہوتی ہو گی۔"

احسان ہنسنے لگا۔ "سردیوں میں یہی مشینیں بوگیوں کو گرم کرتی ہیں۔"

Scanned with CamScanner

تجھے کیسے پتا ہے؟ تو نے کبھی اس بوگیوں میں سفر کیا ہے؟

مجھے محمود نے بتایا تھا۔ میرے ماموں کا بیٹا ہے۔ انگریز کی فوج میں کپتان ہے۔ وہ اسی ڈبے میں سفر کرتا ہے۔ آج کل اسپیشل بارڈر پر گیا ہوا ہے۔ آپا کہتی ہے اس سے صفیہ کی شادی کر دو۔ قربان نہیں مانتا۔

"تم کیا کہتے ہو؟"

"مجھ سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ ویسے جس انگریز نے میرے باپ کو مار ڈالا اس کی فوج میں نوکری کرنے والے سے میں اپنی بہن کی شادی پر کیسے راضی ہو سکتا ہوں۔

یہ تمہارا وہی ماموں ہے جو کبھی کبھی تمہاری ماں کو روپے دے جاتا ہے؟

ایک ہی تو ماموں ہے میرا۔

اس کی بیوی تمہارے گھر آ کر تلاشی لینا شروع کر دیتی ہے تاکہ نئی چیزوں سے اندازہ لگا سکے کہ اس کا خاوند کتنے روپے دے گیا ہوگا۔

ہاں۔ میری آپا کہا کرتی ہے کہ تمہارے باپ کی زندگی میں جب پولیس خانہ تلاشی کے لیے آئی تو وہ بھی الٹ پلٹ نہ کرتی جیسی بھابی اس گھر میں آ کر کرتی ہے۔"

"یار، بڑی چڑیل عورت ہے وہ۔"

آپا سے اتنا لڑتی ہے کہ حد نہیں۔ آپا چپ چاپ سنتی رہتی ہے، کوئی جواب نہیں دیتی۔ میرے باپ کو مرے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ ایک دفعہ کہنے لگی: جب سے بیاہ کے ہم پر بوجھ بنی بیٹھی ہے۔ ہم کہاں تک خرچ دیتے رہیں۔ خاوند پہلے جیلیں قیدیں کاٹتا رہا، پھر تجھ سے تنگ آ کر مر گیا۔ یہ بات سن کر آپا کا چہرہ بگڑ گیا اور آنسو بہنے لگے۔ ماں کو روتا دیکھ کر میں چیخیں مار مار کر رونے لگا اور ممانی پہ جا کے قے کر دی۔ کہنے لگی: ایک تو کھاتے ہیں اور اوپر سے رو رو کے بھی دکھاتے ہیں۔"

احسان، وہ عورت صفیہ سے اپنے بیٹے کو بیاہنے پر کیسے راضی ہو گی؟

محمود اکلوتا بیٹا ہے اور اس نے کہہ دیا ہے کہ شادی کروں گا تو صفیہ سے، نہیں تو کنوارا رہوں گا۔ اب اپنا مطلب آ پڑا ہے اس لیے آج کل کچھ نرم ہو رہی ہے۔

ہم کھیل ختم کر کے اس بات پر غور کرتے ہوئے پانی میں چپ کھڑے رہے۔ پھر میں نے خاموشی توڑتے ہوئے کہا: یار، بہت زور کی بھوک لگی ہے۔

"مجھے بھی۔"

ہم نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ دور وہی لڑکیاں سب پشتان کوٹ ول پشتہ پر اسی طرف دوڑ لگاتی واپس آ رہی تھیں۔ احسان سے پوچھا: تمہارے پاس پیسے ہیں؟

میں نے کھیسے میں ہاتھ مارا اور خوشی سے چلایا: "بچ گئی- اکنی ہے۔"

"بہت ہے- باغ کے اندر چلتے ہیں اور باغبان سے آم لے کر کھاتے ہیں- پھر گھر واپس چلیں گے- آج چالیس کھوہ نہیں جاتے- بہت دیر ہو جائے گی-"

باغ کے اندر، باہر کی آنکھیں چُندھیا نے والی تیز دھوپ کے مقابلے میں، ملگجا سا شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا اور عجیب سی خاموشی پھیلی تھی- آم کے بڑے بڑے چھتنار درخت چھوٹے چھوٹے پیلے آموں سے لدے کھڑے تھے- امرود کے پیڑوں پر پتوں سے گہرے سبز رنگ کے چھوٹی گوندوں جتنے امرود لگے تھے- ان میں ابھی نہ مہک پیدا ہوئی تھی نہ رنگ- آلوچوں کے بوٹے خالی ہو چکے تھے لیکن کہیں کہیں ہرے پتوں میں چھپا کوئی سرخ دانہ چمک مارتا نظر آ جاتا- کسی کسی جگہ سرخی مائل مٹی پر چھوردھوپ کے پیسے برص جیسے دھبے باغ کی فضا میں اجنبی سے چپ لیٹے تھے-
درختوں کی مہک، پھلوں کی خوشبو اور گیلی مٹی کی سگندھ پورے باغ میں خون کی طرح دوڑتی پھر رہی تھی اور دکھائی نہ دیتی تھی- کبھی کبھی ہوہو کی پکار ماحول کا حصہ بنی باغ کے کسی کونے سے اٹھتی اور وہیں ڈوب جاتی- کمان جیسی غلیل سے مٹی کا گول غلہ پتوں میں سے سرسراتا گزرتا سنائی دیتا اور ساتھ ہی توتوں کی ڈار شریر بچوں کی طرح شور مچاتی اڑ جاتی- اڑتے ہوئے ان کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز بہت بھلی لگتی- اس آواز میں ایک عجیب طرح کی اپنائیت تھی جیسے اپنے ہی دل کی دھڑکن ہو- سوکھے پتے ہمارے پیروں کے نیچے آ کر چرچراتے مگر ہم ان کی بات ان سنی کر کے آگے بڑھتے جاتے، شاید اس لیے کہ وہ جاندار نہیں تھے- درختوں میں کہیں کوئی چڑیا، کوئی فاختہ، کوئی ہریلوں کا جوڑا بیٹھا ہانپ رہا ہوتا- دو تین ہانپتی ہوئی مینائیں زمین پر اس طرح گھوم رہی تھیں جیسے معائنہ کرنے اتری ہوں- پرندوں کے ہانپنے اور درختوں میں پناہ لینے سے اندازہ ہوا کہ دن کا ایک یا ڈیڑھ بج رہا ہو گا- میں نے کہا: "توتوں کو کبھی ہانپتے نہیں دیکھا، نہ وہ دوپہر میں سایہ ڈھونڈتے ہیں-"

"ہاں، توتا سبز ہوتا ہے نا-"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"حضور کے روضے کا رنگ سبز ہے، اس لیے گرمی سے کچھ نہیں کہتی-"

میں اتنا بڑا نام سن کر سہم گیا-

ہم چلتے چلتے تقریباً باغ کے وسط میں پہنچ گئے- ایک ادھیڑ عمر آدمی صرف تہمد باندھے، توند نکالے، بڑی سی چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا- اس کے چاروں طرف مختلف اقسام کے آموں سے بھرے بڑے بڑے ٹوکرے رکھے تھے- اس سے بیس قدم ہٹ کر ایک چھریرے بدن کا نوجوان کالا تہمد باندھے، اوپر سے ننگا، چولھے پر توا رکھے موٹی موٹی روٹیاں پکا رہا تھا- تنی پاکیزہ

Scanned with CamScanner

فضا میں کلبلاتا میلا دھواں دیکھ کر اور اس کی چبھتی ہوئی بُو سونگھ کر عجیب طرح کی افسوس میں ملی ہوئی ندامت محسوس ہوئی۔ نوجوان کے سر پر آم کی شاخ میں رسیوں سے بندھی کالی مٹی کی ہنڈیا لٹک رہی تھی اور پاس ہی پانی میں رچ بسا کورا گھڑا اسی طرح لٹک رہا تھا جس کے منہ پر مٹی کا پیالہ الٹا کر کے دیا ہوا تھا۔

احسان نے کہا: "مہر جی، ایک آنے کے آم چاہییں۔"

مہر نے اکبر بادشاہ کی طرح انگلی سے ایک ٹوکرے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں سے ایک جھولی بھر لو۔" آم چھوٹے اور سوکھے تھے۔ احسان کی جھولی بڑی تھی اس لیے وہ پھیلائی گئی۔ میں ٹوکرے سے پک بھر بھر کے ڈالنے لگا۔ وہ اپنا دامن اوپر کو اٹھاتا جا رہا تھا یہاں تک کہ اس کی ناف ننگی ہونے لگی۔ میں آم مسلسل اس میں ڈالتا جا رہا تھا۔ مہر پکارا: "بس اوئے بس، جھولی ہو گئی۔" میں ڈر کر وہیں رک گیا اور پک میں اٹھائے ہوئے آم واپس ٹوکرے میں ڈال دیے۔ احسان آگے آگے چلنے لگا اور ایک جامن کی جڑ میں اس نے جھولی ڈھیر کر دی۔ کہنے لگا: "آؤ، پہلے پانی پی آئیں۔"

"کہاں سے؟"

"آؤ تو۔"

وہ پھر باغبان کے پاس پہنچا۔ "مہر جی، پانی پینا ہے۔"

اس نے آواز لگائی: "اوئے رمو، منڈیاں نوں پانی پلا۔"

رمو نے گھڑا اتارا اور پیالہ بھر کے احسان کو دیا۔ وہ آدھا پیالہ پی سکا، باقی اس نے مجھے پکڑا دیا۔ تیراکی کی مشق کے دوران کافی پانی پہلے سے اندر جا چکا تھا اس لیے پیاس کوئی ایسی شدید نہ تھی۔ ابھی میں پانی پی ہی رہا تھا کہ دور سے چلانے کی آواز سنائی دی: "مہر جی، چور! چور!" رمو گھڑا رکھ کر اس طرف یہ کہتے ہوئے دوڑا: "مہر، تو نے آم توڑتے پھر پکڑ لیا کسی کو!" ہم اپنے درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے اور کھٹ مٹھے آم چوسنے لگے۔ مشکل سے پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ کوک چننے والی دونوں لڑکیاں آگے آگے اور پیچھے رمو اور لنگوٹی باندھے ننگو چلے آ رہے ہیں۔ ننگو کوئی آٹھ نو برس کا لڑکا تھا۔ اس کے کندھے پر اپنے قد کے برابر غلیل تھی اور گلے میں تھیلی جھول رہی تھی جس میں مٹی کے غلے بھرے ہوئے تھے۔ لڑکیوں کے ہاتھ اور بازو کوئلے سے سیاہ ہو رہے تھے اور چہروں پر بھی جگہ جگہ کالے دھبے تھے۔ وہ ادھ کھائے آم ہاتھوں میں لیے باتیں کرتی مسکراتی چلی آ رہی تھیں جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔ سیاہ ہونٹوں میں سے سفید دانت موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ رمو بہت مزے لے لے کر ان سے کہہ رہا تھا: "تم کیا باپ کا باغ سمجھ کر آم توڑ رہی تھیں؟"

"اے ماسے، کہاں توڑے ہم نے آم تمہارے۔ مٹی میں پڑے سڑ رہے تھے، اٹھا لیے تو

کیا اندھیر ہو گیا۔"

ننکو کا سانس چڑھا ہوا تھا اور وہ جوش میں آپے سے باہر تھا۔ "بھار رمو، یہ جھوٹ بول رہی ہیں۔ یہ چھوٹی جو ہے نا، بڑی کے کندھے پر کھڑی ہو کر لاسٹوں کے پاس والے اُس سندھوری بُوٹے سے توڑ رہی تھیں۔ میں نے دیکھ کر شور مچا دیا اور بڑی کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ دونوں دھیں سے گریں۔ چھوٹی نے اٹھ کر تین چار مکّے کس کس کے میری کمر میں مارے مگر میں نے تب بھی چھوڑا نہیں۔'

چل بے ننڈے چپ رہ، کیا سفت کی ڈینگیں مار رہا ہے۔ کم بخت سارا زمین پہ کھڑا زمین سے ہی مل جاتا ہے، نظر بھی نہیں آتا۔ ہم نے نہیں توڑے آم وم کسی کے۔

رمو، نت نکال کر ہنستا ہوا بولا: 'جب کوئی تمھارے آم توڑے گا تب پتا چلے گا۔'

ننکو اپنی معصومیت میں رمو کی ہاں میں ہاں ملاتا ہوا بولا: "ہاں، تب پتا چلے گا۔'

بڑی نے بپھر کر رمو سے کہا: "خبردار جو بکواس کی تو نے۔ ہمارے بھی پیچھے کوئی ہیں، مر نہیں گئے۔"

ننکو کی طرح مجھے بھی اُس وقت لڑکی کی ناراضگی کی وجہ سمجھ میں نہ آئی تھی۔

ہم سے اور تماشا دیکھنے مہر کی چارپائی کے پاس پہنچ گئے۔ ننکو نے بات شروع کرنا چاہی۔ مہر اسے خاموش کراتے ہوئے بولا: 'ٹھہر او شر ننکو۔ ہاں بھئی لڑکیو بتاؤ کتنے آم توڑے ہیں؟'

کہاں توڑے ہیں۔ زمین پر سے یہ ایک ایک اٹھایا ہے۔' نھوں نے ہاتھوں میں لیے ہوئے ادھ کھائے آم سامنے کر دیے۔

اچھا، یا تو مٹی کے سو سو گھگھو بنو یا ایک ایک آنہ دو یا پھر یہ کوئلے یہاں ڈھیر کر دو۔'

ننکو بولا: 'مہر جی، انھیں چھوڑنا نہیں۔ سو سو گھگھو بنائیں گی تو مزہ آ جائے گا۔'

سامنے رمو اپنی ننگی کمر پر ہاتھ رکھے شرارت سے مسکرا رہا تھا: 'رات ہو جائے گی ان سے سو گھگھو نہ بن سکیں گے۔ چلو، وہ سامنے مٹی رکھی ہے، نالے سے پانی لے آؤ اور شروع ہو جاؤ، شاباش!'

دونوں گڑگڑانے لگیں: "مہر جی اللہ کا واسطہ، رسول کا واسطہ، ہمیں معاف کر دے۔ ہم پھر کبھی تیرے باغ میں پیر نہیں رکھیں گے۔"

احسان نے کہا: 'آپ ان کے دو آموں کے بدلے ہم سے چار آم لے لیں اور انھیں چھوڑ دیں۔"

مہر کی دخل اندازی پر چڑ گیا۔ 'ایک آم کے بدلے دو آم؟ کچھ پتا ہے ایک آم چوری کرنے کا جرمانہ کیا ہوتا ہے؟ سو آم۔ ہیں تیرے پاس دو سو آم؟'

"نہیں، دو سو تو نہیں ہیں۔ جتنے ہیں سارے لے لو۔"

"مہربانی، معاف کر دے۔ تیرے پاؤں کو ہاتھ لگاتی ہیں۔ اب تو تجھے جرمانہ بھی مل گیا۔"

"پھر چوری کی تو نہیں چھوڑوں گا۔ جاؤ!"

جانے سے پہلے بڑی لڑکی نے احسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پیار سے کہا:

"بابو، اللہ تجھے چاند سی دلہن دے" اور اڑتے ہوئے طوطوں کی طرح دونوں وہاں سے ہوا ہو گئیں۔

منت سماجت تو انھوں نے بہت کی تھی لیکن ان کے چہروں پر نہ ندامت تھی نہ گھبراہٹ۔ معافی بھی یوں مانگ رہی تھیں جیسے کھیل کھیل میں کوئی بات دہرا رہی ہوں۔ ہم نے ہم سے آم لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا: "[illegible] - رہیں تو شام سے پہلے پہلے باغ اُجڑ جائے۔"

میں نے محسوس کیا کہ پچھلے کچھ دنوں سے ہر صبح جب احسان کے گھر پہنچتا ہوں تو وہ باہر برآمدے میں منتظر کھڑا ملتا ہے، اور پھر فوراً ہی مجھے لے کر ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ لمبی اسٹیشن کے اور کسی چالیس کھوہ کے رخ چل پڑتا ہے۔ پہلے ایسا نہیں تھا، وہ ہمیشہ گھر کے اندر کچھ کرتا ہوا ملتا تھا۔ اب وہ کسی بازار، محلے یا کمپنی باغ چلنے کی میری تجویز سنتے ہی رد کر دیتا۔ لگتا تھا اس ریلوے لائنوں سے [illegible] کر رہ گیا ہے۔ اس کی شکرے کی سی چالاک آنکھیں پٹڑیوں کے آس پاس تیزی سے کچھ ڈھونڈ رہی ہوتیں۔ میں یہی سمجھتا رہا کہ سگریٹ کی خالی ڈبیاں کھوجتا ہو گا۔ ایک دو بار کوئلے چننے والی لڑکیوں سے بھی ہماری مڈبھیڑ ہوئی۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھی کھی کر کے ہنستیں اور چلی جاتیں۔ انھیں دیکھ کر احسان عجیب طرح کا ہو جاتا، کچھ حواس باختہ سا، کچھ بے چین سا۔ دور ہوتا تو ان کے پاس پہنچنے کی جلدی ہوتی؛ قریب ہوتا تو اس سے زیادہ جلدی واپس پلٹنے کی ہوتی۔ مجھے ان دنوں پتا نہ تھا کہ یہ محبت کے آثار ہیں، دوسرے میرے ذہن میں یہ بات بھی بیٹھی تھی کہ محبت شہزادوں، پریوں، شہزادیوں اور وزیرزادوں کے درمیان ہوتی ہے۔ احسان اور کوئلے والیوں کے درمیان محبت کا پودا پنپ پڑنے کی بات میرے خیال میں کس طرح آ سکتی تھی۔ ایک دن ہم چالیس کھوہ کے رخ ریلوے لائن پر نکلے تو دیکھا کہ وہی دونوں لڑکیاں ہم سے بہت آگے کوئلے چنتی ہوئی جا رہی ہیں۔ احسان نے جلدی مچا دی۔ ہم تقریباً بھاگتے ہوئے چل پڑے۔ جب وہ بیر والے باغ کے برابر ہوئیں تو ہمارے اور ان کے درمیان کوئی سو گز کا فاصلہ رہ گیا۔ احسان بولا: چلو واپس چلتے ہیں۔ میں اس کا منہ دیکھنے لگا اور غصے میں آ کر پوچھا: مگر کیوں؟ وہ کچھ سہم سا گیا۔ شاید میرے رونے کی وجہ سے کہ اور اس نوبت سے زیادہ جو یہاں تک آ چکی تھی کہ اب اُسے

اپنے دل کا چور پکڑ کر میرے سامنے پیش کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ دیر تک چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے چلتا گیا گھسٹتا رہا۔ پھر برابر آ کر بولا: "میں تمھیں بتاتا ہوں۔ وہ بڑی والی لڑکی جو ہے نا، میرا دل چاہتا ہے وہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہے اور میں اسے دیکھتا رہوں۔ مگر جب وہ سامنے آتی ہے تو میں ایسا گھبرا جاتا ہوں کہ وہاں سے غائب ہو جانا چاہتا ہوں۔"

میں نے ہنستے ہوئے کہا: "چھوڑ یار، کیا خواہ مخواہ کی بگھارتیں ڈال رہا ہے۔ چل ان سے باتیں کرتے ہیں۔ اچھا لگتا ہے ان سے باتیں کرنا۔"

"آج ان کے نام تو پوچھو۔"

"چلو آؤ، پوچھ لیتے ہیں۔"

جب زیادہ قریب ہوئے تو کہنے لگا: "سعید، خدا کے لیے کچھ نہ پوچھنا۔ آؤ واپس چلتے ہیں۔"

انھوں نے ہماری آواز سنی تو مڑ کر دیکھا اور رک گئیں۔ پٹھان کوٹ جانے والی ریلوے لائن تیزی سے مڑتی اکیلی کہیں دور بھاگی جا رہی تھی۔ ہمارے سامنے اتنا کھلا سبز میدان پھیلا تھا کہ سکندر اور پورس دونوں کی فوجیں اس میں بہ آسانی سما جاتیں۔ دلّی والی دونوں لائنیں میدان کی وسعت کے سامنے سہمی ہوئی سی ایک کنارے پر چلی جا رہی تھیں۔ خالی میدان میں بہت دور آگے کی طرف ایک اکیلا بنگلا کھڑا دھوپ میں جل رہا تھا۔ اس کے ارد گرد لگے چند ایک یوکلپٹس کے درخت اسے کہاں تک بچا سکتے تھے۔ بنگلے کے بعد کھوہوں کا سلسلہ تھا۔ ٹیوب ویلوں کے سپرنٹنڈنٹ کا دفتر اور گھر اسی بنگلے میں تھا۔ دونوں لڑکیاں ہمیں دیکھ کر اپنائیت سے ہنس رہی تھیں۔ میں نے قریب پہنچ کر کہا: "تم آج اتنی دور تک چلی آئی ہو؟"

بڑی بولی: "ہم تو کوکلہ چنتے چنتے چلی آئیں۔ تم کیا کرنے آئے ہو؟"

"ہم چالیس کھوہ دیکھنے آئے ہیں۔"

اس نے چنری کے پلو میں سے چنوں کا ایک پھنکا مارا، اور بکری کی طرح مچر مچر چباتی ہوئی بولی: "تو جاؤ دیکھو۔"

میں نے پوچھا: "تم دونوں کے نام کیا ہیں؟"

"تمھیں ہمارے ناموں کا کیا کرنا ہے؟" چھوٹی نے کہا۔

"میرا دوست جاننا چاہتا ہے۔"

بڑی نے کہا: "تیرے دوست کو بولنا نہیں آتا؟ آ کر پوچھ لے۔" میں نے مڑ کر احسان کو دیکھا۔ وہ دور ٹیلیگراف کے کھمبے کے پاس کسی چور کی طرح دبکا کھڑا تھا۔

چھوٹی نے چنے منھ میں ڈالتے ہوئے کہا: "میں تو مر گئی دھوپ میں کھڑے کھڑے"، اور جا کر میدان کے شروع میں، فصلوں کے قریب لگے شیشم کے بڑے سے پیڑ کے نیچے جا کر بیٹھ گئی۔

Scanned with CamScanner

بڑھی نے جھری کی جھولی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "چنے لے لو۔ اچھے ہیں۔ گرم بھی ہیں دھوپ سے۔" میں نے ایک مسّی بھری اور کھانے لگا۔ بڑھی شیشم کی طرف بڑھتے ہوئے بولی: "تم بھی آجاؤ سائے میں۔ اپنے دوست کو بھی بلا لو۔"

ہم چاروں ریتی پر ایک دائرے میں بیٹھ گئے۔ بڑھی مسکراتے ہوئے بولی: "تم نام پوچھ رہے تھے نا؟ میرا نام لالی ہے اور اس کا نام توتی ہے۔ یہ میری ماسی کی بیٹی ہے اور سہیلی بھی۔ اور کچھ؟"

احسان نے ایک بار آنکھ اٹھا کر لالی کا چہرہ دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کر لیں۔ حیرت میں میرے منہ سے نکلا: "بس اتنا سا نام؟ آگے پیچھے کچھ نہیں؟"

"اور کیا ہوتا؟"

میں چپ ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہر عورت کے نام کے آخر میں بیگم یا خانم وغیرہ ضرور ہوتا ہے۔ پھر سوچا کہ لالی اور توتی کے آخر میں یہ اضافہ واقعی بالکل نہ جچتا۔

"تم تھوڑے دنوں سے ادھر لائنوں پہ نظر آنے لگی ہو۔ پہلے کہاں کوئلے چنتی تھیں؟"

"ریلوائی یارڈ میں۔ اُدھر بہت کوئلہ ملتا تھا۔ دن میں چار چار جھولیاں اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ یہاں تو اتنا چلنا پڑتا ہے اور مشکل سے ایک جھولی بھرتی ہے۔ وہاں تو تھوڑی سی جگہ میں کئی انجن بار بار آتے جاتے رہتے تھے، اور پھر کوئلہ ڈالنے والے انجن میں دو تین گھنٹے بعد سلاخ مار مار کر گراتے ہیں تو بہت سارا کوئلہ گرتا ہے۔"

"وہاں سے کیوں چھوڑ دیا؟"

"چل توتی، تو بتا۔ مجھ سے نہیں بتایا جاتا۔"

"وہاں ایک کانٹے والا تھا، ریل کے انجن جیسا۔ وہ لالی سے کہتا تھا میرے ساتھ سو، نہیں تو ادھر کوئلہ چننے نہ آیا کر۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر جو بارے میں جو بڑا کانٹے والا ہوتا ہے اُس کے پاس گئے۔ وہ سن کر ہنسنے لگا۔ کہنے لگا: تو سو جا اس کے ساتھ۔ لالی رونے لگی تو بولا: اچھا تو مت سو، مجھے کیا کہتی ہے۔ ہم نے ایک نبی والے سے شکایت کی۔ وہ بھی سن کر ہنسنے لگا۔ بولا: اس نے تجھے کوئی نئی بات کہی ہے؟ تیرا کیا بگڑے گا؟ اس کا دل خوش ہو جائے گا۔ پھر ہم بڑے صاحب کے پاس گئے، وہ جو لائنوں پہ آدمیوں کے دھکے سے چلنے والی ریڑھی میں بیٹھ کر گھومتا ہے۔ ہماری بات سن کر ریڑھی دھکیلنے والے آدمی منہ پھیر کے ہنسنے لگے۔ صاحب بولا: یارڈ میں کسی کو کوئلہ چننے کی اجازت نہیں۔ اس نے تمہیں ٹھیک منع کیا۔ تم کوئلے کے بہانے یہاں چوری کرتی ہو، ریلوائی کا سامان اٹھا کر لے جاتی ہو۔ یاد رکھو بند کرا دوں گا۔ کسی نے ہماری بات نہ سنی۔ وہاں کوئلہ آسانی سے ملتا تھا اس لیے چھوڑا بھی نہ جاتا تھا۔ دو تین دن ہم ادھر نہ گئے، پھر لالچ میں آ کر سوچ لیا کہ

کانٹےوالا لالی کو بھول گیا ہوگا۔ پھر چلے گئے۔ ابھی تھوڑے تھوڑے کوسے چنے تھے کہ وہی کانٹےوالا آگیا۔ بولا: مجھے پتا تھا تم رہ نہیں سکتیں، پھر آؤ گی۔ بڑے صاحب سے بھی شکایت کر کے دیکھ لیا۔ کچھ ہوا؟ چل ادھر آ اب۔ وہ چوبارے کے کمرے سے نکل کر آیا تھا جو ہر وقت بند رہتا ہے۔ اب کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ لالی کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اس نے لالی سے پتھر اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیے۔ وہ اس کا بازو پکڑنے کے لیے آگے بڑھا تو اس نے پتھر مارا۔ اس کے ماتھے پر لگا اور خون بہنے لگا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ ہم جھولیاں وہیں چھوڑ کر بھاگے اور اپنے خیموں میں جا کر رکے۔ اس کے بعد سے اُدھر نہیں گئے۔"

احسان جو پہلے بے چین سا بیٹھا تھا، کہانی شروع ہوئی تو سراپا توجہ بنتا چلا گیا۔ وہاں اگر کوئی بہرا بیٹھا ہوتا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر پوری کہانی سمجھ لیتا۔ احسان نے تنتنے پھلا کر کہا: "اس کانٹےوالے کا کیا نام تھا؟"

لالی بولی: "کیوں، تم اس سے لڑنے جاؤ گے؟ کیا کرو گے نام پوچھ کر؟ چھوڑو۔"

میں نے پوچھا: "تمہارے مردوں نے کچھ نہیں کیا؟"

لالی کہنے لگی: "نہ کسی نے پوچھا نہ ہم نے بتایا۔ بتانے سے کیا ہوتا؟ ہمارے لیے کوئی لڑنے نکلتا؟ ہم چنگڑ ہوتے ہیں۔ ہمارے مرد دن رات نشہ کر کے خیموں میں پڑے رہتے ہیں۔ کوئی کام نہیں کرتے۔ عورتیں کہاں سے کما کر لاتی ہیں اس سے انہیں کوئی مطلب نہیں۔ ہاں اگر کوئی عورت بھاگ جائے تو جان پر کھیل کر بھی اسے واپس لاتے ہیں۔ روزی کا معاملہ ہے۔ شادیاں قبیلے کے اندر ہی ہوتی ہیں۔ جیسے توتی کی شادی میرے بھائی سے ہو رہی ہے۔"

اس پر توتی نے شرما کر لالی کے کندھے میں منہ چھپا لیا۔ کہنے لگی: "لالی چپ کر، نہیں تو میں بھی بتا دوں گی کہ تیری شادی میرے بھائی سے ہو رہی ہے"

"ہم لوگ مرغیاں، بکریاں، گدھے پال کر بیچتے ہیں۔ ان کی سب دیکھ بھال عورتیں کرتی ہیں۔ مرد صرف ایک کام کرتے ہیں، اگر کبھی دھونگ جائے تو چھوٹی موٹی چوری کر لیتے ہیں۔ عورتیں ردی کاغذ، بھوسے اور لیروں سے ہاتھی گھوڑے بناتی ہیں، چھاج بناتی ہیں، مٹی کے گھگھو گھوڑے بنا کر آوے میں پکاتی ہیں بوڑھی عورتیں گلی گلی گھوم کر بیچتی ہیں۔ مٹی کے تندور بناتی ہیں۔ ہم ہر کام کر لیتے ہیں۔ کوئی کام نہ ملے تو بھیک مانگ لیتے ہیں۔ دن رات کام کرتے ہیں پھر بھی ایک وقت روٹی ملتی ہے۔ جہاں میلہ ٹھیلہ ہو ہم اپنے جانوروں پر سامان لاد کر پہنچ جاتے ہیں۔ ڈھائی تین مہینے ہوئے، ہم یہاں بیساکھی کا میلہ کمانے آئے تھے۔ تھوڑے دنوں میں کہیں اور چلے جائیں گے۔"

احسان ہر چیز سے غافل، لالی کی باتیں سننے میں محو تھا۔ میں نے کہا: "توشیئر سیل کب کی

گزر گئی۔ ایک بج رہا ہوگا۔ شمو چپ ہیں۔

تو تی بولی: لالی، میرا تو پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔ پہلے کہیں سے پانی پی لیں۔

لالی حسان سے کہہ رہی تھی: کل تم دو آموں کے بدلے اس موٹے کو سارے آم کیوں دے رہے تھے بھلا؟

وہ تمھاری بے عزتی جو کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو عجیب طرح کی حقارت اور تشکر سے بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی، پھر وہ یک دم سنجیدہ ہو گئی۔ وہ احسان کے چہرے پر نظر جمائے اس کے سامنے پورے قد سے یوں سیدھی کھڑی تھی جیسے ابھی ایک قدم بڑھائے گی اور اس کے اندر سما جائے گی۔ کہنے لگی: کس کس کو روکو گے بے عزتی کرنے سے؟ بے عزتی تو میرے ساتھ پیدا ہوئی ہے۔ جڑواں بہن ہے میری۔

احسان بولا: تم دل تھوڑا نہ کرو۔ اللہ نے کسی کو کم یا زیادہ عزت والا پیدا نہیں کیا۔ یہ سب تو طاقت والے خود غرض انسانوں نے کمزوروں کو لوٹنے کے لیے بنا رکھا ہے۔ انقلاب آئے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ ذہن کی زبان میں بول رہا تھا۔

کچھ نہیں ہوگا۔ ہمارا نصیب ہی ایسا ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے اس میں۔ پھر احسان کی طرف دیکھ کر بولی: کل پھر آنا۔ ہمیں۔ اب جاؤ۔ ہم تھک جائیں گے۔ ہمارے ساتھ جاؤ گے تو لوگ ہنسیں گے۔ اب وہ پھر کھل کر ہنس رہی تھی۔

دوسرے دن میں بیٹھنے وقت پر حسان کے گھر پہنچا تو صفیہ نے بتایا: ابھی تو برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔

"وہاں تو نہیں ہے۔"

"تو پھر کہیں چلا گیا ہوگا۔"

"کہاں؟"

"تم جب روزانہ اس کے ساتھ گھومنے نکلتے ہو تو مجھے بتا کے جاتے ہو کہاں جا رہے ہو؟"

میں شرمندہ سا ہو کر چپ رہا۔ کہنے لگی: آج اکیلے سدھار گیا ہے گا؟"

"بن جاتے کا کچھ نہ کچھ۔ آپ چپ رہیں۔" صفیہ ہنسنے لگی۔

احسان کی ماں بولی: صفیہ، تو نے تو لڑکے کو رلا ہی دیا۔ ایسا نہیں کرتے بیٹی۔ اتنی محبت سے یہ روز آتا ہے بیٹے۔ پھر مجھ سے کہنے لگی: سعید، بیٹھ جا بیٹا یہاں آ کے۔ احسان ابھی آتا ہو

گا۔"

میں نہیں بیٹھا۔ اس کی بے وفائی پر ناراض ہو کر گھر چلا آیا۔ اب سمجھتا ہوں میری ناراضگی غلط تھی۔ گھر واپس جاتے ہوئے غصے کے باوجود مجھے رہ رہ کر وہ واقعہ یاد آ رہا تھا جب وہ گاتے ہوئے رو پڑا تھا۔ اُس دن ہم اپنے صبح کے دورے پر نکلے تو گھومتے گھامتے دربار صاحب پہنچ گئے۔ پہلے ہم نے تالاب کے گرد پورا چکر لگایا، پھر پل پار کر کے تالاب کے بیچوں بیچ بنے ہَر مندر صاحب کے اندر چلے گئے۔ سنہری گنبد والی سنگِ مرمر کی اونچی اُجلی عمارت دھوپ میں جگمگا رہی تھی۔ دروازوں اور دیواروں پر سنگِ مرمر میں رنگا رنگ پتھر جڑ کر پھول اور بیل بوٹے بنائے گئے تھے جیسے مسلمانوں کی عمارتوں میں ہوتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ویسے ہی پتھروں سے مور، کبوتر اور توتے بھی بنے ہوئے تھے۔ سب سے اونچی جگہ پر گرنتھی بیٹھا گرنتھ صاحب پڑھ رہا تھا۔ ایک آدمی پیچھے کھڑا چوری جھلا رہا تھا۔ نیچے گانے والوں کی ایک منڈلی بیٹھی کیرتن گا رہی تھی۔ زائرین آتے، گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکتے، کچھ دیر عقیدت سے بیٹھے کیرتن سنتے، پھر کڑاہ پرشاد بانٹنے والے کے سامنے کھڑے ہو جاتے، دونوں ہاتھ بڑھا کر احترام سے پرشاد لیتے اور آگے چلے جاتے۔ میری نظریں وہاں کسی بُت کی متلاشی تھیں؛ نظر نہ آیا تو سمجھ کہ کہیں چھپا کر رکھا ہوگا، مقررہ وقت پر باہر نکالتے ہوں گے۔ اس زمانے میں مَیں بت پرستی کو اسلام کے سوا ہر مذہب کا لازمی جز سمجھتا تھا۔ ہَر مندر صاحب کے اندر کوئی آپس میں بات چیت نہیں کر رہا تھا۔ ہم کچھ دیر وہاں ہیبت اور خوف کے باعث لب بستہ مؤدب کھڑے رہے۔ پورے وقت مجھے یہ ڈر لگا رہا کہ ابھی کوئی آ کر کہے گا کہ اوئے، یہ تو مُسلے ہیں، پکڑو انہیں! پھر خدا معلوم ہمارا کیا حشر کریں۔ وہیں پر ہم نے ماتھا تو نہ ٹیکا لیکن دوسروں کی طرح کڑاہ پرشاد لے لیا۔ میں حسان کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ کھائے تو میں بھی کھا لوں۔ آخر ہم اسی طرح بند مٹھیاں لیے دربار صاحب سے باہر آ گئے۔ میں کھانے لگا تو حسان بولا: 'ٹھہرو یار، سوچنے دو۔ ہم مسلمان ہیں، ہمیں کھانا بھی چاہیے یا نہیں۔'

'یہ کون سا گوشت ہے جس میں سوچنے کی ضرورت ہو کہ ذبح ہے یا جھٹکا۔'

'تمہیں نہیں پتا، سکھ حلوا پکا کر جھٹکا کرنے کے لیے اس میں تلواریں مارتے ہیں زور زور سے۔'

'حلوا کوئی زندہ چیز ہے جو کرپان پھیرنے سے مر جاتا ہوگا؟ پھر بھی حلوا ہی رہتا ہوگا۔' یہ کہہ کر میں نے مٹھی میں لیا ہوا حلوا منہ میں ڈال لیا۔ حسان کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا، پھر وہ بھی کھا گیا۔

میں نے نگلتے ہوئے کہا: "تھوڑا تھا۔"

'تبرک اتنا ہی ہوتا ہے، پیٹ بھرنے کے لیے نہیں ہوتا۔'

"یار وہاں کوئی بُت تو تھا نہیں۔"

Scanned with CamScanner

بت کیوں ہوتا؟ سکھوں کے ہاں بت پرستی منع ہے، جیسے مسلمانوں میں منع ہے۔

یہ میرے لیے ایسی ہی بات تھی کہ یقین کرنا مشکل تھا۔ میں نے اختلاف تو نہ کیا مگر اندازہ لگایا کہ احسان کو ضرور دھوکا ہوا ہے۔ ہم کٹڑہ مہان سنگھ سے نکل ہاتھی گراؤنڈ کے بیچوں بیچ چلتے شریف پورے کی گول مسجد کے پاس پہنچ گئے۔ پھر ایک سیدھی گلی پکڑی تو ہم ریلوے لائنوں پر احسان کے مکان کے سامنے تھے۔ مجھے ہاتھی گراؤنڈ پار کرنے کے بعد اپنے گھر کے رخ چل پڑنا چاہیے تھا جو وہاں سے نزدیک پڑتا تھا، لیکن چار بجنے میں ابھی تین گھنٹے باقی تھے۔ سوچا ابھی سے جا کر کیوں قید ہو جاؤں، جتنا وقت احسان کے ساتھ خوش گپیوں میں کاٹ سکوں، اچھا ہے۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر کوٹھے پر چلے گئے۔ وہاں گرمی تو بہت تھی لیکن تنہائی جس کے ہم خواہاں تھے، اس گھر میں وہیں میسر آ سکتی تھی۔ ہم چھت پر چلچلاتی دھوپ میں بلا مقصد گھومتے رہے، پردوں پر سے جھک جھک کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتے رہے۔ دور دور تک چھتیں سونی ڈھنڈار پڑی تھیں، نہ آدم نہ آدم زاد۔ بل کھاتی پگڈنڈیاں، سیدھے لمبے رستے، جو کچھ بھی نظر آ رہا تھا سب سنسان پڑا تھا۔ دھوپ کی حدت نے زندگی کا سانس ہی گویا سلا دیا تھا۔ باغوں کی دھول میں اٹی ہریالی کسی یک جان جیسے سبز بادل کی طرح دور دور تک پھیلی، گرد میں اٹی کھڑی تھی۔ اس کے اوپر اٹھتے ہی جیسے مٹیالے آسمان کا شور اٹھ رہا تھا۔ گھر کے پچھواڑے، موٹے موٹے بے ہنگم تنوں والے چھدرے پیپل کے ایک موٹے سفید ٹہنے پر ایک کالا کوا بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ دو بار کائیں کائیں کی، پھر بیزار ہو کر پیپل چھوڑ سبز بادلوں کے رخ نکل گیا۔ ہم زیادہ دیر دھوپ کی تاب نہ لا سکے اور سیڑھیوں کے اوپر کیبن کی شکل کی تعمیر کے نیچے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ تھکے ہوئے تھے، دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں سیدھی کر لیں اور خاموش بیٹھے پسینہ بہانے میں مصروف رہے۔ احسان دھیمی آواز میں گانے لگا:

پنچھی باورا، چاند سے پریت لگائے......

وہ اتنا اچھا گا رہا تھا کہ میں حیرت زدہ ہو کر اس کا منھ دیکھنے لگا۔ وہ اپنی دھن میں گاتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں۔ مگر اس وقت میں پوچھنے کا گناہ کیسے کر سکتا تھا۔ شاید آنسو نہ ہوں، پسینہ ہو۔ اگر آنسو ہوتے تو اس کی آواز رندھ جانی چاہیے تھی؛ وہ تو بدستور درد میں ڈوبی آواز میں گائے جا رہا تھا۔ اگر وہ آنسو ہی تھے تو اسے خود پتا نہ تھا کہ وہ رو رہا ہے۔ وہ بہت دیر تک یوں ہی اپنے آپ میں گم، گاتا رہا۔ میں دم سادھے بیٹھا سنتا رہا۔ گانا ختم کر کے وہ کچھ دیر ویسے ہی آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ جب کھولیں تو مجھے لگا جیسے وہ نیند سے چونک رہا ہو۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا: میں جا رہا ہوں۔ وہ منھ سے کچھ نہ بولا، صرف ایک بار سر ہلا دیا۔ اس دن واپسی پر یک بیک اس سوال نے مجھے گھیرے رکھا کہ اگر وہ رو رہا تھا تو کیوں۔ باپ کی اچانک موت یاد آ گئی؟ گھر والوں کی بدحالی برداشت سے باہر ہو گئی؟ لیکن ان سب باتوں کا گیت کے موضوع

اور طرز سے تو کچھ واسطہ نہ تھا۔ دوسرے دن میں اُس سے پوچھتا رہا مگر وہ چپ کھڑا مسکراتا رہا۔ شاید اُسے خود بھی پتا نہ چل سکا ہو کہ وہ کیوں رو رہا تھا۔ آج پچاس سال بعد اس معمے کا ایک ممکنہ حل یہ گمان میں آتا ہے کہ غالباً وہ لالی سے ملاقات سے پہلے ہی اس کے ہجر میں بے بس ہو کر رو پڑا تھا۔

تیسرے دن صبح احسان چوری چھپے سیڑھیاں چڑھ کر میرے کمرے میں آیا اور آہستہ سے بولا: "میں گلی میں کھڑا ہوں، جلدی سے آجا۔"

میں اُسے ننگے سر دیکھ کر ایسا حیرت زدہ ہوا کہ اپنا رنج بھول گیا۔ "تمھاری ٹوپی کیا ہوئی؟"

"آ تو، بتاتا ہوں۔"

ہم گلیوں میں سے ہوتے ہواتے ریلوے لائنوں کے ساتھ ساتھ اُس کے گھر کی طرف چل پڑے۔ گلی میں ڈھنڈورا پٹ رہا تھا کہ آج رات آٹھ بجے سے دس بجے تک بلیک آؤٹ ہوگا۔ میں نے کہا: "یار، آج پھر مصیبت ہوگی رات میں۔ تجھے آرام ہے، تیرے علاقے میں کوئی سول ڈیفنس والا پہنچ ہی نہیں سکتا۔ جتنی چاہو روشنی کرو۔"

"ہمارے گھر روز ہی بلیک آؤٹ ہوتا ہے۔ کوئی آئے نہ آئے، آٹھ بجے لالٹینیں گل کر دیتے ہیں۔ تیل بچانے کے لیے۔"

"پرسوں تُو نے میرے ساتھ اچھی کی۔ پہلے ہی کھسک گیا۔"

"وہ جب گزریں تو میں نے کچھ دیر تمھارا انتظار کیا۔ تم نہ آئے تو میں رک نہ سکا، نکل گیا ان کے پیچھے۔"

"ٹوپی کیا ہوئی؟"

"لالی نے چھڑوادی۔ کہتی تھی اپنی عمر کے کسی اور کو ایسی ٹوپی پہنے دیکھا ہے؟ چھوڑ دو، بُری لگتی ہے۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ مصطفیٰ کمال پاشا کی یاد میں پہنتا ہوں اور وہ موجودہ زمانے کا واحد مسلمان جرنیل گزرا ہے جو انگریزوں کے خلاف لڑا اور جیتا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آنی نہیں تھی۔ اور پھر اس نے اتنے پیار سے کہا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ تھوڑے دنوں میں بال بڑے ہو جائیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تو اب آپ انگریزی بال بھی رکھیں گے؟ کہاں گئیں تمھاری سب باتیں؟"

"بالوں سے کیا ہوتا ہے؟ اصل بات تو انسانوں کی برابری کی ہے۔"

"تو دو دن میں لالی سے مل کر تم نے سب انسانوں کو برابر کر دیا!"

"یار، تُو تو مجھے کچھ ناراض دکھائی دیتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

"اور تُو مجھے کچھ ضرورت سے زیادہ خوش دکھائی دیتا ہے۔" اس پر ہم دونوں ہنس پڑے۔

"دونوں میں کیا باتیں ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"دونوں دن لالی نے کوٹھے نہیں چنے، توتی سیلی چہکتی رہی۔ لالی ایسی خوب صورت بن کر آئی تھی کہ وہ پرانی لالی لگتی ہی نہیں تھی۔ کپڑے بھی دوسرے تھے اور کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں۔ وہ ابھی آجائیں گی تو دیکھنا۔ لالی تیرا کہہ رہی تھی کہ کل اُسے ضرور ساتھ لانا۔"

"اچھا تو اسی لیے آپ نے صبح صبح تکلیف کی!"

جب ہم اُس کے گھر کے برآمدے میں پہنچے تو سگنل بند ہونے کے باعث گوروں سے بھری ایک بہت لمبی ٹرین ہالٹ ہمارے سامنے رکی کھڑی تھی۔ گرمی سے بے حال گورے، بنیان نیکر پہنے، پسینے میں شرابور، گرد اور میل میں سر سے پیر تک اٹے تیسرے درجے کے ڈبوں کی کھڑکیوں اور دروازوں سے مڈھے پڑے رہے تھے۔ گاڑی کے رکتے ہی دونوں طرف ہر دروازے کے سامنے ہندوستانی سپاہی رائفلیں تانے پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ میں نے حسان سے کہا: "ایسی بری حالت تو میں نے کبھی ہندوستانی فوجیوں کی بھی نہیں دیکھی۔ یہ انگریز بچاروں کا اتنا برا حشر کس گناہ میں کیا جا رہا ہے؟"

احسان نے بتایا: "یہ انگریز نہیں، اطالوی قیدی ہیں جو مصر میں رومیل کی پسپائی کے بعد انگریزوں کے ہاتھ لگے ہیں۔ گورے ہیں نا، اس لیے انگریز انھیں ٹھنڈے مقام پر ڈلہوزی لے جا رہے ہیں۔ وہاں قیدی کیمپ بنایا گیا ہے۔ گاڑی جب سٹیشن پر پہنچے گی تو نیا انجن دوسرے رخ لگے گا اور پھر یہی گاڑی پٹھان کوٹ والی لائن پر دوبارہ ہمارے سامنے سے گزرے گی۔ آؤ، انھیں قریب سے دیکھتے ہیں۔"

گاڑی کے دونوں طرف نیم برہنہ بچوں کا ہجوم تھا۔ اِن ہنستے، غل مچاتے، منتیں کرتے بچوں کی طرف قیدی بسکٹ اور چاکلیٹ کے ڈبے اور سگریٹ کی ڈبیاں پھینک رہے تھے۔ پہرے والوں کی وجہ سے نہ تو اطالوی باہر آسکتے تھے اور نہ بچے گاڑی کے زیادہ قریب جا سکتے تھے۔ ہم پہنچے تو ایک قیدی نے ہماری طرف بسکٹ کا ڈبا پھینکا۔ ہم کچھ دیر دیکھتے رہے، پھر میں نے کہا: "اٹھا لو یار، مفت کا مال ہے۔" حسان نے کہا: "دیکھا اب یہ کتنا ناراض ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے دو انگلیوں سے وی کا نشان بنا کر قیدی کو دکھایا۔ اطالوی نے انگلی کے اشارے سے انکار کیا، پھر انگلیاں الٹی کر کے وی کا الٹا نشان بنا کر دکھایا۔ کچھ دیر ہم اس کے ساتھ اسی کھیل میں لگے رہے، پھر واپس برآمدے میں آ گئے۔ میں نے حسان سے پوچھا: "تم نے کبھی کسی اصلی اور زندہ انگریز کو بھی دیکھا ہے؟"

"ہاں، مگر دور سے۔ ایک بار جیل میں ابا کو مل کر میں اپنی ماں کے ساتھ لاہور کے اسٹیشن پر

فرنٹیئر میل میں سوار ہونے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا تو دیکھا دو انگریز گوروں کے ریفرشمنٹ روم سے نکل کر ٹھنڈے ڈبے میں داخل ہو رہے تھے۔ پلیٹ فارم پر ایک سفید وردی والا افسر لوگوں کو ہٹا کر ان کے لیے راستا بنا رہا تھا۔ یا پھر ایک بار گوروں کی فوجی اسپیشل یہاں سے گزرتے ہوئے کچھ سیکنڈ کے لیے رکی تھی، تب دیکھے تھے۔

میں نے پوچھا: "یار، یہ قیدی کہیں ہمیں بنگالیوں کی قحط کے متاثرین سمجھ کر تو بسکٹ وغیرہ نہیں دے رہے؟"

"کیا خبر یہی سمجھتے ہوں۔ ویسے تو زیادہ تر ہندوستانی صورت شکل سے فاقہ زدہ لگتے ہیں۔ تو نے اخباروں میں قحط کی خبریں دیکھی ہیں؟ یار، انگریزوں نے بہت ظلم کیا بنگالیوں کے ساتھ۔ آزادی مانگنے کی اتنی خوفناک سزا دی ہے انہیں۔ دس لاکھ تو اب تک مر چکے ہیں۔ پتا نہیں ابھی کتنے لاکھ اور مریں گے۔ مجھے وہ تصویریں یاد ہیں جو ٹھنڈی کھوہی پر دیکھی تھیں؟"

"ہاں، میں تو کانپ گیا تھا انہیں دیکھ کر۔"

"وہ تو کچھ بھی نہیں تھیں۔ اب جو آ رہی ہیں انہیں دیکھ لو تو دن بھر کھانا نہ کھا سکو۔ گلیوں بازاروں میں بکھری لاشوں کو کتے اور کوّے کھا رہے ہیں۔ ایسی ایسی کہانیاں چھپتی ہیں کہ دل پھٹ جاتا ہے۔ ایک عورت نے دن بھر اسٹیشن اور چاولوں کے گودام کے درمیان سڑکوں پر چکر کاٹ کاٹ کر شام تک تھوڑے سے چاول اپنے بچوں کے لیے اکٹھے کیے تھے۔ شام کو گھر لے جا رہی تھی تو ایک اور بھوکا زبردستی چھین کر بھاگ گیا۔ بچاری روتی رہ گئی۔"

"پھر؟"

"پھر وہی ہوا ہوگا جو ہوتا ہے۔ ماں اور بچے مر گئے ہوں گے۔"

"کوئی کچھ نہیں کر رہا ان کے لیے؟"

"مال گاڑیاں غلہ لے کر کلکتے جا تو رہی ہیں۔ میں نے خود دیکھی ہیں یہاں سے گزرتی ہوئی۔ مگر وہاں کی سرکار سے بھوکوں تک پہنچنے بھی تو دے۔"

قحط کے ذکر نے ہمیں افسردہ کر دیا اور ہم چپ بیٹھے پٹڑیوں کو گھورتے رہے۔ اطالوی قیدیوں کی گاڑی کے اسٹیشن کی طرف روانہ ہونے کے کچھ دیر بعد اُسی لائن پر فرنٹیئر میل دندناتی ہوئی گزری۔ دھول کے ساتھ بسکٹوں کے خالی ڈبے اور چاکلیٹوں کے ریپر فضا میں اونچے ہو کر ناچنے لگے۔ مجھے بسکٹوں کی بڑی سی ڈکار آئی جس پر عجیب سی شرمندگی محسوس ہوئی۔

فرنٹیئر میل بھی آ چکی تھی مگر لالی اور توقی کا کہیں نام نشان نہ تھا۔ اب احسن واضح طور پر پریشان نظر آنے لگا۔ بولا: "چلو، اُن کے خیمے دیکھ کر آتے ہیں۔ کہیں چلے تو نہیں گئے۔"

"ابے، انہیں پتا چل گیا تو بہت ماریں گے۔"

بس دور سے دیکھ کر واپس آ جائیں گے۔ زیادہ دور بھی نہیں، بٹالے کو نکلنے والی سڑک کے موڑ تک تو چلنا ہے۔"

ہم باتوں میں سے ہو کر چل پڑے۔ وہاں پہنچے تو اینٹوں کے بنے پندرہ بیس چولہوں میں راکھ اڑ رہی تھی۔ جگہ جگہ گدھوں کی لید بکھری ہوئی تھی۔ سوائے نحوست اور اداسی کے وہاں کچھ نہیں تھا۔ قبیلہ رات کے کسی پہر خیمے اکھاڑ کر کوچ کر گیا تھا۔

واپس آئے تو احسان سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کوٹھے پر چلا گیا اور مجھے اس کی ماں نے بلا لیا۔

"سعید، تو نے اپنے باپ کو پرمٹ کے سلسلے میں میرا پیغام دیا بھی تھا کہ نہیں؟"

میں جواب دینے کے بجائے چپ کھڑا زمین کو گھورتا رہا۔

صفیہ بولی: "آپا، یہ اپنے ابا سے بہت ڈرتا ہے۔ اس کی کہاں ہمت ہوئی ہو گی بات کرنے کی۔ ڈرتے تو سبھی ہیں اُن سے۔ ان کی تو ناک پر غصہ دھرا رہتا ہے۔"

"بیٹے، تو مجھے بتا ہی دیتا تو میں کچھ اور کرتی۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھی ہوں کہ پرمٹ آج آیا کہ کل۔ کوئی چیز بازار میں نہیں ملتی، نہ کپڑا، نہ چاول، نہ چینی، نہ مٹی کا تیل۔ بلیک میں تو اتنی مہنگی ہے کہ ہماری پہنچ سے باہر۔ یہاں بجلی بھی نہیں۔ ایک کنستر مٹی کا تیل مل جاتا تو کچھ دن آرام سے کٹ جاتے۔ اچھا بھلا زمانہ تھا، یہ کمبخت ماری جنگ نے سب برباد کر کے رکھ دیا۔ اس پر خدا کی مار ہو، ایسی چھڑی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ چار سال ہونے کو آئے اور یہ چل رہی ہے۔"

میں سیڑھیاں چڑھ کر احسان کے پاس چلا گیا۔ وہ سیڑھیوں کے اوپر بنے کیبن کے سامنے بچھی چارپائی پر سوچ میں گم خاموش بیٹھا تھا۔ ہمارے سروں کے اوپر، نیلے آسمان میں چیلوں کا ایک غول دائرے کی شکل میں تیرتا پھر رہا تھا۔ شمال مشرق کی طرف سے کالی سیاہ گھٹا چڑھتی چلی آ رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کا پہلا جھونکا میرے چہرے اور بالوں سے آ کر ٹکرایا۔ میں بھی احسان کے برابر بیٹھ گیا۔ مجھے لالی اور نوتی کے چلے جانے کا کوئی غم نہ تھا لیکن احسان رنج میں ڈوبا ہوا تھا۔ آج محسوس کرتا ہوں کہ لالی نے احسان کے کورے دل پر رومان کی گلابی لکیر کچھ زیادہ گہری کھینچ دی تھی۔ کچھ دیر چپ رہنے کے بعد میں نے کہا: "بارش آ رہی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اس نے صرف اتنا کہا: "ٹھیک ہے۔"

میں ڈیوڑھی سے باہر نکلا تو ایک سکھ نوجوان سائیکل تھامے سامنے کھڑا تھا۔ پوچھنے لگا:

"قربان صاحب کا گھر یہی ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

"ان کے ماں جی گھر پر ہیں تو بلا دو۔"

Scanned with CamScanner

میں نے اندر جا کر اطلاع کی تو دونوں ماں بیٹیاں بیک وقت بولیں: "یا اللہ خیر!" آپا نے دوپٹا ٹھیک کر کے اوڑھا اور دروازے کی اوٹ میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی: "کیا بات ہے کاکا؟"

"ہاں جی، میں فرمان کے ساتھ فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ آج دس بجے تھانہ پتلی گھر کی پولیس فیکٹری میں آئی اور انھیں ساتھ لے گئی۔ پانچ چھ دن پہلے انھوں نے پتلی گھر کے علاقے میں کھدّی مزدوروں کے جلسے میں تقریر کی تھی۔ پولیس والوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے مزدوروں کو توڑ پھوڑ کرنے اور مالکوں کے ساتھ مار پیٹ کرنے پر اکسایا۔ آپ فکر نہ کریں، کوئی بھاری مقدمہ نہیں۔ جلد ضمانت ہو جائے گی۔ پارٹی کوشش کر رہی ہے۔ ان کی اس مہینے کی تنخواہ میں آپ کو پہنچا جاؤں گا۔ یہ سائیکل ان کی لے لیں۔ میں نے آگے بڑھ کر سائیکل پکڑی۔

آپا نے کہا: "کاکا، جو دوسروں کا غم کھانا جانتے ہیں اُن پر ہلکے بھاری مقدمے تو بنتے ہی رہتے ہیں۔ ہم سدا کے عادی ہیں، فکر کیوں کریں گے۔ اللہ مالک ہے۔ تو بتانے آیا، تیری مہربانی۔"

میں سائیکل اٹھائے چار سیڑھیاں چڑھ کر ڈیوڑھی میں پہنچا تو آپا دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی اور صفیہ آنکھوں میں آنسو بھرے، پانی کا پیالہ اسے دے رہی تھی۔ آپا کا رنگ پیلا زرد ہو گیا تھا اور بدن پسینے پسینے ہو رہا تھا۔ صفیہ کے سہارے چلتی ہوئی صحن میں آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ گویا اپنے آپ سے کہنے لگی: "پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ مجھ میں اب ہمت نہیں رہی۔"

وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھی۔ آنسو بہاتی صفیہ خاموشی سے اس کے کندھے دبا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور مجھ سے کہا: "سعید، جا احسان کو بلا کے لا۔" پھر صفیہ سے بولی: "پولیس شام تک تلاشی کے لیے آ جائے گی۔ نہیں تو رات کو تو ضرور چھاپا مارے گی۔ تم اُس کے تمام کاغذ، فائلیں وغیرہ بوری میں بند کر کے احسان کو دے دو۔ وہ ابھی جا کر ماموں کے گھر چھوڑ آئے۔ کل وہاں سے کہیں اور رکھوانے کا بندوبست کریں گے۔ سیڑھیوں میں جو اشتہار وغیرہ اور پارٹی کے کاغذات پڑے ہیں انھیں پچھواڑے لے جا کر آگ لگا دو۔" احسان آیا تو اس سے کہا: "صفیہ بوری کاغذوں کی دے رہی ہے۔ ماموں کے گھر پہنچا کے لالہ کرشن لال کے دفتر چلے جانا اور کہنا کہ فرمان کی ضمانت کرانے کے لیے مجسٹریٹ کے پاس درخواست دے دیں۔"

احسان نے کہا: "وہ تو بہت دنوں سے قید ہیں۔ ابھی تک ان کی رہائی نہیں ہوئی۔"

یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ پھر کہا: "اچھا سعید کے ابّا کے پاس کچہری چلے جانا اور کہنا کہ ضمانت کے لیے وکیل کرا دیں۔ اور بتا دینا کہ شام کو میں گھر پر ملنے آؤں گی۔ جب ضمانت ہو جائے تو صمانت کا بھی تو انتظام کرنا ہو گا۔"

اس دن شام کے وقت احسان کی آپا صفیہ کو ساتھ لے کر میرے باپ سے قرباں کے مقدمے کے سلسلے میں مشورہ کرنے اور ضمانت مہیا کرنے کو کہنے ہمارے گھر آئی۔ میں ڈر رہا تھا کہ میرا باپ ابھی ان پر برس پڑے گا، لیکن وہ تو نہ صرف تحمل سے ان کی بات سنتا رہا بلکہ خوش گوار موڈ میں ان کی مدد کرنے کا یقین بھی دلایا۔ گفتگو کے دوران اس کا لہجہ حد درجہ مؤدب تھا۔ ماں نے مہمان نوازی کے طور پر مجھے مولوی داؤد کی دکان پر بھیج کر دو گلاس صندل کا شربت منگوایا اور انہیں پلایا۔ میں خود اپنے باپ کے منہ سے ان لوگوں کے متعلق کئی بار جلی کٹی اور نفرت آمیز باتیں سن چکا تھا؛ جب میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے یا کوئی اور، تو پھر احسان کی ماں اور صفیہ اپنے بارے میں اس کے اصل جذبات کا گمان بھی کس طرح کر سکتی تھیں۔ بعد میں میرے باپ نے قرباں کی ضمانت کے لیے تگ و دو بھی کی اور سی۔ بی۔ ڈی سے انہیں پرمٹ بھی دلوا دیے۔ مجھے بڑی الجھن تھی کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں ہے۔ اگر اتنی نفرت ہے تو یہ سب رکھ رکھاؤ کس لیے؟ سامنے اتنے ادب آداب کا مظاہرہ کرتا ہے تو پیٹھ پیچھے اتنی نفرت کا اظہار کیوں؟

قرباں کے مقدمے کے متعلق تفصیلی بات چیت ہو چکی تو میری ماں نے گفتگو جاری رکھنے کے لیے نیا موضوع چھیڑا۔ "آپا، اب صفیہ کی شادی کا بھی کچھ سوچیں۔" اس پر صفیہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں میری چھوٹی بہنوں کے پاس چلی گئی۔

"بیٹی، میں تو دن رات اسی فکر میں رہتی ہوں۔ میرے بھائی نے اپنے بیٹے محمود کے لیے اس کا ہاتھ مانگا ہے۔ قرباں تو نہیں مانتا لیکن میں نے ہاں کر دی ہے۔ جس نے ہندوستان کو آزاد کرانے کا قول مارا تھا وہ تو اپنی جان دے کر اس قول کو نبھا گیا۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ میں گھر کی چار دیواری میں رہنے والی لڑکی کو ہندوستان کی آزادی کی چتا میں جھونک دوں۔ پہلے نوکری سے نکالی گئی کہ باپ کانگریسی تھا۔ اب میں اس کی شادی نہ کروں کہ لڑکا انگریزی فوج میں افسر ہے۔ اس غریب کو تو مفت میں دو طرفہ مار پڑ گئی۔ جیسے ہی اب کے محمود چھٹیوں پر آیا، قرباں مانے نہ مانے، میں اس کے ہاتھ پیلے کر کے تین کپڑوں ہی میں رخصت کر دوں گی۔"

احسان کی ماں ان کھرے کھرے لوگوں میں سے تھی جن کی زبان پر وہی کچھ ہوتا ہے جو ان کے دل میں ہوتا ہے۔ زندگی کے مسائل کتنے ہی مشکل کیوں نہ ہوں، وہ ان کا سامنا کر کے نپٹتے ہیں۔ دوسرے انسانوں سے، خواہ وہ کتنے ہی برے کیوں نہ ہوں، کھلے دل سے ملتے ہیں۔ ان لوگوں کی زندگیوں میں کوئی پچھلا دروازہ نہیں ہوتا جس میں سے وقت پڑنے پر چپکے سے کھسک جائیں۔

قرباں کے گرفتار ہونے سے میرا بڑا نقصان ہوا، کیوں کہ اس شام میرا معاملہ چودھری سے بہ

پھوٹا۔ میرے والدین کو پتا چل گیا کہ احسان اگرچہ ہمارے ہاں اب نہیں آتا لیکن میں ہر روز احسان کے ہاں اسے ملنے جاتا ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ ان لوگوں کے جانے کے بعد میری دُرگت بنے گی، لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ ان کے جانے کے بعد میرے باپ نے بُردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری حکم عدولی پر نرمی سے خفگی کا اظہار کیا اور وہی نصیحت جو وہ پہلے کئی بار دیپک راگ میں مجھے سنا چکا تھا، آج ملہار میں سنائی۔

"تیرے بھلے کو تجھے اس سے ملنے سے منع کرتے ہیں ورنہ ہماری احسان سے دشمنی تھوڑا ہی ہے۔ آوارہ مزاج اور غیر ذمہ دار طبیعت کا لڑکا ہے۔ تین مرتبہ فیل ہو چکا ہے۔ اوپر سے اپنے باپ اور بھائی کی سرشت رکھتا ہے۔ جسے خود پھنسنے کا خوف نہ ہو اسے تجھ کو پھنسانے پر کیا ملال ہو گا۔ اب دیکھ، یہ جو فرحان نے خواہ مخواہ خود پر مقدمہ بنوا لیا ہے، یہ کوئی عقل مندی کا کام ہے؟ گھر میں کھانے کو بچتا نہیں، اور وہ مزدوروں کو جگانے کے لیے تقریریں کرتا پھرتا ہے۔ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی تنخواہ گھر میں نہیں آئے گی تو سب بھوکے مر جائیں گے، لیکن آگا پیچھا کچھ نہیں دیکھا، بس تقریر جھاڑ دی۔ سوائے آپا کے یہ سب ایسے ہیں۔ بچاری عورت ذات نے ساری عمر تنہا انھیں لوگوں کی شروع کی ہوئی لڑائیاں لڑنے میں گزار دی۔ بھائی بشیر احمد نے یہی کچھ کیا، اب فرحان نے شروع کر دیا ہے، کل کو احسن بھی یہی کچھ کرے گا۔ ان لوگوں میں دیوانگی کی ایک رگ ہے جو پھڑکے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

میری ماں کہنے لگی: 'باپ پر پوت، پِتا پر گھوڑا۔ آپ ہی کا خاندان ہے۔ آپا بچاری تو باہر سے آکر پھنس گئی۔"

اسی لیے تو اسے سمجھاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس میں وہ رگ ہے، مجھ میں بھی تھی، بلکہ اب بھی ہے۔ کئی بار سوچتا ہوں کچھ کر گزروں۔' یہ کہہ کر وہ ہنسا اور ماں کی طرف تحسین طلب نظروں سے دیکھا۔ پھر بولا: 'بھائی، اُن کی تو حویلی تھی، بیچ کر وقت نکال گئے۔ ہمارے پاس تو اپنا مکان بھی نہیں۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ آپا بڑی بہادر عورت ہے۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور پہاڑ جیسی مصیبت ہنستے ہنستے سہہ گئی۔ سب عزیزوں رشتہ داروں سے ہر حال میں ملنا جلنا رکھا۔ برادری کی غمی خوشی میں شریک رہی۔ کبھی اپنی مصیبت دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی۔ اب صفیہ کا رشتہ ایسی جگہ ہو گیا ہے جہاں بڑے بڑے اپنی بیٹیوں کا رشتہ کرنے کی تمنا کرتے ہیں۔ لڑکا فوج میں کپتان ہے۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ تنخواہ پاتا ہو گا۔ سن رہی ہو؟ مہینا ایک اور روپے پندرہ سو۔ میری تو دس مہینے کی تنخواہ کہیں جا کر اتنی بنتی ہے۔

میری ماں نے لقمہ دیا: 'اللہ نے آپا کے صبر کا پھل میٹھا دیا۔' آخر اس کی بھی سنی گئی۔ ہاں جی، اُس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔"

Scanned with CamScanner

اور ذرا اُس کا حال دیکھو جو میرا بھتیجا ہے، فرحان۔ کہتا ہے انکار کر دو، ہمیں نہیں کرنا یہ رشتہ۔ اسی لیے تو کہتا ہوں کہ ان تینوں کی کھوپڑی اُلٹی ہے۔ پاگل ہیں بالکل۔

چند دن بعد پتا چلا کہ میرے باپ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ چھٹیوں کے بعد مجھے مسلم اسکول سے اٹھا کر گورنمنٹ اسکول میں داخل کرایا جائے گا تاکہ مجھے احسان کی صحبت سے چھٹکارا مل سکے۔ میرے باپ کی اسکیم اس حد تک تو کامیاب رہی کہ اسکول بدلنے سے میرا احسان سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہو کر رہ گیا، لیکن اس تبدیلی سے میری تعلیمی اہمیت اور کردار سازی پر کوئی مثبت اثرات مرتب ہوئے یا نہیں، یہ بات محلِ نظر ہے۔ طبیعت میں آوارگی تو ازل سے تھی۔ گورنمنٹ اسکول میں جلد ہی اپنے مزاج کے لڑکوں سے دوستیاں ہو گئیں۔ ان میں کچھ ہندو اور سکھ لڑکے بھی تھے۔ نئے دوستوں کی صحبت میں آوارہ گردی کے نت نئے انداز سیکھنے میں آئے۔ نیا اسکول چوں کہ میرے گھر سے دور تھا اس لیے مجھے سائیکل خرید دی گئی۔ پہلے تو میری آوارہ گردی کا حلقہ وسیع ہونا شروع ہوا، پھر مزاج میں تیزی سے آتی ہوئی تبدیلی کے زیرِ اثر ترجیحات بدلنے لگیں اور اس کے ساتھ آوارگی کی شکل صورت بھی بدلتی گئی۔ کبھی کبھار سگریٹ پیے جانے لگے، پھر سنیما جانے کی نہ بجھنے والی چاٹ لگی۔ دل چاہنے لگا کہ کچھ ایسا ہو کہ ایک دم سے بڑا ہو جاؤں تاکہ لڑکیاں متوجہ ہو سکیں۔ آئینہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ مونچھیں اب تک وہیں ایک سبزے کی صورت رکی کھڑی ہیں، آگے بڑھنے کا نام ہی نہیں لیتیں۔ سگریٹ بھی دراصل جوان ہونے کی علامت کے طور پر اپنایا گیا تھا۔ حسان کے لبوں اور گالوں پر کالی کالی کائی سی لگ رہی تھی مگر وہ بےوقوف شیو کرنا شروع ہی نہ کرتا تھا۔ شاید داڑھی رکھنے کی فکر میں تھا۔ وہ اب بھی دس پندرہ دن میں ایک آدھ بار مجھے ملنے کے لیے چوری چھپے چکر لگا لیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں ہم چند بار اکٹھے گھومنے بھی گئے مگر اب میں اُس کے ساتھ سیر کرنے سے جلد اکتا جاتا تھا۔ ہم میں شاید کوئی بات مشترک نہ رہ گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اسے ملنے سے مجھے تفاخر تو کیا اُلٹا اپنے ماڈرن اور مقابلتاً کھلے ڈلے دوستوں کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑے تو اسے ساتھ لیے پھرنے سے کیا حاصل۔ ایک مرتبہ مجھے مجبوراً اپنے دوستوں سے اس کا تعارف کرانا پڑا۔ انھوں نے اس کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ خود بھی ان کی صحبت میں بہت بےکل ہے۔ جلد ہی میرے کمرے سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مدن نے پوچھا: "یار، یہ جاجا کیا چیز ہے؟" وہ تینوں ہنسنے لگے۔ میں نے دبی زبان میں اقرار کیا کہ میرا اور اس کا رشتہ دار ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

روسیل کی پسپائی کے بعد دیہی علاقہ مکمل طور پر اتحادیوں کے قبضے میں تھا اور جنگ کا مرکز

وہاں سے یورپ میں منتقل ہو چکا تھا۔ بقیہ جنگ اب وہیں لڑی جانے والی تھی۔ مشرق بعید میں جاپانیوں کی پیش قدمی نہ صرف رک گئی تھی بلکہ اتحادی فوجوں نے جاپانی مفتوحات میں سے چند جزائر واپس فتح کر لیے تھے۔ اب پتہ نہیں جنگی صورت حال کی وجہ سے، یا آپا کے سمجھانے بجھانے سے، یا میں نے اپنے والدین کے رونے پر پانی پانی ہوتے ہوئے اسکول تبدیل کرنے کی اصل وجہ اسے سچ سچ بتا دی تھی، اس کے صدمے سے، لیکن احسان نے یقیناً اپنے تعلیمی پروگرام پر نظرِ ثانی کی تھی کیوں کہ جب میں نویں جماعت میں پہنچا تو وہ بھی نویں میں پہنچ گیا۔ نئی کلاسیں شروع ہوئے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ فرمان کو چھ مہینے کی سزا ہو گئی۔ احسان کو مجبوراً سکول چھوڑ کر کٹڑہ جیمل سنگھ میں کسی مسلمان کی بوٹوں کی دکان پر بطور سیلزمین نوکری کرنی پڑی۔ جب تک فرمان رہا ہو کر دوبارہ کہیں ملازم ہوتا، میں دسویں جماعت میں پہنچ گیا۔ احسان نے ایک سال اور ضائع کر کے پھر مسلم اسکول میں نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اس کا زیادہ تر وقت محلے کے بازار میں واقع ریڈنگ روم میں گزرتا تھا۔ صبح کے وقت لاہور سے آنے والے اردو کے اخبارات پڑھتا اور انگریزی اخبار "ٹریبیون" میں تصویریں دیکھتا۔ شام کو دلی اور کلکتے سے آنے والے انگریزی اخباروں میں تصویریں دیکھنے اُسے پھر آنا پڑتا۔ دکان پر ملازمت کے دنوں میں شام کا آنا بند ہو گیا تھا کیوں کہ دکان سے اُسے چھٹی رات کو دیر سے ملتی تھی۔ ریڈنگ روم کے آس پاس کے چھوٹے چھوٹے دکان دار اُسے باؤ احسان کہتے اور عزت سے پاس بلا کر بٹھاتے۔ جس جگہ وہ بیٹھ جاتا، اس کے گرد دکان داروں کے علاوہ تانگوں کے کوچوان، ریڑھیوں والے اور دوسرے مزدور پیشہ لوگ اس کے چہرے پر نظر جما کر بیٹھ جاتے۔ وہ اس سے تازہ معلومات حاصل کر کے اپنے مستقبل میں جھانکنے کی ناکام کوشش کیا کرتے۔ جب کچھ نظر نہ آتا تو مایوس ہو کر کہتے: "اوجی بادشاہیاں بدلتی رہتی ہیں، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے تو اسی حالت میں اور اسی حیثیت میں رہنا ہے اور رو رو کر بال بچوں کے لیے دو وقت کی روٹی کمانا ہے۔"

خاکساروں کے کشت و خون کے بعد کوئی مسلمان تحریک سامنے نہ آئی تھی۔ پاکستان کے مطالبے میں ابھی جان نہ پڑی تھی، بس ایک بانگ سی تھی جس کی سیاسی وقعت ایک دھمکی سے زیادہ نہ تھی۔ مسلمانوں میں سیاسی سطح پر بظاہر ایک سرد مہری اور لاتعلقی کا رویہ تھا جب کہ دماغوں میں پریشانی اور دلوں میں افراتفری مچی تھی۔ اس سو فیصد مسلمان علاقے میں احسان اپنا کھدر کا کرتا پاجامہ پہنے کانگریس کا موقف، یعنی ہندوستان کی آزادی اور انقلاب کی اہمیت کا پیغام، بڑی تفصیل اور دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے بیان کرتا اور پاکستان کے قیام کی بھرپور مخالفت کرتا۔ اس کے سامعین ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے، منہ سے بہت کم بولتے۔ کبھی کبھار کوئی دبی زبان سے پوچھ بھی لیتا کہ کانگریس میں دو چار کے سوا سب ہندو ہی ہندو بھرے ہیں؛ ان کا

Scanned with CamScanner

کوئی فائدہ ہوگا تبھی تو اس میں دوڑے جاتے ہیں۔ پھر کہنے والے کو، یوسی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ بولا: ۔ انگریز ہندوستان چھوڑے، آزادی ملے۔ یہ سب ایسے ہی رہنا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جناح مسلمانوں کی بات تو کرتا ہے۔ وہاں ایک نوجوان بھی بیٹھا تھا جو شاید احراریوں اور خاکساروں کی صحبت میں رہ چکا تھا۔ اس نے جناح کی تعریف ہوتے دیکھی تو مسلم لیگ کی علی قیادت کی مغرب زدگی اور انگریز نوازی کے واقعات بیان کرنے شروع کر دیے۔ احسان نے مسلمان عوام کے جذبات اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں کانگریس کی مقبولیت تفصیل سے بیان کی۔ نتیجہ ہمیشہ کی طرح ہوا۔ یعنی وہ لوگ جو ہر ذہنی الجھن کا حل تلاش کرنے وہاں آتے تھے، پہلے سے زیادہ الجھن کا شکار ہو کر اٹھ گئے۔ ہندوستان کی آزادی ہندوؤں کے لیے واضح، دو ٹوک، روشن اور ہر الجھن سے پاک سیاسی منزل مقرر تھی۔ مسلمانوں کو کچھ پتا نہ چل رہا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں اور راہ نمائی کے لیے کس پر بھروسا کریں۔ نہیں۔ سیاسی حل آسمان سے گر کر کھجور میں اٹکنے والی بات معلوم ہوتا۔ لے دے کر انھیں ایک ہی بات سوجھتی کہ خلافتِ راشدہ کا دور کسی طرح واپس آ جائے۔ آج کی دنیا میں کیسے زندہ رہنا ہے، اس کے کیا تقاضے ہیں، اس کی طرف نہ کسی کا دھیان تھا نہ دھیان دینے کی صلاحیت۔

پروین پہلے تو معمولی شکل صورت کی لڑکی نظر آتی تھی لیکن دسویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے ایک دمکتی ہوئی، لمبی، چھریری اور حسین دوشیزہ بن چکی تھی۔ اس کے سانولے رنگ پر گویا روغن پھر گیا تھا۔ اس کی سیاہ کالی آنکھیں ہرنی کی آنکھوں کی طرح دلکش ہو گئی تھیں۔ میں اپنی دانست میں کسی داستانی شہزادے کی طرح اس پر دل وجان سے عاشق ہو چکا تھا اور میرے لیے پروین کے وصل یا موت کے سوا کوئی راہ کھلی نہ رہ گئی تھی۔ حقیقت بس اتنی تھی کہ ہم عشق عشق کھیل رہے تھے۔ پہلے وہ گڑیوں سے کھیلا کرتی تھی، اب ان سے فارغ ہوئی تو اپنے آپ کو گڑیا بنا لیا اور مجھے گڈا سمجھ لیا۔ ہمارا عشق کھڑکیوں میں آمنے سامنے کھڑے ہو کر مسکرانے اور ایک دوسرے کو دل نواز نظروں سے دیکھ لینے تک محدود تھا۔ اس سے آگے بڑھنے کا ہم دونوں میں حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ لیکن اسلم، مشتاق، مدن اور راجندر جو میرے کلاس فیلو تھے اور عموماً میرے گھر آیا کرتے تھے، ان کے ہاتھ ایک تماشا آ گیا۔ انھوں نے جھٹ اس کا نام لیلیٰ رکھ دیا اور اس کی نسبت سے مجھے، جو خاصا موٹا تازہ لڑکا تھا، مجنوں کہنے لگے۔ ان کی کوشش ہوتی کہ ہر بات میں کسی نہ کسی طرح لیلیٰ مجنوں کا ذکر آ جائے، اور کچھ نہیں تو اشارتاً ہی سہی۔ ذو معنی انداز میں پُر لطف بات کہنا یا اشارے کنائے میں مزاح کا رنگ دے جانا ہر کسی کے بس میں کہاں ہوتا ہے؟ ان کی کوششیں بسا اوقات بے معنی

Scanned with CamScanner

اور احمقانہ فقروں پر منتج ہوتیں، لیکن ان کے مذاق پر میں دل میں خوش ہوتا اور چاہتا کہ وہ اس موضوع کو ختم نہ کریں۔ ان کے ہر فقرے سے سد اور جلاپا ٹپکتا جو میرے لیے سکون کا باعث ہوتا، پھر ان کی باتوں میں میرے لیے افتخار کا پہلو بھی تھا جس سے عجیب فتح مندی کا احساس دل میں کروٹیں لینے لگتا۔ یہ فتوحات میرے لیے آہستہ آہستہ پروین کے عشق سے، یادہ اہم بن گئی تھیں جو دراصل ان سب باتوں کا منبع تھا۔

مشتاق کا باپ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ اس زمانے میں ایسے عہدے عموماً انگریزوں کے لیے محفوظ ہوتے تھے اور ہندوستانیوں، سے صدر میں شاذونادر ہی آتے تھے۔ اسلم کا باپ ڈاکٹر تھا اور اس زمانے کے ناقابل علاج اور مہلک مرض تپ دق کا خصوصی معالج تھا اور دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹ رہا تھا۔ مدن کے باپ کو انگریزوں نے رائے بہادر کا خطاب عطا کیا تھا اور وہ سیشن جج تھا۔ راجندر ایک بہت امیر ٹھیکےدار کا بیٹا تھا۔ میں ان میں سے نہیں تھا لیکن مرا جاتا تھا کہ کسی طرح ان میں شمار کیا جاؤں۔ میرا کمرہ وہ خرابہ تھا جہاں یہ سب اپنے بدسکوں، خاموش اور سجے سجائے باغ نما بنگلوں کی پابندیوں سے بھاگ کر آزادی کا سانس لینے، یاوہ گوئی کرنے اور سگریٹ پینے آیا کرتے تھے۔ یہاں نوکر نہیں تھے جو ان کی عادات و حرکات اور ملنے والوں کے بارے میں جا کر ان کی ماؤں سے مخبری کرتے۔ ہم چٹائی کے فرش پر مٹی میں اٹے گدھوں کی طرح لیٹتے، قلابازیاں لگاتے، آپس میں گتھم گتھا ہوتے۔ میرے کمرے میں کسی چیز کے ٹوٹنے کا ڈر نہ تھا، سلیقے سے سجائی گئی چیزوں کی ترتیب بگڑنے کا خوف نہ تھا۔ کھل کر گالیاں بکی جاتیں اور طمانیت خاطر سے گندے لطیفے سنائے جاتے۔ ان کے آنے پر میرے والدین کی طرف سے کوئی پابندی نہیں تھی، شاید اس لیے کہ انہیں خوش فہمی تھی کہ ہمارا بیٹا بڑے آدمیوں کے بیٹوں سے دوستی پیدا کر رہا ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ دوستیاں صرف اپنے جیسوں سے نبھ سکتی ہیں؛ بڑوں سے کچھ دیر بعد صرف نیازمندی کا رشتہ رہ جاتا ہے اور چھوٹوں کے ساتھ کرم فرمائی کا۔

ہمارے درمیان گفتگو عموماً فلموں اور ایکٹروں سے متعلق ہوتی یا شہر کے مشہور اور بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کی شکل صورت کا اسکینڈلوں کی روشنی میں جائزہ لینے پر محیط ہوتی۔ کبھی وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے اپنے خاندان کے معیار زندگی کو بہتر ثابت کرنے کے لیے مختلف ہل اسٹیشنوں کی سیر اور کلبوں اور بڑے ہوٹلوں میں آمدورفت کے قصے بیان کرتے۔ کپڑوں کی سلائی کے ڈیزائنوں اور رنگوں کی مطابقت سے ان کے استعمال کے موقعے محل اور وقت کی تفصیلات بتائی جاتیں۔ کتوں کی کمیاب نسلوں، کاروں، گھڑیوں، ریڈیو وغیرہ کے بہتر سے بہتر برانڈ کی ملکیت پر فخر یا انہیں حاصل کرنے کی حسرت کا ذکر ہوتا۔ غرض کچھ شان و شوکت کا اظہار ہوتا، کچھ

Scanned with CamScanner

میں گھبرایا کہ ضرور ان میں سے کسی کے سر پر گرے گا، خدا جانے کیا نقصان کرے۔ لیکن کیا ہو سکتا تھا، تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ ایک ہی امید تھی کہ شاید فٹ پاتھ پر جا گرے اور میں شرمساری اور ندامت سے بچ جاؤں۔ وہ سیدھا درمیان والی لڑکی کے بلاؤز میں سے اندر چلا گیا۔ مگر وہ چیخی چلائی نہیں، جلن کی شدت سے سی سی کرتی جلدی جلدی اپنے پیروں پر وزن بدلنے لگی۔ دوسری لڑکیاں باری باری انگلیاں ڈال ڈال کر سگریٹ کا جلتا ہوا ٹکڑا نکالنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ نکل نہیں رہا تھا۔ اسلم نے پیڈل پر پاؤں مارا اور ہوا ہو گیا۔ ہم تینوں ان کے سامنے شرمسار کھڑے کسی طرح ان کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ تھوڑی دیر میں اس بے آباد سڑک پر پتا نہیں اتنے سارے لوگ کیسے اکٹھے ہو گئے۔ ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ کیا ہوا، کیا ہوا۔ اتنے میں چار لڑکے، جو عمر میں ہم سے خاصے بڑے تھے، دو سائیکلوں پر سوار اُدھر آ نکلے۔ انھوں نے موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہیرو بننے کی پوری کوشش کی۔ پہلے تو لڑکیوں سے بڑے ادب کے ساتھ پوچھا کہ کیا ہوا۔ جب انھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو ہماری طرف متوجہ ہوئے کہ "تم نے کچھ کیا ہے؟ بتاؤ کیا کیا ہے؟" اتنے میں لڑکیوں نے سگریٹ کا ٹکڑا نکال لیا اور بغیر کچھ کہے تیزی سے واپس چل پڑیں۔ میں نے شکر کا سانس لیا کہ اب جو کچھ ہوگا نپٹ لیں گے۔ اس بچاری پر میرے ہاتھوں کا لایا ہوا عذاب تو ختم ہوا۔ وہ چار لڑکے جو لڑکیوں کے سامنے غم و غصے کی تصویر بنے ہوئے تھے اب کھڑے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ ان میں سے ایک نے ہم سے مخاطب ہو کر کہا: "مانتا پڑے گا یار، تم میں سے جس نے بھی نشانہ لگایا بڑے غضب کا لگایا۔" ہم اس ڈر سے کہ کہیں لڑکیوں کے وارث ہمیں آ کر پکڑ نہ لیں، فوراً واپس دوڑ پڑے۔ خیر گزری کہ کوئی ہمارے پیچھے نہ آیا۔

ہم سمجھے کہ بات ختم ہو گئی، لیکن لڑکیوں نے اسلم کو، پڑوسی ہونے کی وجہ سے، اس کے فوراً غائب ہونے کے باوجود پہچان لیا تھا۔ اس سے دوسروں کے بارے میں بھی پتا چل گیا۔ چند دنوں کے اندر اندر واقعے کی اطلاع پوری تفصیلات کے ساتھ باقی دونوں کے گھر بھی پہنچ گئی۔ تینوں نے سارا الزام میرے سر تھوپ دیا۔ میرے باپ سے غالباً اس لیے شکایت نہ کی گئی کہ اس طرح کے نازک معاملات میں جن میں لڑکیوں کا ذکر آتا ہو، کمتر لوگوں کے منہ آنا اور زیادہ بدنامی کا سبب بن سکتا تھا۔ راجندر کے باپ نے میری شکایت ایک پرائیویٹ خط کی صورت میں ہیڈ ماسٹر کو لکھ بھیجی کہ آپ کے اسکول کے سعید جیسے غنڈا عناصر ہمارے مقابلتاً معصوم بچوں کو ورغلا کر اس طرح بھی بھیانک اور خطرناک شرارتوں کے مرتکب ہو رہے ہیں اور ان کی سرزنش اور تادیب کرنا آپ کا فرض ہے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ تو خیر گزری کہ چند دن بعد دسویں جماعت کے طلبا امتحانات کی تیاری کے سلسلے میں کلاسوں سے فارغ ہونے والے تھے۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھے بلا کر

Scanned with CamScanner

خوب ڈانٹا مگر رحم کھاتے ہوئے چھوڑ دیا اور میرے باپ کو بھی طلب نہ کیا۔ اس واقعے کے بعد ان تینوں کا میرے گھر آنا جانا اور ہمارا اکٹھے گھومنا پھرنا ختم ہو گیا۔

جنگ جب تک ہوری تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کرۂ ارض پر نہیں، کسی اور سیارے پر ہو رہی ہے جس سے یہاں کے رہنے والوں کو کوئی سروکار نہیں۔ اس کے اثرات مہنگائی اور اشیائے ضرورت کی کمیابی کی صورت میں ضرور تکلیف دہ حد تک محسوس ہوتے۔ کبھی کبھار بلیک آؤٹ کی مصیبت بھی جھیلنا پڑتی۔ ہر تیسرے مہینے پبلک کو ہوائی حملوں سے بچاؤ کی تربیت دینے کے لیے جھوٹ موٹ کا ہوائی حملہ تصور کر لیا جاتا۔ سائرن بجتا اور پولیس والے ہوائی حملے کا مذاق اڑاتے لوگوں کو سڑکوں سے ہٹانے کے لیے پاگلوں کی طرح دوڑتے پھرتے۔ اتنے بڑے پیمانے پر ڈرامے کو کامیابی سے کھیلنے کے لیے جب تک عوام کا رضاکارانہ تعاون شامل نہ ہو تو پورا معاملہ ترازو میں مینڈک تولنے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پوری جنگ کے دوران کسی نے بم گرتے یا پھٹتے دیکھنا تو کجا، بندوق تک چلتی نہ دیکھی تھی۔ اُدھر دنیا کی مہلک ترین جنگ لڑی جا رہی تھی جس میں کروڑوں بے گناہ انسان موت کی آغوش میں چلے گئے، اور یہاں یار لوگوں کے لیے یہ سب ایک کھیل سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا کیوں کہ یہ ہماری جنگ نہ تھی۔ میرے بے فکرے دوستوں کو شکایت تھی کہ جنگ محض اس لیے شروع ہوئی کہ وہ ہوش سنبھالنے سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک نفیس چینی ریشمی ملبوسات اور عمدہ ولایتی سوٹنگ سے محروم رہیں۔ انھیں یقین تھا کہ یہ جنگ قیامت سے پہلے کسی صورت ختم نہیں ہو سکتی۔ انھیں بہت دکھ تھا کہ ان کے والدین نے ان نادر چیزوں سے اپنی جوانی میں جی بھر کر استفادہ کیا جبکہ وہ خود محروم رہ گئے۔

احسان جب کبھی آتا تو مجھے علیحدگی میں لے جا کر ایک ہی نصیحت کرتا کہ دیکھو، پروین سے دوستی کی کوشش نہ کرنا، اپنے محلے میں ایسی حرکت نامناسب ہے۔ لیکن اگر تمھیں اس سے دلی لگاؤ ہو گیا ہے تو وہ کبھی تمھارے دوستوں کی موجودگی میں کھڑکی میں آ کر کھڑی نہ ہو۔ ان سے پردہ کرے۔ تمھاری غیرت کیسے قبول کر سکتی ہے کہ وہ منہ کھولے سب کے سامنے آ کھڑی ہو؟ اس نصیحت کا بھی وہی حشر ہوا جو ہمیشہ سے دنیا میں نصیحتوں کا ہوتا چلا آیا ہے۔ ایک کان سے سن کر دوسرے سے اُڑا دی گئی۔ میرے دوستوں کو پروین سے شکایت ہی یہ تھی کہ وہ ان کے وہاں ہوتے کھڑکی میں آ کر کیوں جلوہ افروز نہیں ہوتی۔ میری اور پروین کی چاہت، جسے اس زمانے میں میں خود بھی محبت سمجھتا تھا، محبت کم اور میری خودنمائی کا ذریعہ زیادہ تھی۔ جب انھیں پروین سے اپنی ملاقاتوں کے رنگین افسانے گھڑ گھڑ کر سناتا تو وہ انھیں سسی اور سوہنی کی ہم پلہ نظر آنے لگتی۔

میری خوش قسمتی پر ان کے سینے حسد سے یوں تپنے لگتے کہ اگر ان پر پانی کا چھینٹا دیا جاتا تو بھاپ شُوں شُوں کی آواز آتی۔ میری باتوں سے ان کا اشتیاق ایسا بھڑکا کہ ایک بار بیچارے میرے ساتھ اسکول سے بھاگے اور کئی گھنٹے تیز دھوپ میں اس کے اسکول کے راستے پر کھڑے رہے کہ کم از کم ایک بار اُسے دیکھ تو لیں۔ اس کی خوب صورتی پر اور زیادہ دکھی ہوئے۔ مجھے دیکھ کر وہ ہلکے سے مسکرائی تو بالکل ہی راند ہو گئے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ساتویں آسمان پر چل رہا ہوں۔ گلیوں میں پلنے والے چھوکروں کی نسبت بنگلوں کی تنہائی اور والدین کی خصوصی پناہ میں بڑھنے والے بچے، زندگی کی حقیقتوں کا سامنا دیر سے ہونے کی وجہ سے، لڑکپن میں سادہ اور بھولے ہوتے ہیں۔

جنگ کا ختم ہونا تھا کہ کسی نے ہندوستان کے سیاسی ماحول میں گویا بجلی کا کرنٹ چھوڑ دیا۔ فضا میں روز بروز ایسا کھنچاؤ اور تناؤ پیدا ہوتا جا رہا تھا کہ تمام لوگ، کوئی اندازہ نہ لگا پانے کے باوجود، اپنے دلوں میں محسوس کرتے کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ کیا ہونے والا ہے، یہ کچھ پتا نہ چلتا۔ بڑے بڑے سیاسی لیڈر بھی نہ جانتے تھے کہ مستقبل کے دھندلکے سے کیا ظہور پذیر ہوگا۔ گلیوں اور بازاروں میں لوگوں کے مابین گرما گرم مباحثے ہو رہے تھے۔ قیاس آرائیاں زوروں پر تھیں۔ سماجی اور بالخصوص مذہبی بنیادوں اور تاریخی حوالوں سے کھلے عام، کسی رکھ رکھاؤ کے بغیر، گھٹیا جذباتیت اور رقیق خود رحمی کا مظاہرہ کیا جاتا۔ جن دنوں مسلمانوں میں مسلم لیگ کا شہرہ عام ہوا اور پاکستان کا غلغلہ بلند ہونے لگا، اس زمانے میں بیشتر مسلمانوں کی طرح میرا باپ بھی حصولِ پاکستان کا زبردست حامی بن گیا۔ ہماری گلی میں ہر رات کھانے کے بعد مکانوں کے چبوتروں پر محلے کے بزرگ اور معتبر لوگ بیٹھ کر سیاست پر گفتگو کرتے۔ نوجوان اور لڑکے بالے وہاں بیٹھ سکتے تھے لیکن بولنے اور رائے دینے کی اجازت نہ تھی۔ پاکستان کے معترضین سے میرا باپ کہتا: "کانگریس کو ہم سے زیادہ کون جانتا ہے؟ ہمارا تو خون اس کی بنیادوں میں شامل ہے۔ میرا اپنا بڑا بھائی کانگریس کی خاطر جیل کے اندر تپِ دق سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا، لیکن اب ہم گاندھی اور نہرو کی چال بازیوں اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کے ازلی تعصب کو سمجھ چکے ہیں۔ یہ تعصب کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان کے مسلمان اپنی بقا کے لیے الگ وطن کا نعرہ لگانے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہی اس کا حل ہے۔"

پوچھا جاتا: "جو مسلمان ہندوستان میں رہ جائیں گے، ان کا والی وارث کون ہوگا؟"

جواب ملتا: "پاکستان میں رہ جانے والے ہندوؤں کی حفاظت کے ضامن ہوں گے۔"

ان دنوں لیڈروں سمیت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مذہب کی بنیاد پر آبادی کا تبادلہ بھی ہوگا اور اتنے بڑے پیمانے پر ہوگا۔ بعد میں تقسیم کے وقت پنجاب میں بے گناہوں کا جتنا خون بہایا گیا اتنا انسانی تاریخ کی سب سے خونیں ترین جنگ میں بھی اسی قدر رقبے پر نہ بہا ہو

Scanned with CamScanner

گا۔

مولوی کرم دین نے کہا: "میاں ووٹ کے بٹے کی توشدیاں کبھی نہیں چلتیں۔ دو ملک اور دو دشمن قومیں ووٹ کے بٹے کی بنیاد پر اقلیتوں کی حفاظت کیسے کر سکیں گی؟"

آخری دو برسوں میں جب مسلم لیگ کی مقبولیت گھر گھر پہنچ گئی اور بچہ بچہ دیوانہ وار پاکستان زندہ باد کے نعرے لگانے لگا تو مولوی کرم دین جیسے معترض اپنی جان کے خوف سے دم بخود اور لب بستہ ہو گئے۔ جذباتیت کے سیلاب میں عقلی دلائل اور منطقی نتائج سب تنکوں کی طرح بہتے نظر آئے۔ حسن خاص طور پر مجھ سے یہ کہنے کے لیے آتا: "اس شورشرابے پر نہ جانا، یہ سب انگریز کی مکاری کا نتیجہ ہے۔ اس نے ہندوستان کو ہاتھ سے نکلتے دیکھا تو اس کے ٹکڑے کرنے پر تل گیا تاکہ ہندوستان ایک عالمی طاقت کے طور پر نہ ابھر آئے۔ خبردار! مسلم لیگ کے ساتھ ہو کر اس گناہ میں حصے دار نہ بننا۔"

پاکستان بننے کے بعد کا ذکر ہے۔ کسی متروکہ جائیداد کے سلسلے میں میرے باپ کا مطالبہ کسی وجہ سے متعلقہ افسر کو قبول نہ تھا۔ میں ساتھ تھا۔ اس پر میرے باپ نے اس قدر واویلا مچایا کہ میں پریشان ہو گیا۔ گلی کے چبوترے پر بیٹھ کر مولوی کرم دین سے اختلاف رائے کو وہ کہہ رہا تھا کہ "ہم نے گلی گلی کوچے کوچے میں مسلم لیگ اور پاکستان کے دشمنوں سے نظریاتی جنگیں لڑیں۔"

جب میں کالج میں تھا تو پنجاب میں خضر حیات کی حکومت کے خلاف مسلمان طلبا نے ہال بازار میں جلوس نکالا۔ نوے فیصد پولیس مسلمانوں پر مشتمل تھی اور ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ انھوں نے مظاہرین پر ہلکا سا مصنوعی لاٹھی چارج کیا۔ ایک بید میری ران پر بھی لگا۔ جلوس میں میں چونکہ آگے آگے تھا اس لیے تھانے لے جایا گیا۔ چند دوسرے طلبا کے ساتھ دو تین گھنٹے وہاں بیٹھا رہا۔ شربت وغیرہ سے ہماری تواضع کی گئی۔ شام ڈھلے گھر آ گیا۔ اس بات کا بتنگڑ میرے باپ نے یوں بنایا کہ: "ہم نے اس پاکستان کو بنانے کی خاطر ڈانگیں کھائیں، بازاروں میں گھسیٹے گئے، جیلیں کاٹیں۔ فسادات میں بہن بھائی کٹ گئے، مکان جل گئے، جائیدادیں لٹ گئیں، اس کا یہ صلہ دے رہے ہو؟" وہ افسر ڈر گیا۔ جیسے میرا باپ کہتا تھا ویسا کر دیا تو وہ افسر کے ہاتھ چوم کر سلامت تشکر کہتا باہر آ گیا۔

اتنی شدید نفرت کے مسلسل ابھارے جانے کے لازمی نتیجے کے طور پر خوفناک فسادات بھڑک اٹھے۔ جنھوں نے پوری جنگِ عظیم کے دوران بندوق چلتی نہ سنی تھی، وہ دنیا میں اپنے حصے کے تشدد کی باری لینے کے لیے بے قرار، خنجر اور کرپانیں اٹھائے بے گناہ انسانوں کو کاٹ کاٹ کر پھینک رہے تھے۔ فرد اپنے ہم مذہبوں کے اعداد و شمار میں ضم ہو کر غائب ہو گیا۔ اکائی بے معنی، بے مقصد چیز تھی جسے کاٹ پھینکنے میں کوئی حرج نہ تھا، مجموعی تعداد ہی سب کچھ بن گئی۔ اپنے ہم

Scanned with CamScanner

مذہبوں کے مقابلے میں دوسرے مذہب کے مارے جانے والوں کی تعداد کا اعلان کرکٹ کے اسکور کی طرح بڑے فخر سے کیا جاتا۔

فسادات جو چلے ہیں تو پندرہ اگست کے بعد تک وقفے وقفے سے جاری رہے۔ یومِ آزادی پر ہم اپنے محلے میں لوہے کے بڑے بڑے دروازوں کے اندر قلعہ بند بیٹھے تھے۔ احسان اور اس کے گھر والے مہاراجہ پٹیالہ کے علاقے میں ایسا غیر محفوظ مکان چھوڑ کر ملحقہ محلے شریعت پورہ میں اٹھ آئے تھے۔ اس محلے کے بھی لوہے کے دروازے ہر وقت بند رہتے۔ ایک محلے سے دوسرے محلے میں جانا ہوتا تو پہلے چار پہرے داروں سے اجازت لینا ہوتی۔ دو اپنے محلے کے اور دو دوسرے محلے کے۔ ایک طرف کا چوکیدار آواز دے کر دوسری طرف کے چوکیدار کو مطلع کرتا کہ فلاں شخص آ رہا ہے، آنے دے؟ وہ کہتا کہ ہاں، آنے دو۔ تو وہ شخص دونوں محلوں کو تقسیم کرنے والی پکی سڑک کو، جو کسی زمانے میں بارونق ہوتی تھی اور اب بالکل سنسان تھی، دوڑ کر عبور کرتا اور تب دوسرے محلے میں پہنچتا۔ سخت اہم مقصد کے سوا اس آمدورفت کی حوصلہ شکنی کی جاتی۔ احسان کا ماموں جو اندرون شہر رہتا تھا، مجبور ہو کر وہاں سے نکلا اور خاندان سمیت کسی رشتے دار کے ہاں شریعت پورے ہی میں پناہ گزین ہوا۔ ہندو اکثریت کے شہر میں مسلمانوں کی اجتماعی مزاحمت ختم ہو چکی تھی۔ تقریباً پورے شہر کی مسلمان آبادی جان بچانے کی خاطر ان دو محلوں میں سمٹی ہوئی تھی۔ ایک ایک مکان میں چھ چھ خاندان ٹھنسے ہوئے تھے۔ خوراک تو کجا، ہوا بھی ناکافی ہو رہی تھی۔ ہر طرف بدبو پھیل رہی تھی۔ ڈیڑھ سو برس کی انگریزوں کی غلامی سے نکل کر آج آزاد ہندوستان وجود میں آیا تھا۔ پاکستان ایک دن پہلے بن چکا تھا۔ اس شہر کے شکست خوردہ مسلمانوں کے دل ٹوٹے ہوئے، رنگ زرد اور چہرے اترے ہوئے تھے۔ ہر لحظہ یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ اب حملہ ہوا کہ اب ہوا۔ خوش قسمتی سے آخر تک نہ ہوا۔ یوں کہ ہندوؤں اور سکھوں کو گمان تھا کہ مسلمانوں کے پاس بہت اسلحہ اور افرادی قوت ہے۔ حتیٰ کہ یہ سب لوگ محلوں کے قریب لا کھڑی کی گئی ٹرینوں میں سوار ہو کر بہ حفاظت پاکستان پہنچ گئے۔

سال ڈیڑھ سال پہلے صفیہ اور محمود کی شادی ہوئی تھی اور ہم نے بھی بڑی شان سے اس میں شمولیت کی تھی۔ آزاد ہندوستان کی پہلی صبح محمود وردی پہنے، بلوچ رجمنٹ کے چند سپاہیوں کے ساتھ فوجی ٹرک میں ہماری گلی کے سامنے والی سڑک پر آ کے رکا۔ لوہے کے دروازے پر پہرے داروں کو اپنی شناخت کرا کے ہمارے پاس پہنچا اور میرے باپ کو بتانے لگا کہ وہ پہلے اندرون شہر گیا تھا۔ اس نے چچا والے گھر کو کوئلوں کی انگیٹھی کی طرح دہکتا ہوا پڑا دیکھا۔

دھوئیں سے سیاہ عقبی دیوار آسمان تک اونچی اکیلی کھڑی تھی؛ اس کے پاس وقت ہوتا تو اُسے بھی گرا دیتا۔ اس نے اپنے سو سال پرانے آبائی مکان سے ایک دہکتا ہوا کوئلہ اٹھا کر سگریٹ سلگایا اور پلٹ کر احسان کے گھر کی طرف چل پڑا۔ وہاں سے ریلوے لاس کے پاس ایک سکھ کی لاش اوندھے منہ پڑی نظر آئی۔ پاس ہی اُس کی سائیکل گری پڑی تھی۔ مکان بند تھا۔ حوصلہ ہوا کہ یہ لوگ زندہ ہوں گے؛ آبائی مکان کے کھنڈر دیکھ کر اپنے والدین اور بہنوں کو تو دل میں رو چکا تھا

میرے باپ نے کہا: 'گھبراؤ نہیں، سب زندہ ہیں اور شریف پورے میں عبداللطیف کے مکان پر ہیں۔"

پھر ناشتہ کرتے ہوئے محمود نے بتایا کہ احسان والی اُس چھوٹی سی بستی کے سب مکان بند تھے۔ سنسان گلیوں میں کتے گھوم رہے تھے۔ لاش کی بدبو پھیلی ہوئی تھی، خاموشی تھی اور عجیب طرح کی ہیبت طاری تھی۔ آم کے ایک پیڑ سے شور مچاتے توتوں کی ایک ڈار یک رنگی اڑی اور اس کے سر پر سے چیخیں مارتی نکل گئی۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا: 'میرا ہاتھ فوراً پستول پر گیا۔ میں سمجھا دشمن نے کچھ کیا ہے۔ سکھ کی لاش تو پڑی تھی ویسے ہی۔'

میرا دل چاہا کہ پوچھوں ان میں وہ توتا بھی تھا جس نے ایک دفعہ اڑتے ہوئے پلٹ کر مجھے دیکھا تھا اور ہنس دیا تھا۔ پھر سوچا کہ کیا خبر وہ پاکستان جا چکا ہو۔

میرے باپ نے کہا: 'بھائی بشیر احمد زندہ ہوتے تو اپنی محنت کو پھل لاتے دیکھ کر کتنا خوش ہوتے۔ کانگریس کی حکومت میں اچھا منصب پاتے۔ کچھ ہم جیسوں کا بھی بھلا ہو جاتا۔"

'لیکن بچا، میں ہیڈکوارٹر کی اطلاع پر بات کر رہا ہوں کہ پنجاب میں کوئی کانگریسی مسلمان ایسا نہیں ہے جس نے ہندو فسادیوں کے ہاتھوں نقصان نہ اٹھایا ہو۔ کچھ کے گھر لٹ گئے، کچھ کے جلا دیے گئے، حتیٰ کہ کچھ تو جان سے مار ڈالے گئے۔ پھوپھی اور ان کے خاندان کو کیا تحفظ ملا؟"

محلّہ ہر طرف سے بند ہونے کے سبب اور آبادی کے چھ گنا بڑھ جانے کی وجہ سے گلیوں میں ہر وقت ہجوم منڈلا رہا ہوتا۔ چبوتروں، چارپائیوں اور زمین پر بیٹھے، موت کا انتظار کرتے خاموش لوگ خوف زدہ، پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ کبھی خود کلامی کے سے انداز میں ساتھ والے کے کان میں پوچھ لیتے: "بھائی صاحب، اب کیا ہو گا؟"

"جو سب کے ساتھ ہو گا وہی ہمارے ساتھ بھی ہو گا۔ ویسے آپ گھبرائیں نہیں، اللہ کے فضل سے اچھا ہی ہو گا۔"

پانچ منٹ بعد دوسرا شخص پہلے شخص سے وہی جواب خود سننے کے لیے پوچھتا: "بھائی صاحب، اب کیا ہو گا؟" اور وہ اُسی سے سنا جواب فارمولے کے مطابق دُہرا دیتا۔ سہمے ہوئے بچوں کے غول دن بھر گلیوں میں پکڑائی کے ڈولتے پھرتے۔ شرارت کرنا تو کسی کو کیا یاد رہتا، اونچی آواز

Scanned with CamScanner

میں بات کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

محمود ناشتہ کر چکا تو میرے باپ نے عاجزی سے درخواست کی: "اگر ٹرک میں جگہ ہو تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیں۔"

اس نے کہا: "ٹھیک ہے، چلیے۔ لیکن سامان لے جانے کی گنجائش نہ ہوگی۔"

"سامان کیا کرنا ہے جی۔ جانیں ہی بچ جائیں تو بہت ہیں۔ ہمارے لیے تو آپ رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔"

"یہاں سے اکٹھے نکلتے ہیں۔ شریعت پورے سے اُن لوگوں کو بٹھا کر لاہور نکل چلیں گے۔"

لاہور جانے کا فیصلہ ہوا تو میں دوڑتا ہوا اپنے کمرے میں جوتا بدلنے گیا۔ سامنے کھڑکی میں پروین کھڑی تھی: بکھرے بال، میلے کپڑے، اداس چہرہ۔ ان چند دنوں میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ دل میں اُتری جا رہی تھی۔ محمود کو دیکھتے ہی پورے محلے میں ہمارے پاکستان جانے کی خبر پھیل چکی تھی۔ اُسے بھی پتا چل گیا تھا۔ ایک عجیب طرح کی مسکراہٹ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے پر لہرا کر مٹ گئی۔ اس مسکراہٹ میں دکھ، تاسف، گلہ، ندامت، ان میں سے کچھ بھی نہ تھا۔ میں آج تک اس کی سیکڑوں تاویلیں کر چکا ہوں لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ابھی میں اس کے سامنے کھڑا تھا کہ اس نے آہستہ سے کھڑکی بند کر کے کنڈی چڑھا لی۔ کھڑکی بند کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ہر تاثر سے خالی تھیں۔

ہم گھر سے باہر آئے تو لوگوں کا ایک ہجوم اُسے نجات دہندہ سمجھتے ہوئے انتظار میں کھڑا تھا۔ سب پکارنے لگے: "ہمارا کیا بنے گا؟ ہمیں کب پاکستان لے جائیں گے؟ ہمارا کیا حشر ہو گا؟" محمود چبوترے پر کھڑا ہو گیا اور ایک شخص سے بولا: "بتائیے آپ کیا جاننا چاہتے ہیں؟ باقی لوگ خاموش رہیں۔"

اس نے کہا: "ان دو محلوں میں ہزاروں مسلمان جمع ہیں۔ ان کی حفاظت اور انھیں پاکستان پہنچانے کے کیا انتظامات ہیں اور کب تک پہنچائیں گے؟"

محمود نے کہا: "مجھے کچھ پتا نہیں، ورنہ کسی اور کو اس بارے میں کوئی علم ہے۔ میں تو اپنے والدین اور چند عزیزوں کو پاکستان لے جانے کے لیے ایک ٹرک کا بمشکل انتظام کر سکا ہوں۔ آپ کے انخلا کے لیے کوئی پروگرام نہیں بنایا گیا ہے۔ مکمل افراتفری کا عالم ہے۔ ہمارے پاس فوج کی بہت محدود نفری ہے۔ اتنی بڑی آبادی کی منتقلی کا جوں کہ پہلے کسی نے نہیں سوچا تھا اس لیے کوئی اسکیم یا پلاننگ موجود نہیں۔ ہم جدھر خطرہ زیادہ سمجھتے ہیں اُدھر دوڑ پڑتے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں آپ لوگوں کی کوئی فوری مدد نہیں کر سکتا، البتہ ہیڈکوارٹر میں آپ کی آواز پہنچانے کا وعدہ کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ جلد کچھ ہو گا۔ فی الحال اپنے تحفظ کے لیے آپ کو اپنے وسائل پر بھروسا کرنا ہو گا۔"

مرجھائے ہوئے چہرے جو امید کی کرن سے چمک اٹھے تھے، پھر مرجھا گئے۔ بہت سے لوگوں نے ذاتی طور پر درخواستیں کیں کہ میری بیمار ماں کو لے جائیں، میری بیٹی کو لے جائیں، مجھے لے چلیں، مگر محمود نے نرمی سے انھیں سمجھایا کہ ٹرک میں گنجائش نہیں ہے۔

ہم ٹرک کی طرف چلے تو گلی میں اتنے لوگ کھڑے ہمیں حسرت سے تک رہے تھے کہ راستا بنانا مشکل تھا۔ سب سے آگے محمود چل رہا تھا، پھر میرا باپ لوگوں سے ہاتھ ملاتا آگے بڑھ رہا تھا، اس کے پیچھے میری ماں بغل میں زیوروں کی پوٹلی دبائے چل رہی تھی، پھر دونوں بہنیں تھیں اور آخر میں میں چلا جا رہا تھا۔ میں نے لوہے کے دروازے سے باہر نکلنے سے پہلے مڑ کر دیکھا، پروین کی کھڑکی بند تھی۔ اونچے فوجی ٹرک میں سوار ہو کر میں نے کھڑے ہو کر پھر نظر ڈالی، کھڑکی بدستور بند تھی۔ شاید اس نے اپنے دل کی کھڑکی بھی مجھ پر ہمیشہ کے لیے بند کر دی تھی۔ مگر عجیب بات ہے کہ میرے اپنے دل کی کھڑکی جو پہلے کبھی کھلی نہ لگتی تھی، کسی تیز ہوا کے زور سے یک دم کھل گئی۔ تقریباً چالیس برس گزر چکے ہیں، وہ نہ تو خود پلٹ کر آئی نہ اس کی کوئی خبر ملی۔

احسان کو ملنے پہنچا تو خیال تھا کہ بستر میں پڑا ہائے ہائے کرتا ہوگا اور بالیں کے ساتھ لگی میز پر دواؤں کی شیشیاں بھی ہوں گی؛ آخر اتنا بڑا آپریشن ہے۔ میں فلیٹ کی سیڑھیوں ہی میں تھا کہ اُس کے بلند بانگ قہقہے کی آواز سنائی دی۔ ارے، یہ تو نَل کی طرح بج رہا ہے۔ اس کی ٹوپی اتروا کر سر پہ بال لالی نے رکھوا دیے تھے، کھدّر کا پہناوا پاکستان نے چھڑوا دیا تھا، اور پتلون اس نے خود پہن لی تھی۔ شکل ویسی ہی جھڑوس رہی جیسی ہمیشہ سے تھی۔ نقلی دانت لاپروائی سے ایسے بدنما کر لیے تھے کہ کسی کے اصلی دانت بھی ایسے بدنما کیا ہوتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی بے رونق آنکھیں اب بھی ہر وقت اُسی طرح تیزی سے ناچتی رہتیں، جس سے نئے ملنے والوں کو خیال ہوتا کہ بڑا تیز طرار اور مکار آدمی ہوگا جو کہ وہ نہیں تھا۔ سانولے رنگ پر شاید بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے چہرے پر جگہ جگہ راکھ سی جم گئی تھی۔ جلد پر چمک تو پہلے بھی کوئی خاص نہ تھی، اب تو بالکل ہی بھینس کا چمڑا بن کر رہ گئی تھی۔

پاکستان پہنچنے پر احسان لاہور چھاؤنی میں محمود کی کوٹھی میں جو آ کر گھسا ہے تو پھر چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالا۔ میں ایک دو بار شہر سے کرائے کی سائیکل لے کر بڑی مشکل سے اُسے ملنے گیا لیکن اس نے کہیں آنے جانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ جن لوگوں کے سامنے برسوں پاکستان کی بھرپور مذمت کرتا رہا، اب اسی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو کر اُن کا سامنا کس منہ سے کروں۔

Scanned with CamScanner

وہاں کوٹھی سے شہر جانے کے لیے صبح نکلتا اور رات گئے لوٹتا۔ دس دن کی محنت کے بعد وہ کرشن نگر میں مکان اور برانڈرتھ روڈ پر (جہاں لوہے اور مشینری کی مارکیٹ تھی اور اب بھی ہے) دکان الاٹ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ کارخانوں میں کام کرنے کی وجہ سے اسے لوہے اور مشینری کے دھندے کی شُدبُد تھی۔ اب وہ ایک کامیاب، کروڑپتی تاجر اور کارخانے دار ہے۔ اُن دنوں ابھی مہاجروں کا بہت زیادہ رش نہ ہوا تھا اس لیے جس الاٹمنٹ میں ایک عام مہاجر کو زیادہ سے زیادہ دو دن لگتے، وہاں کو دس دن لگے، کیوں کہ اس کے شہر کے دوسرے مذہبی شکایت کرتے کہ یہ کانگریسی ہے۔ اس کا باپ بھی کانگریسی تھا اور جیل میں مرا۔ اسے کہو کہ ہندوستان واپس جائے، یہاں کیا لینے آیا ہے؟ یہ جائیداد ہمارا حق ہے۔ چھوٹے اہلکار دب جاتے۔ آخر ایک بڑے افسر نے حوصلہ کر کے فیصلہ لکھا کہ اب یہ آ گئے ہیں تو انہیں یہیں رہنا ہے، اور ہر لحاظ سے مہاجر کی تعریف میں آتے ہیں اس لیے انہیں رہنے کے لیے مکان اور روزگار کے لیے دکان الاٹ کرنا ضروری ہے۔ شکایت کرنے والوں سے اس نے زبانی کہا کہ پرانی باتیں بھول جائیے۔ جو یہاں آ گئے ہیں پاکستانی ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔

میرے باپ نے بھی تجارت کرنے کی سوچی اور کپڑے سے بھری ایک دکان الاٹ کرا کے ظہیر ریشمی کے نام سے ریشم و کمخواب کا سوداگر بن گیا۔ میں نے احسان سے کہا: "صافی، ہندو جو سب کچھ چھوڑ گئے ہیں، تو بھی اس میں ہاتھ دھو لے۔ کچھ بھاگ دوڑ کر اور کوئی دکان الاٹ کرا لے۔"

اس نے کہا: "میں وہاں نوکری کرتا تھا، یہاں بھی نوکری کروں گا۔ کسی کو اپنے سیاسی خیالات کی خبر نہ ہونے دوں گا، ننگِ انسانی اور شرپسندی سے بیزار رہوں گا۔ ویسے اب میرے کوئی سیاسی خیالات ہیں بھی نہیں۔ پاکستان بن گیا ہے، قائم رہے۔ لیکن جن مسائل کے حل کے لیے تقسیم کرائی گئی ہے یہ اُن کا حل ثابت نہ ہو سکے گی۔" فرمان آپا کو ساتھ لے کر الاٹ شدہ مکان میں منتقل ہو اور احسان امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک برٹش کمپنی کے دفتر کے اکاؤنٹ ڈیپارٹمنٹ میں کلرک ہو گیا۔ بعد میں ترقی کر کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچا۔ افسران اس کی دیانت اور محنت سے خوش تھے اور ساتھی اس کی شیریں بیانی اور ہمدردانہ رویے کی وجہ سے عزت کرتے تھے۔ علاج کے اخراجات کے لیے جتنا پراویڈنٹ فنڈ سے قرض مل سکتا تھا لے لیا، باقی رقم کمپنی نے ازراہِ مہربانی فراہم کر دی۔

مجھے دیکھا تو ہنستے ہوئے نعرہ لگایا: "او میرا یار آ گیا!" کچھ دیر سراپا محبت بنا بازو پھیلائے

کھڑا رہا پھر آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ اس کے دو دوست اور دو سہیلیاں وہاں بیٹھی تھیں۔ جب انھوں نے ایک گرو کو، ایک اجنبی کی اس قدر گرم جوشی سے پذیرائی کرتے دیکھا تو وہ چاروں بھی کھڑے ہو گئے۔ حسان کی اب ذرا سی توند نکل آئی تھی جو اس کے دبلے پتلے جسم پر مصنوعی سی معلوم ہوتی تھی۔ پھیکے سے رنگ کی میلی ٹی شرٹ توند پر پھنسنے لگی تھی۔ مجھے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھاتے ہوئے ایک لڑکی سے بولا: 'تم، ان کے لیے چائے بنا لا جلدی سے، شاباش!' پھر مجھے اٹھاتے ہوئے کہا: "آؤ، ہم دوسرے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ ادھر یہ آزادی سے ہنسی گپ شپ لگائیں، اُدھر ہم اطمینان سے اپنی باتیں کرتے ہیں۔'

ہم بہت دیر اس کے آپریشن اور سفر کے بارے میں بات چیت کرتے رہے۔ اس نے بتایا: 'ایک تجربہ سا ہوا۔ دو راتیں اور ایک دن میری زندگی سے یوں غائب ہو گئے جیسے وہ تھے اور نہیں تھے۔ یوں سمجھو کہ موت کا ایک چھوٹا سا ٹریلر دیکھنے میں آیا۔ مجھے پتا چل گیا ہے کہ موت کیا ہوگی۔ ایک مکمل عدم، نہ اندھیرا نہ اُجالا، نہ خاموشی نہ صدا، نہ خوشی نہ غم، نہ احساس نہ شعور۔ کچھ بھی نہیں۔ زندگی میں کچھ بھی نہیں کا تصور کرنا ممکن نہیں۔ نیند کی اور بات ہے۔ اس میں ہم زندہ ہوتے ہیں بلکہ بعض حوالوں میں تو جاگنے کی نسبت نیند میں زیادہ بھرپور طور پر زندہ ہوتے ہیں۔ تیسرے دن ڈاکٹر نے مجھے بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا اور کمرے کے اندر بغیر سہارے کے چلایا اور میں چلا۔"

اتنے میں لڑکی چائے رکھ کر جانے لگی تو حسان نے کہا: 'تم، دوسرے مہمانوں کو بھی چائے دینا تھی۔"

'جی، وہ پی رہے ہیں۔' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے کھڑی احسان کی شکل دیکھتی رہی کہ شاید اسے کوئی اور کام بتائے۔ جب وہ نہ بولا تو چلی گئی۔ میں نے پوچھا: 'یار، یہ تم کیا نام ہوا؟'

"ان لڑکیوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ ماں باپ نے کچھ رکھا ہوتا ہے، یہ اپنے آپ کو کچھ کہتی ہیں، گاہکوں کو کچھ اور بتاتی ہیں۔ اپنی پہچان گم کر دینا چاہتی ہیں یہاں تک کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو ڈھونڈنا چاہیں تو نہ ڈھونڈ سکیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح وہ یہی جھوٹی تسلی کے لیے مفروضہ گھڑ سکتی ہیں کہ گلیوں میں گاہک پھنسانے والی تو تم ہے، رقیہ تو ویسی کی ویسی کنواری، پاک صاف، گھر کے اندر بیٹھی ہے۔' اتنا کہہ کر وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا: 'ویسے اسے مفروضہ بھی نہیں کہنا چاہیے، کیوں کہ حقیقت اسی طرح ہے۔ پیشہ تو صرف جسم کرتا ہے جسم کو پالنے کے لیے، دل نہیں۔ خیر، تو میں تمھیں بتا رہا تھا کہ ہر گاہک انھیں اپنی پسند کے نام سے پکارتا ہے۔ اب تمھیں یہ تو بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہر کسی کی کھوپڑی میں کوئی نہ کوئی نام پھنسا ہوتا ہے جو قبر میں بھی اس کے ساتھ جاتا ہے۔' اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے ذہن میں ٹن سے گھنٹہ بجا اور پروین

Scanned with CamScanner

کا نام گونجا۔ میرے جسم کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ میں پہلے تو جھینپا، پھر یک دم اداس ہو گیا۔ احسان کہہ رہا تھا: "یہ پیشہ دراصل مردوں کے دل میں دوسری عورتوں کی خالی کی ہوئی جگہ کو پُر کرنے کا ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لو کہ انھیں مردوں کی سابقہ محبوباؤں کا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ اگر بات یہیں تک رہے تو ان کے لیے ٹھیک ہے۔ لیکن جب یہ اپنی ذاتی حیثیت میں پسند کی جانے لگیں تو گویا ان کی پہچان اور اہمیت بحال ہو گئے۔ تب یہ قتل ہوتی ہیں۔ انھیں خود بھی پتا نہیں چلتا کہ کب کسی نے انھیں خالی جگہ سے نکال کر ان کی ذاتی حیثیت میں ان سے عشق کرنا شروع کر دیا ہے۔ جہاں عشق ہو گا وہاں حسد تو آئے گا۔ جہاں حسد ہو گا وہاں قتل بھی ہو گا۔"

احسان کے فلیٹ میں اس طرح کی لڑکیوں کا آنا جانا شروع سے تھا۔ جب جس کا جی چاہے آئے، جو کچھ کھانے کو مل سکے کھا لے، ضرورت ہو تو پکا لے۔ وہاں نہانے دھونے، سونے، دو ایک دن ٹھہرنا ہو تو ٹھہر بھی جائے۔ جب جانا ہو چلی جائے، کوئی روکے گا نہیں۔ احسان کو لڑکیوں کے ساتھ مل بیٹھنے اور گپ لگانے کا بڑا چسکا تھا۔ سیکڑوں لڑکیاں وہاں آتی ہوں گی، لیکن حیرت ہے کہ اس نے ان میں سے کسی کے ساتھ خصوصی تعلق قائم نہیں کیا۔ گاہک کو ساتھ لے کر وہ فلیٹ پر نہیں آ سکتی تھیں، نہ یہاں احسان سے ملنے کے لیے آنے والے دوستوں سے انھیں معاملہ کرنے کی اجازت تھی۔ فلیٹ کے باہر جو چاہیں کریں انھیں اختیار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ گھر میں خوش شکل لڑکیاں، رنگ رنگے کپڑے پہنے گھومتی پھرتی اچھی لگتی ہیں۔ وہ سگریٹ نہ پہلے پیتا تھا نہ اب، لیکن لڑکپن میں ہمجولیوں کی طرح سگریٹ کی خالی ڈبیاں ڈھونڈتا دور دور نکل جاتا تھا۔ بولا: "یہ لڑکیاں بھی تو سگریٹ کی خالی ڈبیاں ہی ہیں۔ لوگ انھیں استعمال کر کے پھینک دیتے ہیں۔ ڈبیاں ڈھونڈنے مجھے جانا پڑتا تھا، یہ خود چل کر میرے پاس آ جاتی ہیں۔ میں انھیں وہ اپنائیت دیتا ہوں جو انھیں دنیا میں کم ملتی ہے۔ یہاں وہ کچھ وقت گزار کر نفسیاتی طور پر کسی قدر دم لے لیتی ہیں، پھر اپنی راہ پر نکل جاتی ہیں۔ اس لڑکی نے جب پہلے پہل یہاں آنا شروع کیا تو اپنا نام نیلوفر بتاتی تھی۔ اس کا نام ٹم میں نے رکھا، کیونکہ یہ دیے کی طرح ٹمٹماتی نظر آتی ہے۔ کچھ عرصے تو یہاں سب اسے ٹمٹماتی کہتے رہے، پھر ٹم کہنے لگے۔ جس وقت یہاں ہمارے ساتھ مل کر بیٹھتی ہے تو ہنستی ہے، چہکتی ہے، دوسری لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے۔ اس وقت اس کا چہرہ روشن ہوتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے اگر گم ہو جائے تو لگتا ہے چہرے کی لو ماند پڑتے پڑتے بالکل بجھ جائے گی۔ سنبھل کر پھر ہنسنے گانے میں شامل ہو جائے تو چہرے کی دمک بھی لوٹ آتی ہے۔ میں الگ لے جا کر پوچھتا ہوں کہ کیا ہوا۔ بتاتی ہے کہ ماں کو آج صبح پھر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ علاج کے لیے پیسے کمانے ماں کو اکیلا چھوڑ کر گھر سے نکلنا پڑا۔ گاہک دوپہر تک نہیں ملا۔ شام کو پھر قسمت آزماؤں گی۔ میرے پیچھے اسے پھر دورہ پڑ گیا تو پتا نہیں کیا ہو۔ سوچ رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

میں پیسے لے کر پہنچوں تو کہیں وہ مری نہ پڑی ہو۔ تمھیں کہانیاں لکھنے کا شوق ہے نا؟ ان میں سے ہر لڑکی ایک پورا ناول ہے۔ دس پندرہ کہانیاں تو میں تمھیں ایک شام میں لکھوا دوں۔ یہ گلیوں میں گھومنے والی لڑکیاں اس طبقے میں سب سے زیادہ مظلوم ہوتی ہیں۔ شرافت کا بھرم رکھنے کی ناکام کوشش میں بہت بے وقوف بنتی ہیں۔ پتا سب کو ہوتا ہے مگر محلے میں، رشتے داروں میں شرافت کا ڈھونگ رچانے پر مجبور رہتی ہیں۔ ہنر والیوں کی پشت پر ان کی پوری برادری ہوتی ہے۔ ان میں جو کسب پیشہ گھرانے ہیں وہ اپنی لڑکیوں کو ناچ گانے کی تعلیم دلا کر ہنرمند بنا دیتے ہیں۔ اور پھر ان کے ہم چشموں میں یہ دھندا کوئی عیب نہیں۔ اس سے تو قوالی کے چنگڑ قبیلے کی لڑکیاں نفسیاتی طور پر زیادہ محفوظ زندگی گزارتی ہیں کیوں کہ ان کے ہاں بھی جسم فروشی کوئی خاص بری بات نہیں سمجھی جاتی۔ یہ لڑکیاں تو جسم کی unskilled labour ہیں۔ اور پھر ادھر لڑکی کا جسم ڈھلا ادھر مری۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس نے گھر کو اس طرح کا سیٹ ٹوریم لالو کی یاد میں بنا رکھا تھا۔ شاید اس کے ذہن میں کہیں یہ بات بھی چھپی ہو کہ کیا خبر کبھی لالی بھی اپنی سخت راہوں پر چلتے چلتے تھک کر دم لینے کو ادھر آ نکلے۔ لالی نے اسے پیار دیا، اعتماد دیا اور جینے کی روش سے روشناس کرایا۔ اس کے دل میں لالی کی محبت آج بھی زندہ ہے۔ اسے دولت مند اور با اختیار لوگ کبھی اچھے نہیں لگے۔ اس کے نقوش اسے ان کے چہروں سے گھن آتی ہے۔ خود اس نے کبھی امیر بننا نہیں چاہا۔ زندگی میں تجارت کے چند موقعے آئے لیکن وہ اپنی چھوٹی سی ملازمت پر قانع رہا۔ اسی طرح اسے زیادہ بنی ٹھنی اور اپنے حسن پر نازاں عورتیں ناپسند تھیں۔ اسے تو صرف اپنے جیسے سادہ اور حالات کی چکی میں پسے ہوئے لوگوں سے لگاؤ تھا۔

ایک زمانے تک وہ برہم چاری رہا۔ اس کے دفتر میں ایک ٹیلی فون آپریٹر تھی جس کا نام نازو تھا۔ اس کا خاوند اسے اور دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر امریکا بھاگ گیا تھا۔ [illegible] لاہور میں رہتی تھی جسے ہر مہینے خرچ بھیجنا ہوتا تھا۔ بیٹی کسی انگریزی پرائمری اسکول میں پڑھتی تھی۔ چھوٹا بیٹا گھر تھا۔ اس کے لیے اپنی قلیل تنخواہ میں یہ سارے اخراجات پورے کرنا مشکل تھا۔ احسان اسے بچوں سمیت اپنے گھر لے آیا۔ یوں اسے فوری مالی پریشانیوں سے چھٹکارا مل گیا۔ نازو نے خیال کیا کہ جب تک یہ قانونی طور پر ملوث نہ ہو کسی وقت بھی اسے اور بچوں کو گھر سے نکال سکتا ہے۔ اس نے محبت کا یقین دلا کر اسے پھانس لیا اور نکاح کا فیصلہ ہو گیا۔ نازو کی پہلی شادی برقرار تھی۔ طلاق کا مقدمہ دائر کیا گیا۔ ڈیڑھ دو سال عدالتوں کی خاک چھانتے رہے؛ جب طلاق ہو گئی تو وہ کسی وڈیرے کے ساتھ بھاگ گئی اور بچے اسی کے پاس چھوڑ گئی۔ اس نے بچوں کو سینے سے لگا کر رکھا؛ بیٹی کو روز وہ موٹر سائیکل پر اسکول پہنچاتا اور واپس لاتا۔ بیٹے کو ٹیوٹر سے پڑھاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

دو مہینے بعد مارو بڑی بہو بچاں کے ساتھ آئی اور بچوں کو کار میں بٹھا کر لے گئی۔ ان کے جانے پر احسان آنسوؤں سے رو دیا اور اپنے غلط کیے جانے کا بہت دن غم کرتا رہا۔ وہ بےوقوف عورت اگر اسے محبت کا چکر نہ بھی دیتی تو یہ سب کچھ ویسے ہی کرتا جیسے اب کیا تھا، لیکن کسی مے پرمن کے لیے کسی اور کو یہاں دار سمجھانا مشکل ہوتا ہے۔ دوست اس کے ڈیرے پر شراب لا کر پیتے تھے، اسے کوئی اعتراض نہ تھا۔ بچوں کے جانے کے بعد کئی کے کہنے پر شراب پی کر غم غلط کرنے کی کوشش کی لیکن نشہ راس نہ آیا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی تنگ جگہ میں محبوس ہو گیا ہو اور اعضا اختیار میں نہ رہے ہوں۔ شدید بےقراری تھی اور جلد نشے کی کیفیت سے باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن نشہ تو اپنے وقت پر ہی اترتا ہے۔ اسے خوف تھا کہ کہیں گھٹن کی یہ کیفیت مستقل نہ ہو جائے۔

احسان تقسیم سے پہلے کانگریس کا پرچار کرنے پر ایسا پشیمان تھا کہ پھر کسی اور نظریے کی حمایت کا حوصلہ نہ رہا۔ اب وہ ذاتی طور پر سوشلزم سے متاثر تھا اور سمجھتا تھا کہ غربت اور ذلت کے مارے لوگوں کا علاج اس کے سوا ممکن نہیں لیکن اس کی تائید میں نہ کسی سے کبھی کچھ کہا اور نہ عملی طور پر اس کے لیے کوئی قدم اٹھایا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگا: میاں، کیا خبر کل کو سوشلزم بھی غلط ثابت ہو اور مجھے دوسری بار جان بچانے کے لیے سرمایہ داری نظام کی چھتری تلے پناہ ڈھونڈنی پڑے۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عام آدمی کو عام سیاسی روش سے ہٹ کر نہیں چلنا چاہیے ورنہ اس کے بیوی بچے بہت دکھ اٹھاتے ہیں۔ وہ تو اپنی مرضی سے کسی نظریے یا آدرش کو اپنا لیتے ہوئے مصیبتیں جھیل سکتا ہے، مگر غریب اس کے گھر والے جنھیں یقین کی ادھوری دولت بھی میسر نہیں ہوتی، وہ مفت اس کی پیدا کردہ الجھنوں میں پھنس کر خوار ہونے اور اس کے ساتھ ساتھ گھسٹنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں صداقت نام کی کوئی چیز نہیں۔ جدھر فتح ہوتی ہے صداقت بھی ادھر ہی نظر آنے لگتی ہے۔ تیرا باپ بالکل ٹھیک کرتا رہا، اور جو کچھ دادا نے پاکستان بننے کے بعد کیا وہ بھی ٹھیک ہے۔

لڑکپن اور جوانی میں ہندوستان کو انگریز کے تسلط سے آزاد کرانے کی خواہش احسان کے لیے شدید جذباتی بحران کی صورت اختیار کیے ہوئے تھی، لیکن انگریز کے لیے دل میں نفرت یا دشمنی رکھنے کے سوا عملی طور پر کبھی کچھ کر کے نہ دیا۔ زیادہ سے زیادہ گلی محلے میں کوئی سیاسی بحث چلی تو کانگریس کے حق میں ایک تقریر جیسے دو بول پر جذباتی آواز میں برسائی اور چل دیا۔ اسی طرح کا دوسرا جذبہ مسلمانوں کے اتحاد اور دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کی سربلندی کا تھا۔ اب پتا نہیں مسلمانوں کے اتحاد کی خواہش انگریز دشمنی کا نتیجہ تھی یا انگریز دشمنی عظمت اسلام کی خاطر اختیار کر رکھی تھی، لیکن ظواہر مذہب کی پابندی اس نے کبھی نہ کی۔ پاکستان پہنچ کر صوفیا کا سا نقطہ نظر بنا لیا: کسی کو دکھ نہ دو، سب سے پیار کرو، سب کی خدمت کرو؛ اپنے اپنے رنگ میں سب

سمجھے ہیں: قوموں کے سیاسی نقشے اور معاشی حالات جب قدرت کی طرف سے معینہ وقت آپہنچتا ہے تو اپنے آپ بدل جاتے ہیں، اس میں کسی کی تگ و دو کوئی فرق ڈال سکے ممکن نہیں۔ کانگریس کبھی اس کے نزدیک غلطیوں سے مبرا ہوتی تھی، لیکن اب مانتا تھا کہ کانگریس کی قیادت نے انگریز کو باہر نکالنے کے مشن میں خود کو اتنا مشغول کر لیا تھا کہ گرد و پیش کا کچھ ہوش نہ رہا، اور اپنے مشن کی سچائی پر کسی آفاقی صداقت کی طرح بھروسا کرتے ہوئے سمجھ لیا کہ اگر یہ حاصل ہو گیا تو قیامت تک ہندوستان کے رہنے والے چین کی بنسی بجایا کریں گے اور تمام اختلافات اور مسائل اپنے آپ مٹ جائیں گے۔ اس زعم میں انھیں مسلمانوں جیسی بڑی اقلیت کے اندر قومی سطح پر آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی بے یقینی، بے اعتمادی اور خوف نظر ہی نہ آسکے کہ انھیں دور کرنے کے لیے کوئی اقدام کرتے۔ جب اس طرف توجہ دی تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ اپنی سہل پسندی میں انھوں نے چند علما کی حمایت ہی کو دس کروڑ مسلمانوں کی آواز سمجھنے کی حماقت کی۔ ہندوستان کا عمومی مزاج مذہبی دیوانگی کا تھا اور ہے۔ ہر مذہب کے پیروکار اتنے متعصب ہیں کہ انھوں نے ہزار سال تک ایک دوسرے کی ہمسائیگی میں رہنے کے باوجود ایک دوسرے کو سمجھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی۔

کہنے لگا: میں تمھیں ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار، جو بعد میں آخری بار ثابت ہوئی، میں اور آپا ابا سے ملنے لاہور سنٹرل جیل گئے۔ جیل کے افسروں نے ہمیں ملاقات کا وقت دوسرے دن کا دیا۔ ہمیں رات لاہور ہی میں گزارنا پڑی۔ اب مجھے بالکل یاد نہیں کہ جس مکان میں ہم ٹھہرے وہاں کس طرح پہنچے تھے۔ اتنا یاد ہے کہ صبح جب میری آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو نئی جگہ پا کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کھلی چھت پر کھلی چارپائی بچھی تھی جس پر میں لیٹا تھا۔ میرے پاس ہی چارپائی پر ماں اکڑوں بیٹھی تھی جس طرح وہ ریلوے پلیٹ فارموں پر گاڑی کے انتظار میں خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر بیٹھی ہوتی تھی۔ صبح سویرے ہلکورے لیتی ہوا بھلی لگ رہی تھی۔ کبھی کسی دودھ بیچنے والے کا آوازہ جھونکے کی طرح آتا اور ہوا کے ساتھ آگے نکل جاتا۔ برتن بجنے لگے۔ ہینڈ پمپ چلنے لگے۔ ہارمونیم کے ساتھ آواز ملا کر بھجن گانے کی سریلی آوازیں آنے لگیں جو میں زندگی میں پہلی بار سن رہا تھا۔ مجھے اچھی لگیں۔ میں نے اٹھ کر چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھنا شروع کیا۔ جدھر دیکھتا اُدھر سرخ اینٹوں کی دیواریں ابھرتی پھیلتی چلی گئی تھیں۔ نیچے صحن میں جھانک کر دیکھا۔ ملے دلے بستروں والی چارپائیوں کی لمبی قطار بچھی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ ابھی بے سدھ سو رہے تھے، کچھ اپنی ضرورتوں کے لیے خواب میں چلنے کی صورت، بدن ڈھیلے چھوڑے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ایک بزرگ زمین پر آلتی پالتی مارے، اکڑ کے یوں سیدھے بیٹھے تھے جیسے پتھر ہو گئے ہوں۔ میں نے حیرت زدہ ہو کر ماں سے پوچھا کہ یہ شخص کیا کر رہا ہے۔ بتایا کہ سندھیا کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا سندھیا کیا ہوتی ہے۔ کہنے لگیں ان کی نماز ہے۔ میں نے کہا کہ یہ ہماری طرح نماز کیوں

Scanned with CamScanner

نہیں پڑھتے تو ماں نے مجھے جھڑک دیا کہ بک بک کرنے کی ضرورت نہیں، چپ رہو۔

یہ بات سنا کر احسان نے میری طرف دیکھا اور کہا: یار، اس زمانے کا لاہور بڑا خوب صورت تھا۔ مال روڈ اور اس کے مشرق میں بسا علاقہ جو انگریزوں کی آمد کے بعد آباد ہوا تھا، یوں لگتا تھا جیسے کسی باغ کی ساخت خالی قطعوں پر بڑی بڑی چھپاتی عمارتیں نفاست سے دل پذیر ڈراموں میں تعمیر کر دی گئی ہوں۔ کھلی کھلی سڑکیں، ان پر زرد روغن شدہ تانگے، تانگوں پر ایک جیسی وردی والے کوچوان، اور ان کی پگڑیوں پر پیتل کا چمک دار مصر۔ ایک ایسے ہی تانگے کی پچھلی نشست پر میں آپا کے برابر بیٹھا پتہ نہیں کس محلے سے سنٹرل جیل ابا سے ملاقات کے لیے نکلا۔ اگلی نشست پر کوچوان کے برابر میں جن لوگوں کے ہاں رات قیام کیا تھا ان کا لڑکا بیٹھا تھا۔ آپا اور میں پہلے سے دور دراز علاقوں کی جیلوں تک اکیلے ہی سفر کرتے رہے تھے، لیکن یہاں میزبانوں کے اصرار پر آپا نے اس لڑکے کو ساتھ آنے دیا۔ اس نوجوان نے ملاقات کے بعد ہمیں اسٹیشن پر گاڑی میں سوار کرانے تک ہمارے ساتھ رہنا تھا۔ تانگا مال روڈ پر پہنچا تو بھنگیوں کی توپ پر میری نظر پڑی۔ حیرت میں میرے منہ سے نکلا کہ یہ کیا ہے۔ اس لڑکے نے بتایا کہ بھنگیوں کی توپ ہے۔ عجیب چیز لگی، اور نام اس سے بھی زیادہ عجیب۔ بڑی حیرانی ہوئی کہ صفائی کرنے والے بھنگیوں نے یہ کیسے اور کیوں بنائی ہوئی۔ اسے سڑک کے عین درمیان میں چبوترا سا کر کے اس پر کھڑا کیا گیا تھا۔ سوچا انگریزوں کے نزدیک ضرور اس کی خاص اہمیت ہوگی جو اسے اس طرح نمایاں مقام پر کھڑا کیا گیا ہے۔ کالی سیاہ، پیتل کے کڑے، لکڑی کے بڑے بڑے پہیے، لمبی اونچی گردن۔ ویسے بڑے زمین سے چھت کے ستونوں والے گارڈ کے درمیان میں سر گھسا کر دیکھی۔ پوچھا: یہ کیا کرتی ہے؟ لڑکے نے بتایا: جنگ میں دشمن کو مارنے کے لیے بارود بھر کر اسے چلاتے ہیں۔ میں نے کہا: ہندوستانیوں کو مارنے کے لیے انگریز چلاتا ہے؟ لڑکا ہنس کر چپ ہو گیا۔

پچھلی نشست پر میں پہلے بھی خوش رہتا تھا لیکن اب تو کئی بہت سی نئی چیزیں ٹھیک طرح دیکھے بغیر سامنے آ کر پیچھے رہ جاتی تھیں کہ آگے بیٹھنا مجبوری بن گیا۔ آپا سے کہا بھی کہ کیا ابھی تکی ہے مجھے؟ پیچھے گر رہے گیا؟ لیکن میں کچھ لڑکے کی مدد سے اور کچھ آپا کے کندھے پکڑ کر آگے پہنچ گیا۔ سینٹرل جیل کا گیٹ پرانا روڈ کے کنارے والا قد آدم سیاہ بہت تھا جیسے تھا ہی ہمارے بیچ میں کھڑا تھا۔ دوسری طرف جو سب کچھ نے گیٹ کے ساتھ گنگارام کا سفید سنگ مرمر کا مجسمہ تھا جس میں وہ کرسی پر مطمئن بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ وہیں کہیں ملکہ وکٹوریہ کا سیاہ بت تھا جس میں وہ تخت پر بیٹھی تھی۔ گزرتا تھا تو نیچے سر و جسد، اس سے بھی وہی سرخ اینٹوں کی عمارتیں۔ وہی دھوپ اور ہری بیلوں پر پھول پودے لہرا رہے تھے۔ فضا میں آج کی طرح موٹروں کے دھوئیں کی بو نہیں ہوا کرتی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑے، مسحور، ہر طرف سے ہر چیز کو تیزی سے تکنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ مجھے میرے لیے نئی چیز تھے، اور مال روڈ کے حسن میں ان سے عجب شان پیدا ہو رہی تھی۔ کوئنس مارکیٹ کے سامنے سے گزرے تو وہاں نہ تو مرغیوں کے پر اڑ رہے تھے اور نہ گلتے سڑتے گوشت کا تعفن تھا۔ جیسے جیسے ہمارا تانگا آگے بڑھ رہا تھا ویسے ویسے تانگوں کی تعداد، گہما گہمی، آنے جانے والوں کی بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر شور نہیں تھا۔ گھوڑوں کی لید فوراً ٹھانے کے لیے جگہ جگہ مٹی کی بالٹیاں اور کھرپے لیے موجود تھے۔ جنرل پوسٹ آفس والے چوک میں ایک گول چبوترہ تھا جس میں لگی گھاس تیز دھوپ میں جگمگا رہی تھی اور اس کے ارد گرد سے ٹریفک نظم و ضبط کے ساتھ گزر رہی تھی۔ ہنستی آنچل اڑاتی لڑکیاں اور کتابیں سنبھالتے تیز طرار لڑکے، دفتروں کے بابو، کہیں کہیں سنہری بالوں والی دودھ جیسی سفید میمیں سائیکلوں پر سوار اڑی جا رہی تھیں۔ تانگوں کی دو رویہ قطاروں کے پاس سے کبھی کبھی کوئی چمکتی ہوئی کار شاں سے گزر جاتی۔ نکھری ہوئی دھوپ کو ابھی موٹروں اور رکشوں کے دھوئیں نے گہنایا نہ تھا۔ صبح کی پاکیزہ خوش گوار ہوا کے جھونکے دھوپ کو ہمارے لیے قابلِ برداشت بنا رہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف لگے جامن اور پیپل کے گھنے پیڑ سایہ دے رہے تھے۔ گنگا رام ٹرسٹ بلڈنگ، دیال سنگھ ٹرسٹ کی ہارس شو بلڈنگ دھوپ میں نکھری سورج کے ساتھ مل کر چمک رہی تھیں۔ اجلی تھیں، صاف تھیں، پلستر ان کے بحال تھے۔ یہی حال ریگل چوک میں لکشمی بلڈنگ اور میکلوڈ روڈ کے چوک میں ڈنگا سنگھ بلڈنگ کا تھا۔ سرکاری عمارتوں کا رعب اور دبدبہ تو تھا ہی لیکن ان غیر سرکاری بلڈنگوں کا اپنا حسن تھا، وقار تھا، واضح طور پر متاثر کرنے والا کردار تھا۔ مال روڈ کو خوابوں میں آنے والی سڑک بنانے میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ اس وقت یہ عمارتیں جوان تھیں اور آج کی طرح وقت سے پہلے بوڑھی اور مفلوک الحال نہیں ہوئی تھیں۔ چیرنگ کراس پر ملکہ وکٹوریہ کا سنگ مرمر کا بت بارہ دری کی چھت کے نیچے تخت پر بیٹھا ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا۔ اس کی پشت پر اسمبلی ہال کی شاہانہ عمارت تھی۔ سامنے چوک میں ایک طرف شاہ دین بلڈنگ اور دوسری طرف دی میس ہال، مال روڈ کی رونق بڑھا رہے تھے۔

میں نے پیچھے مڑ کر آپا کو دیکھا۔ وہ پتہ نہیں کہاں دیکھ رہی تھی۔ چادر میں لپٹی ہوئی، اداسیوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ نظارے جنھوں نے میرے اندر تہلکہ مچا رکھا تھا، اس پر بے اثر تھے۔ میں تو اس طلسماتی شہر کے سحر میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ میں نے کہا: آپا، مجھے آپ یہیں چھوڑ جاؤ۔ دن کو سڑکوں، بازاروں کی سیر کروں گا، رات میں ماموں کے پاس جیل جا کر سو جایا کروں گا۔ آپا چپ رہی۔

ماموں سے ہماری ملاقات جیل کے کسی افسر کے کمرے میں ہوئی۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک زرد رو مسکین سا شخص چشمہ لگائے کرسی پر بیٹھ گیا۔ آپا رو رہی تھی، وہ باتیں کرتا جا رہا تھا۔ مجھے

اس اجنبی شخص سے ملنے کا کوئی اشتیاق نہ تھا، اور نہ ہی یہ پتہ تھا کہ جو شخص ابا ہو اس سے ملنا پڑ جائے تو کس طرح ملنا چاہیے۔ میں گردن گھما پھرا کر کمرے کو اور اس میں رکھی مختلف چیزوں کو دیکھتا رہا۔ وقت ختم ہونے پر اس آدمی نے جو ابا تھا، میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا: دل لگا کر پڑھا کرو، سنا؟ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے وہاں سے نکلنے کی بڑی جلدی تھی تاکہ تانگے پر سڑکوں کی سیر شروع ہو۔ آپا جیل کی ڈیوڑھی سے نکلی تو ایک بار پھوٹ کر ایسا روئی کہ میں پہلے تو سکتے میں آگیا، پھر خود بھی رونے لگا۔ لڑکا جو باہر ہمارا منتظر تھا، اس نے ہمیں ڈیوڑھی کے سامنے کے پلاٹ میں پیپل کے سائے تلے بٹھا دیا۔ پانی لا کر پلایا۔ آپا کوئی آدھ گھنٹے بعد اس قابل ہوئی کہ سڑک تک جا کر تانگے میں بیٹھ سکے۔ آج پچاس سال بعد سوچتا ہوں کہ ہندوستان کو آخرکار آزاد تو ہونا ہی تھا، یہ ۱۹۴۷ میں نہ ہوتا تو ۱۹۵۷ میں ہو جاتا۔ ابا نے خواہ مخواہ جان گنوائی، جائیداد گنوائی اور خاص طور پر آپا کو اور ہمیں دکھوں کے حوالے کر دیا جن کے گہرے زخموں کے نشان آج تک باقی ہیں۔"

ہم دونوں بہت دیر ایسی ہی سوچوں میں گم خاموش بیٹھے رہے۔ اتنے میں ٹمو اندر آئی۔ آتے ہی پہلے روشنی جلائی اور پھر بولی: "آپ لوگ اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہیں؟ میں نے رات کا کھانا بنا کر رکھ دیا ہے۔"

احسان نے پوچھا: "صدیقی صاحب اور منظور صاحب نے کھا لیا؟"

"وہ آپ کے انتظار میں بہت دیر تک شطرنج کھیلتے رہے۔ آدھا گھنٹہ ہوا چلے گئے۔ چاندنی بھی گھر چلی گئی، اور میں بھی جا رہی ہوں۔"

احسان نے کہا: "سنو تو! تم نے کھانا کھا لیا؟"

"مجھے بھوک نہیں۔"

"غلط بات ہے۔ جاؤ کھانا لے آؤ، تینوں مل کر کھاتے ہیں۔ یہیں سے آنا۔ کھا کر تمھارے حق میں دعا کریں گے۔"

وہ ہنستی ہوئی کھانا لینے چلی گئی۔ احسان نے مجھ سے کہا: "یار، تمھارے پاس پچاس روپے ہوں گے؟" میں نے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دے دیا۔ ٹمو جب کھانا لے کر آئی تو پچاس روپے اسے دیتے ہوئے بولا: "لو۔ ماں کے لیے دوا خرید لینا۔ روپے میرے نہیں، سعید صاحب کے ہیں، اس لیے واپسی کی بھی کوئی شرط نہیں۔"

اس نے خاموشی سے نوٹ مٹھی میں دبا لیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی مگر شرمندگی کے مارے کچھ بول نہ سکی۔ خفت بھری مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل کر سمٹ گئی۔ کھانا ختم ہونے پر اس نے برتن اٹھائے اور چلی گئی۔ باتوں کا رخ بدل جانے اور کھانے میں مصروف ہونے کے باعث ہمارے دلوں پر چھائی اداسی دور ہو گئی۔

میں نے کہا: احسان، تمھارے ابا کے خون کی قیمت کانگریس نے اتنی بھی نہ لگائی کہ فسادات کے دوران تم لوگوں کی حفاظت کا کوئی انتظام کر دیتی؟

"نہیں، ایسا نہیں۔ ہمیں تو انھوں نے تحفظ مہیا کرنے کی پیشکش کی تھی۔ ملکی سطح پر کانگریس نے مسلمان ورکروں کے لیے کچھ کیا یا نہیں، اس کا مجھے پتا نہیں۔ ابھی ہم ریلوے لائن والے گھر میں تھے کہ پیغام آیا کہ اگر آپ چاہیں تو آپ کو کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیں۔ پھر جب ہم محلہ شریف پورہ میں منتقل ہو گئے تو پنڈت کرشن لال، سٹی کانگریس کے صدر، خود تانگے میں بیٹھ کر تلاش کرتے ہوئے پہنچے۔ جس روز تم محمود کے ساتھ ہمیں لینے پہنچے، اسی روز تم سے کوئی دو گھنٹے پہلے وہ آئے تھے۔ ہم نے انھیں اپنے دروازے پر کھڑا دیکھا تو شل ہو گئے۔ فرحان نے کہا: آپ نے کیا کیا؟ مسلمانوں کے گڑھ میں اکیلے چلے آئے؟

"بولے: میری فکر نہ کرو، مجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور جب میں صحیح سلامت پہنچ ہی گیا ہوں تو گھبراہٹ کیسی؟ پنڈت جی نے مجھے، فرحان کو اور آپا کو سامنے بٹھا کر کہا: حالات آپ کے سامنے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اس شہر میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ میری تجویز ہے کہ آپ دلی چلے جائیں۔ فوجی حفاظتی دستے کا اور ٹھہرنے کی جگہ کا انتظام ہے۔ دلی رہنا ہو تو وہاں رہیں، ویسے یوپی ہر لحاظ سے پرامن ہے۔ لکھنؤ جانا چاہیں تو وہ بھی ہو سکتا ہے۔ دو تین ماہ بعد جب حالات معمول پر آ جائیں تو لوٹ آیئے گا۔ فسادات ہمیشہ تو نہیں چلتے رہیں گے۔ یہ پاگل پن آخر ختم ہوگا۔

"آپا نے کہا: ہم اپنے بہن بھائیوں سے کٹ کر نہیں رہ سکتے۔ اب دیکھیے بیٹی داماد لاہور میں ہیں۔ انھیں وہیں رہنا ہے۔ ان کو میں کیسے چھوڑ دوں؟ جتنے رشتے دار ہیں سبھی پاکستان جانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ہمارے لیے انھیں کے دم سے زندگی کی رونق ہے۔ ان سے جدا ہو کر ہم ہندوستان میں اکیلے کیسے رہ سکتے ہیں۔ آپ نے بہت تکلیف کی۔ ہم عمر بھر آپ کا احسان یاد رکھیں گے۔

"بولے: احسان کیسا بہن جی، یہ تو میرا فرض ہے۔ بھائی بشیر احمد نے جان دے کر ہندوستان کی آزادی کو ممکن بنایا۔ اب اگر آپ اور ان کی اولاد یہاں رہیں تو ہمارا اور ہندوستان کا مان بڑھائیں گے۔ میں منت کرتا ہوں آپ نہ جائیں۔ یہ جھگڑا تو چند دن کی بات ہے، سب جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ آپا نے کہا: اب تو جو بھی ہو، ہم اپنے گھر والوں کے ساتھ وہاں جا رہے ہیں۔ حالات اگر سدھر گئے تو آ جائیں گے۔"

پھر احسان نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا: یار، میں سوچتا ہوں کہ آپا نے کتنا عقل مندی کا فیصلہ کیا۔ لاکھوں کی آبادی میں کل کتنے آدمی ہوتے ہیں جن سے آدمی کی زندگی بنتی ہے۔ چند

Scanned with CamScanner

دوست، چند رشتے دار، چند ملنے والے، چند دشمن۔ باقی تو سارا کا سارا جنگل ہوتا ہے چاہے ایک کروڑ کی آبادی کا شہر ہو۔ قدرت نے انسان کو ڈزائن ہی چھوٹی سی دنیا کے باسی کے طور پر کیا ہے۔ کتنی دور تک دیکھ سکتا ہے؟ سمندر اور صحرا ہو تو چند میل، جنگل اور شہر ہو تو اور بھی کم۔ کتنی دور تک چل سکتا ہے؟ بیس پچیس میل، اور بس۔'

جب آپ نے انکار کیا تو تم نے کوئی رائے دی تھی؟

جب انھوں نے دو ٹوک فیصلہ ہی کر دیا تو رائے دینے کی گنجائش ہی کہاں رہ گئی؟ ویسے میرا دل چاہتا تھا کہ دلی اور لکھنؤ کی مفت سیر ہو جاتی۔ لیکن وہ سیر ہمیں بہت مہنگی پڑتی، پھر کبھی ادھر نہ آ سکتے۔"

**

آج کی کتابیں

افضال احمد سید
کی نظموں کا مجموعہ
دو زبانوں میں سزائے موت
قیمت: پچاس روپے

ذی شان ساحل
کی نظموں کا دوسرا مجموعہ
چڑیوں کا شور
قیمت: چالیس روپے

"ایرینا" اور "چڑیوں کا شور" کے بعد
ذی شان ساحل
کی نظموں کا نیا مجموعہ
ستمبر ۱۹۹۳ میں شائع ہو رہا ہے

مظفر علی سید

ترجمے کی جدلیات

گوئٹے کے نزدیک جملہ امورِ عالم میں جو سرگرمیاں سب سے زیادہ اہمیت اور قدر و قیمت رکھتی ہیں، ان میں ترجمہ بھی شامل ہے۔ لیکن گوئٹے کے مدِ نظر عالمی ادب کا ایک عظیم الشان نصب العین تھا، اور، جیسا کہ اقبال نے پیامِ مشرق کے دیباچے میں لکھا ہے، اس کے لیے مغرب و مشرق کا ادب انسانیت کا ایک مشترک سرمایہ تھا۔ چناں چہ دانتے اور حافظ، سوفوکلیز اور کالی داس میں اس کے نزدیک کوئی اساسی فرق نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ دیوانِ حافظ اور شکنتلا سے اس کی آشنائی ترجموں کے ذریعے ہوئی تھی جو زیادہ تر اس کے اپنے احباب نے کیے تھے۔ یہی وسیع القلبی اور کشادہ نظری اس دور کے جرمن فلسفیوں میں بھی نظر آتی ہے: شوپن ہاور، ہرڈر (Herder) بلکہ ہیگل تک میں جس نے 'جمالیات' پر اپنے خطبوں میں فردوسی اور نظامی، سعدی اور مولانا روم کی طرف اہلِ مغرب کو توجہ دلائی۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ان کے تراجم بھی جرمن زبان میں، اور کسی حد تک فرانسیسی اور انگریزی میں، ہو چکے تھے۔ یہ تو نہیں کہ گوئٹے اور اس کے ہم خیال فلاسفہ شغلِ ترجمہ کے خلاف اس قدیم تعصب سے ناواقف ہوں جس کے زیرِ اثر ظریف لوگوں نے مترجمین کے بارے میں دل چسپ اور فتنہ انگیز جملے بنا رکھے تھے، مثلاً *Traduttore Traditore* جسے انگریزی میں یوں کہا گیا ہے: Translators are traitors۔ (اردو میں اس کا بدل مناسب مشکل ہے، لیکن عربی میں کہا جا سکتا ہے: ان المترجمین

گرتبون، اور فارسی میں شاید کوئی پرانی یہ نعرہ لگانے: ترجمہ داری، خراب کاری! اور حقیقت گوئٹے اور اس کے ساتھی ادبی ترجمے کے فن کو اعتبار دے رہے تھے۔ تقریباً اسی طرح جیسے جرمن زبان میں بائبل کا ترجمہ کر کے مارٹن لوتھر نے دیا تھا یا برطانوی بادشاہ جیمز اول کی تشویق و حمایت میں کام کرنے والے ان سینتالیس علما نے جو انگریزی میں کتابِ مقدس کا ایک مصدقہ ترجمہ مرتب کرنے کا باعث بنے تھے۔

دراصل یورپ میں مذہبی ترجمے کی روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔ سپٹواجنٹ (Septuagint) کا یونانی ترجمہ ولادت مسیح سے پہلے ہو چکا تھا اور دوسری صدی عیسوی تک "نیا عہد نامہ" یعنی اناجیل و اعمال و مکاتیب کا یونانی متن بھی، جس کے متعدد اجزا سریانی سے ترجمہ ہوئے ہوں گے، تیار ہو چکا تھا۔ لیکن چوتھی صدی عیسوی میں مکمل بائبل کا مقابلتاً آسان لاطینی میں جو ترجمہ ہوا (جسے Vulgate یا عام پسند کہا جاتا ہے) وہ فنِ ترجمہ کی تاریخ میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ یہ ترجمہ اس وقت کی مقبولِ عام زبان میں روزمرہ استعمال کے لیے کیا گیا اور دوسرے اس اعتبار سے کہ اس کے ممتاز مترجم سینٹ جیروم کو مذہبی تاریخ میں پہلی مرتبہ ولایت کے مرتبے پر فائز کیا گیا (چناں چہ یورپ میں سینٹ جیروم کو جملہ مترجمین کا مرشد مربی کہا جاتا ہے)۔ یہ الگ بات کہ بعد کے مترجمین میں سے لوتھر کو کلیسا سے خارج کیا گیا اور انگلستان کے ولیم ٹنڈیل (Willaim Tyndale) کو شہید ترجمہ کا رتبہ نصیب ہوا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے درمیان جو عزت و تکریم خانوادہ شاہ ولی اللہ کو ملی اس میں بہت بڑا حصہ ان تراجم کا ہے جو شاہ صاحب اور ان کے لائق و فائق صاحبزادوں نے سپردِ قلم فرمائے۔ لیکن ترجمے کے سلسلے میں دونوں روایتوں کے درمیان یہ فرق ضرور ہے کہ مسلمانوں نے متن سے جدائی قبول نہیں کی اور قرآنی تراجم کو لازمی طور پر متن کے بین السطور، بلکہ تحت اللفظ شائع کرنا ہی مناسب سمجھا جس کی وجہ سے ترجمے کا فن ایک علیحدہ حیثیت حاصل نہ کر سکا۔

مشرقی تہذیبوں میں ترجمے کی تاریخ، مذہبی اور ادبی متون کے سلسلے میں، کتنی قدیم ہے، اس موضوع پر اگر کوئی تحقیق ہو چکی ہے تو کم سے کم میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن مغرب کی مثال سے یہ عمومی نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہو کہ ترجمے کے فن کا مذہبی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ جدید زبانوں کی نشوونما اور قومیت کے شعور سے بہت گہرا تعلق ہے، اور ان دونوں کا زمانہ ہے تعلیم و طباعت کی ترقی اور معاشرے میں درمیانی طبقے کا عروج۔ چناں چہ آج بھی تیسری دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جہاں کہیں بھی تعلیم اور طباعت عام ہوتی ہے اور متوسط طبقہ کشمکشِ حیات میں شریک ہوتا ہے، وہاں اور چیزوں کے علاوہ ترجمے کے فن کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے، اس لیے ترجمے کو کسی معاشرے کی روشن خیالی کا مظہر بھی کہا جا سکتا ہے۔

Scanned with CamScanner

۲

اور اب "ترجمے" کا لفظ۔ ہم یہ تو جانتے ہیں کہ "ٹرانسلیشن" کا لفظ مغرب کی جدید زبانوں میں لاطینی سے آیا ہے اور اس کے لغوی معنے ہیں "پار لے جانا"۔ اس سے قطع نظر کہ کوئی خاص مترجم یگانہ کے مانند اسے کم بخت کی طرح کسی کو پار اتارنے کی بجائے محض بار سر تو نہیں اتارتا، یہ مفہوم نقلِ مکانی سے لے کر نقلِ معانی تک پھیلا ہوا ہے۔ اسی طرح اردو اور فارسی میں "ترجمہ" کا لفظ، جس کا اشتقاقی ربط "ترجمان" اور "مترجم" دونوں سے ہے، عربی زبان سے آیا ہے۔ اہلِ لغت اس کے کم سے کم چار معنے درج کرتے ہیں: ایک سے دوسری زبان میں نقلِ کلام، تفسیر و تعبیر، دیباچہ، اور کسی شخص کا بیانِ احوال یا تذکرۂ شخصی۔ یہ سب معانی باہم مربوط ہیں۔ اسی طرح "تُرجَم" (ت کی پیش اور ج کی زیر کے ساتھ) بھی، جس کے معنی ہیں التباس کرنا، خلط ملط کرنا، اور "مُترجَم" (ج کی زبر کے ساتھ) کا ایک معنیٰ ہے مشکوک اور مخلوط۔ غالباً یہ معنے ان بے احتیاط مترجمین کی وجہ سے پیدا ہوئے ہوں گے جن کی کسی زمانے میں کوئی کمی نہیں ہوتی، اور جو اپنی زبان ناشناسی کی وجہ سے جملہ مترجمین کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔ واضح طور پر یہ معانی ثانوی اور مُرادی ہیں کہ ان کا تعلق تاریخ کے نسبتۃً متمدن ادوار سے معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اصلی اور قدیم معنوں کے لیے مادے کو دیکھنا ہوگا، اور اس کے دیگر مشتقات کو، تاکہ لفظ ترجمہ کے گرد ایک معنویاتی دائرہ کھینچا جا سکے، یا زبان شناسی کی اصطلاح میں اس کو اپنے رشتے (semantic field) میں رکھ کر اس کی معنویت معلوم کی جائے۔

چنانچہ ابنِ منظور کی مبسوط تصنیف "لسان العرب" سے رجوع ناگزیر ہے جس نے لفظ "ترجمہ" کو "ترجمان" کے ساتھ سہ حرفی مادے "رجم" کے تحت درج کیا ہے (جب کہ بعض جدید لغات جیسے المنجد اسے "ترجم" کے چہار حرفی مادے کے ذیل میں لاتی ہیں جو عربی زبان کے اصولِ اشتقاق کے مطابق نہیں جب تک اس کی "ت" کلمے کا لازمی حصہ نہ ہو یا اس کی بنیاد کسی دخیل کلمے پر نہ ہو۔ علمائے عربی کے جدید علما لفظ "ترجمان" کو اساسی کلمہ کہتے ہیں، یونانی لفظ dragoman کی تعریب۔ اس طرح ترجمہ وغیرہ کو اشتقاقِ معکوس یا back formation قرار دیا جا سکتا ہے۔) ترجمے کو سہ حرفی مادے "ر ج م" یا "رجم" سے منسوب کرنے میں بڑی دقت یہ ہے کہ یہ کام "گناہِ کبیرہ" کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے اور بے چارے مترجمین کو حدود آرڈیننس کا خطرہ درپیش ہو جاتا ہے۔ بہر حال ابنِ منظور نے بھی اس مادے کے جو متعدد مشتقات درج کیے ہیں ان میں سے چند ایک کا معنوی ربط خود اس کی نظر میں واضح نہیں۔ تاہم قتل اور سنگ ساری،

پتھر، کنکری، سنگ باری، موضع، پہاڑ، اونچی دکان اور مینار وغیرہ کا رجم سے تعلق سامنے کی بات ہے۔ دوست اور جدائی اور مصاحب کے معنی، جن پر کلاسیکی لغت نگاروں نے حیرت کا اظہار کیا ہے، رجم سے زیادہ dragoman کی سمت اشارہ کرتے ہیں۔ مشتقات رجم کے ثانوی معنے یہ تسانی یا حرفی ذمے سے مربوط ہو جاتے ہیں: لعن طعن، سب و شتم، قذف بالغیب، الزام و افترا، قیاس و گمان، شبہ اور مبہم کلام (کلامِ مرجم)۔ یہ آخری معنے ایک جگہ قرآن حکیم میں بھی دیکھے گئے ہیں اور ممکن ہے ترجمہ بطور اصطلاح اسی سے مستفاد ہو۔ البتہ سوال یہ ہے کہ شیطان کو رجیم کیوں کہا جاتا ہے۔ لعنت کی وجہ سے؟ (مرجوم باللعن)، سب و شتم کی وجہ سے (مشتوم و مسبوب)، ان کنکریوں کی وجہ سے جو مناسک حج کے دوران جمرات کو ماری جاتی ہیں؟ (مرجوم بالحجارہ)، یا شہابِ ثاقب کی وجہ سے جو اس پر برستے ہیں؟ (مرجوم بالکواکب۔ وجعلناہا رجوماً للشیاطین)۔ خود شہابِ ثاقب کو رجوم کہا جاتا ہے کہ نجوم و کواکب سے الگ ہو کر کہیں نہ کہیں، یا کسی نہ کسی کو، جا لگتے ہیں۔

ترجمے کا تعلق اصل تصنیف سے تقریباً وہی ہے جو شہابِ ثاقب کا نجوم و کواکب سے ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر اوقات ایک نہ ایک سیارے سے جدا ہو کر تاریخ کے کسی نہ کسی ریگستان میں گم ہو جاتا ہے یا پھر اپنی اصل کے دائرۂ کشش ثقل میں گردش کرتے کرتے خود بھی ایک چھوٹا موٹا سیارہ بن جاتا ہے جیسا کہ فنِ ترجمہ کی تاریخ میں کئی بار ہو چکا ہے۔ پھر جس طرح ایک ہی سیارے سے مختلف وقتوں میں ایک سے زیادہ شہابِ ثاقب نمودار ہو سکتے ہیں اسی طرح مختلف ادوارِ ادب میں ایک ہی کلاسیکی کارنامے سے بار بار نئے ترجمے نمودار ہوتے ہیں۔ بلکہ کلاسیک تو کہتے ہی اس کارنامے کو ہیں جس کے ترجمے کی بار بار ضرورت پڑے، اور جیسے کوئی شہابِ ثاقب حتمی اور آخری نہیں ہوتا اسی طرح کسی بھی ترجمے کو حرفِ آخر نہیں کہا جا سکتا، ان ترجموں کو بھی نہیں جن کو اپنے زمانے میں تخلیق تک سے بہتر سمجھا گیا ہو۔

مارسل پروست نے اپنے عہد آفریں ناول "گم شدہ وقت کی تلاش" کے معاصر انگریزی ترجمے کو اصل فرانسیسی سے فزوں تر کہا تھا، لیکن نصف صدی کے بعد اس کا نئے سرے سے ترجمہ کرنا ضروری محسوس ہوا۔ اسی طرح لاطینی امریکا کے مشہور ادیب گابریئل گارسیا مارکیز نے اپنا زوردار ناول "ایک صدی کی تنہائی" انگریزی زبان میں پڑھا تو اسے اصل ہسپانوی زبان کی نسبت قابلِ ترجیح سمجھا۔ لیکن یہ خراجِ تحسین منکسر مزاج مترجم گریگری رباسا کے خیال میں انگریزی زبان کو ملنا چاہیے کہ دیگر تراجم کی طرح ایک نہ ایک دن یہ ترجمہ بھی متروک ہو جائے گا، بالکل ایسے جیسے 'دون کیخوتے' (Don Quixote) کو اصل ہسپانوی زبان میں پڑھا جائے تو تقریباً چار صدی پہلے کا یہ ناول آج بھی نسبتاً جدید محسوس ہوتا ہے لیکن سروانتیس کے معاصرین نے اس کے جو ترجمے کیے

Scanned with CamScanner

تھے وہ اب خوف ناک حد تک فرسودہ لگتے ہیں۔ اس لیے کہ، شہاب ثاقب کی طرح، ہر تازہ ترجمہ لوگوں پر ایک سرے سے اثرانداز ہوتا ہے۔

غرض کہ ترجمے کا کوئی نہ کوئی رابطہ رحم سے قائم کیا جا سکتا ہے، بلکہ اسی وجہ سے ترجمے کافی بعض دل چسپ جملے بازیوں کا ہدف بنتا ہے، جیسے مَن ترجم بُرجم (جس نے ترجمہ کیا، سنگسار ہوا)۔

۳

عالمی ادب کو ایک ٹھوس حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے ترجمہ ایک ناگزیر وسیلہ ہے۔ یہ خیال تقابلی ادبیات کے فرانسیسی نژاد امریکی پروفیسر آلبیر ژیرار (Albert Gerard) نے اپنی عمدہ تصنیف 'مقدمہ ادب عالم' میں ظاہر کیا تھا، لیکن ساتھ ہی بڑی دردمندی سے یہ ٹھوس حقیقت بھی تسلیم کی تھی کہ ترجمہ نام ہے ایک سعیِ نامشکور کا جس کے صلے میں، شدید مشقت کے بعد، صرف حقارت ملتی ہے۔ یہ فقرہ آج سے کوئی آدھی صدی پہلے لکھا گیا تھا، جب نوبیل انعام اور دوسرے بین الاقوامی امتیازات کے خواہش مند ادیب مترجمین کی تلاش میں سرگرداں نہیں ہوتے تھے، اور نہ عالمی ادب کے تراجم مقبولِ عام پیپر بیک ایڈیشنوں میں شائع ہوا کرتے تھے۔ تاہم دیکھا جائے تو اب بھی صورت حال میں نہایت معمولی سا فرق پڑا ہے۔ مغرب میں ترجمے کا حقِ خدمت پہلے سے زیادہ تسلیم کیا جا چکا ہے اور مترجم کا نام اب کتاب کے سرورق پر بھی چھپنے لگ گیا ہے۔ اس کے علاوہ تقابلی ادبیات کا مطالعہ دنیا کی بہت سی یونیورسٹیوں میں شروع ہو چکا ہے (چناں چہ پاکستانی ادب، بہ شکلِ ترجمہ، ایک مضمون کے طور پر امریکا اور کینیڈا میں پڑھایا جا رہا ہے)۔ ترجمے کا عام معیار بھی غالباً پہلے سے بہتر ہو چکا ہے لیکن اس کے باوجود، کم سے کم تیسری دنیا کے ان حصوں میں، جہاں اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے، ترجمے کو اب تک حقارت ہی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، حالاں کہ یہی حقیر کام کم سے کم مغرب میں ایسے لوگوں نے بھی انجام دیا ہے جو اپنی اپنی زبانوں کی آبرو تھے۔ انگریزی میں چوسر سے لے کر ڈرائیڈن، پوپ، کولرج اور براوننگ تک، اور بیسویں صدی میں لارنس، ییٹس، پاونڈ، ایلیٹ، آڈن اور بیکٹ تک نے یہ کام کیا ہے۔ فرانسیسی میں بودلیر سے لے کر آندرے ژید تک کتنے ہی بڑے فنکاروں نے خود کو مترجم کہلانے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی (بلکہ ژید نے تو یہاں تک کہا ہے کہ ہر ادیب کے لیے لازم ہے کہ عالمی ادب کا کم سے کم ایک شاہکار اپنی زبان میں منتقل کرے)۔ جرمن زبان میں گوئٹے کے علاوہ شلر، اور روسی زبان میں پاسترناک کے تراجم کی اہمیت

Scanned with CamScanner

مسلم ہے۔ (گوئٹے نے آٹھ دس زبانوں سے ترجمہ کیا ہے اور پاسترناک کو شیکسپیئر کے عمدہ ترین مترجمین میں شمار کیا جاتا ہے۔) پھر یہ بھی نہیں کہ اتنے بڑے لکھنے والوں نے یہ کام محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا ہو یا اس کو لڑکپن کا ایک مرحلۂ تربیت سمجھا ہو، انھوں نے تو اپنی پوری شخصیت اور ادبی شہرت کو داؤں پر لگا کر یہ کام کیا ہے۔

بیسویں صدی کے اردو ادب میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم سے لے کر اختر حسین رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عزیز احمد، محمد حسن عسکری، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین تک نے نثری ادب کا ترجمہ کیا ہے اور اقبال سے لے کر فیض، راشد، فراق، میرا جی، مجید امجد اور شان الحق حقی جیسے شاعروں نے شعری ادب کے تراجم کیے ہیں۔ ان میں سے کون ہے جس نے کسی بھی دوسری شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کیا ہو؟ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ تخلیقی ادب کے مقابلے میں ترجمے کا کام نفیِ خودی کا مظہر ہے۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ پھر یہ کام اثباتِ خودی کے پیغمبر حضرت علامہ نے کیوں انجام دیا؟ شاید اس لیے کہ اسرارِ خودی ہی سے نہیں، رموزِ بے خودی سے بھی ان کا رشتہ اتنا ہی گہرا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کا اصولِ حیات انفرادیت پرستی، اور غیر جمہوری معاشروں کا فلسفۂ زندگی اجتماعیت پرستی ہے۔ اس کے باوجود مغربی یورپ اور امریکا میں علمی، ادبی اور اجتماعی دھارے صدیوں سے چل رہے ہیں اور مشرقی یورپ اور روس میں انفرادی کمال کا حصول ناممکن نہیں۔ اس کے برعکس تیسری دنیا کے بڑے حصے میں نہ انفرادی جوہر درجۂ کمال تک پہنچنے پاتا ہے، نہ تہذیبی تعاون کی صورت پیدا ہوتی ہے، بلکہ دونوں کی جگہ ایک بے جہت انانیت پسندی اور غرض مندانہ بدانتظامی کا دور دورہ ہے۔ ایسے میں ترجمے کا کام کسی اعلیٰ پیمانے پر کہاں سے ہو؟ ترجمے کا تو اصل الاصول ہی تعاون ہے: مصنف سے تعاون، قاری سے تعاون، اصل زبان سے تعاون، اپنی زبان سے تعاون، موضوعِ کتاب کے خصوصی ماہرین سے مستزاد بلکہ مختلف قسم کے پیشہ وروں کے تعاون کا حصول بھی لازم ہے، تاکہ عمومی سطح پر استعمال ہونے والے اصطلاحی الفاظ کا زندہ مفہوم سمجھ میں آئے، ورنہ علم و ادب کا رابطہ زندگی سے کٹ کر رہ جائے گا۔ چناں چہ ترجمہ ایک نہایت مشقت طلب کام ہے اور جو طبیعتیں اس کے خلاف تعصب اور مزاحمت سے کام لیتی ہیں، درحقیقت محنت سے جان چراتی ہیں۔ ایسے میں تخلیقی الہام اور آمد پرستی سے بہتر بہانہ کیا ہو سکتا ہے؟

ترجمہ ایک فن ہے اور جملہ فنون کی طرح اس فن میں بھی کمال اور بے کمالی کے ہزاروں مدارج موجود ہیں۔ جارج اسٹائنر (George Steiner) کا کہنا ہے کہ ننانوے فی صد تراجم ناقص ہوتے ہیں۔ (اور طبع زاد تحریریں کتنے فی صد ناقص نہیں ہوتیں؟) پھر ترجمے کی بہت سی

رقم ہیں کہ یہ کام تو بازار سے لے کر اقوامِ متحدہ تک اور اخبار سے لے کر ٹی وی تک کسی نہ کسی شکل میں چلتا ہی رہتا ہے، چاہے محض چالو قسم کا ہو۔ عام زندگی میں بھی ترجمے کا معیار قدرے بہتر ہو سکتا ہے اگر اس کو فن کے طور پر نہ سہی، ایک روزمرہ ہنر ہی کی طرح سیکھنے سکھانے کا ماحول پیدا کیا جا سکے۔ فن کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ محض تعلیم و تعلم سے نہیں آتا، گرچہ اس میں بھی ایک عنصر ہنر کا ضرور ہوتا ہے جو ماہرانہ تربیت سے نکھر سکتا ہے۔ لیکن ترجمے کا ہنر اس لحاظ سے خاصا پیچیدہ ہے کہ اس میں دُہری تہری صلاحیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ متن کی زبان اور اپنی زبان تو خیر آنی ہی چاہیے۔ اس موضوع کے ساتھ بھی طبعی مناسبت درکار ہے جو متن میں موجود ہے۔ مصنف سے بھی کوئی نہ کوئی نفسیاتی مماثلت لازمی ہے، اور اس صنفِ ادب یا شاخِ علم سے بھی جس سے متن پیوستہ ہے، مترجم کو پیوستگی حاصل ہو، تب شاید ترجمہ چالو معیار سے اوپر اٹھ سکے۔

تاہم ترجمے کی ذیلی انواع میں ان ساری شرائط کا اجتماع نہیں ہوتا، مثلاً تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ، بلکہ علمی ترجمہ بھی مصنف کی شخصیت اور مترجم کی پیوستگی پر اصرار نہیں کرتا۔ تاہم اس قسم کا ترجمہ بھی لسانی اور علمی (یا تعلیمی اور تکنیکی) اہلیت سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جا سکتا۔ تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے بارے میں ابتدا ایک صراحت ضروری ہے کہ جس چیز کو علمی ترجمے کی بنیاد کہا جا سکتا ہے یعنی نظریاتی علوم، ان کی نہج، طرزِ فکر اور طریق کار کو اپنی زبان میں منتقل کرنا، اس کے بغیر تعلیمی اور تکنیکی ترجمہ کرنا ایسا ہے جیسے سائنس اور ٹیکنالوجی کو درآمد کرنے کی کوشش کی جائے، اس سے بے پروا ہو کر کہ آپ کا معاشرہ اس ٹیکنالوجی کو جذب بھی کر سکے گا یا نہیں۔ درحقیقت جب تک کسی معاشرے میں ایک عمومی سائنسی فضا پیدا نہیں ہوتی، جب تک اجتماعی سطح پر کوئی علمی سرچشمہ وجود میں نہیں آتا، تب تک ٹیکنالوجی کے خریدار خریدار ہی رہتے ہیں، اس کے تولید کار نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو نظامِ تعلیم تحقیقی ترقیاتی (R&D) حیثیت رکھنے والے ادارے پیدا نہیں کر سکتا، محض رسمی تعلیم اور رسمی نصاب کا وسیلہ، چاہے وہ کسی زبان میں ہو، دوررس نتائج کا حامل نہیں ہو سکتا۔ نصابی کتب کا ترجمہ اور طباعت ناشرین کے سپرد ہو، تب بھی ان میں مطابقت اور ہم آہنگی کسی نہ کسی قومی ادارے کی ذمہ داری تو ہو گی۔ اس سے زیادہ، نظریاتی علوم کی موجودہ فکری تعلیمات پر سے ان کا ترجمہ تعلیمی اور تکنیکی ترجمے کے لیے ایک ایسی محکم اساس فراہم کرے گا جس کی روشنی میں نصابی تراجم کا معیار بھی ترقی کر سکتا ہے۔

۴

ترجمے کی دو انواع ابتدا ایسی ہیں جن کے مقصد و منہاج میں بظاہر شدید مخالفت کی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ہیں مشینی ترجمہ اور تخلیقی ترجمہ۔ مشینی ترجمے کا مقصد ہے انسانی زبانوں میں باہمی ترجمے کے عمل کو کمپیوٹر کی مدد سے آسان بنانا تاکہ تعلیمی اور تکنیکی، معلوماتی اور تبلیغاتی مسالا کم سے کم وقت میں تیار ہو سکے۔ پینتالیس ایک برس گزرے کہ جب ایک "خودکار مترجم" تیار کرنے کے لیے ابتدائی تحقیق شروع ہوئی تھی تو یہ توقع پورے جوش و خروش سے ظاہر کی گئی تھی کہ جلد ہی ایک ایسا آلہ ایجاد ہو جائے گا جس میں ایک طرف سے کسی زبان کا متن داخل کیا جائے تو دوسری طرف سے مطلوبہ زبان کا ترجمہ کھٹ سے باہر نکل آئے گا۔ اس دوران میں جدید زبان شناسی کے ماہرین نے مختلف زبانوں کے اجزائے ترکیبی کا تقابلی مطالعہ کر کے واضح کر دیا ہے کہ مشینی ترجمہ بھی آسان کام نہیں۔ چناں چہ اب یہ تقریباً طے ہو چکا ہے کہ کمپیوٹر میں لسانیاتی پروگرام بھرنے کے بعد بھی انسانی ماہرین کی ضرورت برقرار رہے گی اور وقت اور سرمائے کی بچت شاید پھر بھی نہ ہو سکے۔ تاہم دنیا کے کئی ملکوں میں مزید تحقیق جاری ہے اور امید کی جا سکتی ہے کہ پوری طرح خودکار نہ سہی، مشینی ترجمہ کسی قدر آسان ضرور ہو جائے گا۔ تاہم اس کا دائرۂ کار ایسے متون تک محدود رہے گا جن میں زبان کو تہ در تہ معنویت کے ساتھ استعمال نہ کیا گیا ہو۔ اس کے برعکس تخلیقی ترجمہ تو ہوتا ہی ایسی تخلیقات کا ہے جو تہ در تہ معنویت کی حامل ہوں، اور یہ ترجمے کی سب سے مشکل، بلکہ تقریباً ناممکن، قسم ہے۔ یہاں تک کہ تاریخ ادب میں متعدد تخلیقی فنکاروں نے اسے کلیتاً خارج از امکان قرار دے دیا ہے۔ رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) کا جملہ مشہور ہے کہ شاعری اُس چیز کا نام ہے جو ترجمے سے باہر رہ جائے۔ شیلے کے نزدیک "ترجمہ کرنا ایسا ہے جیسے کسی پھول کو کیمیاوی تجزیے کا ہدف بنانا"۔ لیکن خود شیلے کا شمار اپنی زبان کے عمدہ ترین مترجمین میں ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے کے ایک ممتاز مترجم جے ایم کوہین (J M Cohen) کے خیال میں تو شیلے ہی کے تراجم سے واضح ہوتا ہے کہ جب کوئی شاعر کسی ایسے متن کو منتخب کرے جو اُس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو، تو فنِ ترجمہ کیسی بلندیوں تک جا سکتا ہے۔ ان ترجموں میں 'فاوسٹ' کے اجزا بھی شامل ہیں، اور 'فاوسٹ' کو ناقابلِ ترجمہ کہا جاتا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ عالمی ادب میں جس فنکار نے ترجمے کے فن کو افتخار بخشا، خود اُسی کے شاہکار کو ناقابلِ ترجمہ سمجھا گیا۔ تاہم اُس وقت سے لے کر اب تک انگلستان اور امریکا میں اس کے بیسیوں تراجم ہو چکے ہیں اور توقع ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ (اردو میں بھی ڈاکٹر عابد حسین کا نثری ترجمہ موجود ہے۔) لیکن اس میں شک نہیں کہ 'فاوسٹ' کا دوسرا حصہ، جسے اپنی جگہ ایک

Scanned with CamScanner

الگ تصنیف کہا جاتا ہے، اصل زبان میں بھی (طومس مان کے مطابق) "پیچیدگی اور اشکال و ابہام کا ایک انتہائی نمونہ" سمجھا جاتا ہے، یہاں تک کہ بعض اہلِ جسارت نے اسے مہمل تک کہہ دیا ہے۔ (انگریزی کے ایک اور ممتاز شاعر لوئی میک نیس نے صرف پہلے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔)

بہرحال اس میں شک نہیں کہ شاعری -- خصوصاً غنائی شاعری (جیسے ہماری غزل، اپنے بہترین لمحات میں) -- ایک ایسی نازک اور حساس چیز ہے جس کا ترجمے سے باہر رہ جانا سمجھ میں آتا ہے۔ پھر بھی بعض اوقات ایسے تخلیقی ترجمے دیکھنے میں آتے ہیں کہ یقین نہیں آتا، جیسے ان کے اصل متن پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ انسان کا کلام کمالِ فن کے اس درجے تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو خیر ایک مستثنیٰ صورت ہوئی، ورنہ تخلیقی ادب کا ہر کارنامہ اپنی زبان کے رگ و ریشے میں رچا ہوا ہوتا ہے اور اس کو یک اجنبی آب و ہوا میں منتقل کرنا ایک ایسا خطرہ ہے جس میں سلامتی کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہومر اور سیفو، ورجل اور دانتے، گوئٹے اور رلکے، بودلیر اور میلارمے، پشکن اور پاسترناک، بلکہ کالی داس اور بھرتری ہری، امراؤالقیس اور متنبی، سعدی اور حافظ، فردوسی اور رومی کے بارے میں عالمی ادب جو کچھ بھی جانتا ہے ترجمے ہی کے ذریعے جانتا ہے۔ اور شاعری سے قطع نظر، ناول اور ڈرامے کا فن تو اور بھی زیادہ بین الاقوامی ہے۔ ہمارے اپنے اقبال، فیض، اور کسی حد تک غالب، ترجمے ہی کے ذریعے برصغیر کی سرحدوں سے ماورا پہنچ چکے ہیں، اور میر تقی میر ابھی تک نہیں پہنچے تو شاید اس میں کچھ ہمارا بھی قصور ہو۔ تاہم (مرحوم) احمد علی کی "گولڈن ٹریڈیشن" کے بعد یہ امکان بھی اتنا بعید نہیں لگتا۔

زبان شناسی کے ایک خصوصی ماہر آر ایچ روبنز (R H Robbins) کے نزدیک ترجمے کے میدان میں درجہ کمال کی تحصیل ایک ایسا فن ہے جس میں دونوں زبانوں کے جمالیاتی امکانات کے سلسلے میں ذاتی اور انفرادی احساس کی اہمیت سب سے مافوق ہے، لیکن یہ امکانات کہاں تک جا سکتے ہیں اس کا اندازہ ترجمے کی مشکلات کی فہرست بنا کر نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ تخلیقی ترجمہ ایک ایسے اتفاقی حادثے کا نام ہے جس کی پیش بینی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ مختلف زبانوں میں ایسی لفظ بہ لفظ مماثلت بہت کم ملتی ہے جو بامعنی بھی ہو اور درست بھی، تاہم تخلیقی ترجمے کرنے والوں نے متعدد ایسی مماثلتیں دریافت کی ہیں، بلکہ جہاں نہیں بھی تھیں وہاں اپنے تخیل سے پیدا کر کے دکھا دی ہیں، چناں چہ ترجمے کی یہ قسم آزادی اور پابندی کے درمیان ایک جدلیاتی کش مکش کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور جب یہ تضاد ایک اعلیٰ سطح پر مطابقت اور مواصلت کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو فنِ ترجمہ کی رسائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن عام قسم کا لفظ بہ لفظ ترجمہ جس میں اصل زبان کی زندگی مفقود ہو، یا ایسا رواں دواں اور آزاد ترجمہ جس میں اصل کی تہہ در تہہ معنویت قربان ہو جائے، فنِ ترجمہ کی مشکلات سے ناآشنائی یا

Scanned with CamScanner

دانستہ گریز کا مظہر ہے۔ یہ گویا ترجمے کی جدلیات سے آسانی کا ایک راستا نکالنے کی کوشش ہے۔ ہمارے یہاں محمد حسن عسکری مرحوم نے اسی قسم کے رواں ترجمے کو جس میں اصل متن کے اسلوبِ بیان کو کلیتاً نظرانداز کر دیا گیا ہو، اور اس کی جگہ کوئی مماثل اور متوازی اثر پیدا کرنے کی کوشش بھی نہ کی گئی ہو، عالمی ادب کی یا اپنی زبان کی کوئی خدمت تسلیم نہیں کیا۔ اصولی طور پر ایسے ترجموں کو تلخیص، تسہیل یا توضیح کی ایک مشق تو سمجھا جا سکتا ہے، کوئی تخلیقی کمال نہیں سمجھا جا سکتا۔ دراصل تخلیقی سطح کا ہر ترجمہ اپنے ساتھ ایک نیا مسئلہ لے کر آتا ہے کیوں کہ اس کا ربط ایک ایسے متن سے ہے جو اپنی زبان میں ایک بے مثل حیثیت کا حامل ہوتا ہے۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ فرانسیسی ناول "سرخ و سیاہ" کے ترجمے میں مصنف سے بےوفائی کی معذرت کی ہے۔ حسن اور وفا یوں بھی لازم و ملزوم نہیں ہوتے، چناں چہ فرانسیسی زبان میں کہا گیا ہے (انگریزی ترجمہ ملاحظہ ہو):

> Translations are like women: when they are faithful, they are not beautiful: when they are beautiful, they are not faithful

آخر میں دو ایک باتیں ترجمے اور تہذیب کے ربطِ باہم پر۔ ترجمے کا فن انسانیت کی تاریخ میں ایک بین الاقوامی نقطۂ نظر کی پیداوار بھی ہے اور ایک بین الاقوامی اندازِ نظر پیدا کرنے کا وسیلہ بھی۔ بشریات کے عالم مالینوفسکی (Malinovsky) نے اس کو تہذیبی قرائن (contexts) کے اتحاد کا نام دیا ہے۔ لیکن ایک تو کوئی اتحاد یک طرفہ نہیں ہو سکتا، دوسرے زبان کی سرحدوں کو پار کر کے مفاہمتِ باہم کی فضا پیدا کرنا کوئی آسان کام بھی نہیں۔ عربی تعریف کے مطابق ترجمہ 'نقلِ کلام' کو کہتے ہیں، 'نقلِ مطالب' یا 'نقلِ معانی' کو نہیں، اور نقلِ کلام کا تقاضا یہی ہے کہ جس زبان میں نقل ہو اس میں تقریباً ویسا ہی اثر پیدا کرے جیسا کہ اصل زبان میں ہوتا۔ اور یہ بھی لازم ہے کہ کلام سے مکالمے کی صورت پیدا ہو، ورنہ ترجمے کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گا۔

دوطرفہ اثر، یعنی اثرپذیری اور اثرانگیزی، کی مثال ہے یونانی علوم کی منتقلی مسلمانوں میں اور مسلمانوں کے علوم کی منتقلی یورپ میں، جو حران کے نصاریٰ اور اندلس کے یہودیوں کی وساطت سے ہوئی۔ آج ہم جملہ علوم و فنون درآمد کرنے پر لگے ہوئے ہیں اور شاید یہ بھی سمجھتے ہوں کہ تہذیبی سطح پر ہمارے پاس برآمد کی کوئی چیز نہیں۔ اگر سچ مچ ایسا ہو پھر تو ہم کسی دوسری تہذیب کے تخلیقی کارنامے کو اپنی زبان اور اپنی تہذیب میں جذب بھی نہیں کر سکتے۔ ہیں

Scanned with CamScanner

الاقوامیت قومیت کی نفی کا نہیں، اقوامِ عالم کے درمیان افہام و تفہیم پیدا کرنے کا نام ہے۔ اسی طرح ترجمہ بھی اپنی زبان اور اپنی تہذیب کے تشخص کو، اور اس کی اجتماعی خودی کو، ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ اسی کی تعمیر و ترقی کے لیے تو یہ ساری مشقت قبول کی جاتی ہے۔

چناں چہ جذب و انجذاب کی یہ کش مکش جب تک ترجمے میں جلوہ گر نہیں ہوتی اس وقت تک ترجمے کی کوئی تہذیبی اہمیت نمودار نہیں ہو سکتی۔ ترجمے سے خوف زدہ ہونے کی بجائے ہمیں اس تنگ نظری سے خوف زدہ ہونا چاہیے جو اثر انگیزی کا دعویٰ تو رکھتی ہے لیکن اثر پذیری کو حرام سمجھتی ہے۔

اور اب خاتمہ کلام کے طور پر گوئٹے کا ایک اور اقتباس: ہمارے مترجمین اپنی زبان کے محاورے کا بے حد احترام کرتے ہیں، اصل کارنامے کی روح کو گرفت میں لینے سے کہیں زیادہ۔ کسی مترجم کی بنیادی غلطی یہی ہے کہ وہ اپنی زبان کی موجودہ حالت کو برقرار رکھنے پر مُصر رہے اور اس کو غیر زبان سے کوئی زوردار اثر قبول نہ کرنے دے۔ لازم ہے کہ غیر زبان کی مدد سے اپنی زبان میں وسعت اور گہرائی پیدا کی جائے۔ لیکن ابھی تک صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا کہ یہ بات کہاں تک ممکن ہے، اور کوئی بھی زبان کس حد تک اپنی ہیئت کو تبدیل کر سکتی ہے، لیکن ترجمے کے ذریعے یہ کوشش جاری رکھنا مترجم کا فرضِ منصبی ہے۔

**

یہ مضمون ۱۹۸۶ء کے لگ بھگ اسلام آباد میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھا گیا تھا اور اس کے بعد ۱۹۸۷ء میں راولپنڈی کے رسالے "دستاویز" میں شائع ہوا۔ یہاں اس کی دوبارہ اشاعت اس لیے بھی ممکن کی گئی کہ اس کو عالمی ادب کے ترجموں سے خصوصی تعلق ہے۔ مصنف نے اس تازہ اشاعت کے لیے مضمون میں کہیں کہیں ترمیم و اضافہ کیا ہے۔

سیمون دُ بووار

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

ایک محبت کی کہانی (۳)

ناول 'دی مینڈیرنز' کے دسویں باب کا ایک پارہ

"یہ باعثِ شرم ہے!" اُس شام میں نے اپنے سے کہا۔ وہ رابرٹ کی مطالعہ گاہ میں مصروفِ بحث تھے؛ وہ مارشل پلان کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، یوروپ کے مستقبل کے بارے میں، پوری دنیا کے مستقبل کے بارے میں؛ کہہ رہے تھے کہ جنگ کا امکان بڑھتا جا رہا ہے، اور نادین، جو ان کی باتیں بڑے غور سے سن رہی تھی، خوف زدہ نظر آ رہی تھی۔ جنگ سبھی کا دردِ سر ہوتی ہے، چناں چہ میں نے اُن مضطرب آوازوں کو سبک دلی سے سہیں لیا۔ تاہم، میری ساری توجہ صرف اُس خط پر لگی ہوئی تھی، بلکہ اس خط کی ایک سطر پر: "ایک سمندر پار، گداز ترین آغوش بھی سرد پڑ چکی ہے۔" اپنے چند غیر اہم معاشقوں کے اعتراف کے دوران، لوئس نے یہ الفاظ کیوں لکھ دیے تھے جن سے عداوت کی بو آتی تھی؟ میں نے کب اُس سے کہا تھا کہ میرا وفادار رہے؟ ہمارے درمیان اتنا پانی، اتنا جاگ حائل تھا کہ اس کی موجودگی میں وفاداری پر اصرار نری حماقت ہی ہوتا۔ ظاہر ہے، وہ میری غیر موجودگی سے ناراض تھا۔ کیا وہ کبھی مجھے اس کے لیے معاف کر سکے گا؟ کیا میں ایک دن اُس کی حقیقی مسکراہٹ دوبارہ دیکھ سکوں گی؟ میرے ارد گرد لوگ اُس بھیانک انجام پر غور و فکر کر رہے تھے جس کا خطرہ لکھوکھا انسانوں کو لگا ہوا تھا؛ یہ انجام میرا بھی تھا، اور ایک میں تھی کہ محض ایک مسکراہٹ کے پیچھے ہلکان ہوئی جا رہی تھی، ایسی مسکراہٹ جس میں ایٹم بموں کو روکنے کی، کسی بھی چیز کے خلاف کچھ کرنے کی صلاحیت نہیں تھی -- یا کسی کے حق میں کچھ

کرنے کی۔ ظاہر ہے، معشوق فی نفسہ آدمی کی جستجو کا مقصود، اس کے وجود کی ثابت نہیں ہوتی۔ یہ کچھ بھی بدل نہیں سکتی، نہ کہیں پہنچا سکتی ہے۔ خود مجھے بھی نہیں۔ میں یہاں ہوں، رابرٹ ہینری سے محو گفتگو ہے؛ یہ کیسے ممکن ہے کہ وہاں لوئس جو کچھ سوچتا ہوگا وہ مجھ پر اثر انداز ہو سکے؟ میں اپنی تقدیر کو تنہا ایک دل پر، لاکھوں دلوں میں سے تنہا ایک ہی دل پر، اُسی وقت منحصر سمجھ سکتی ہوں جب میرا دماغ چل گیا ہو۔ میں ہنسنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن بے سود؛ میں اپنے سے کہہ رہی تھی: میری آغوش سرد پڑ گئی ہے۔ کچھ بھی سہی، مجھے خیال آیا، میرے دل میں، جو بہرحال لاکھوں دلوں میں سے صرف ایک ہی دل تو ہے ایک تشنج کے اُٹھنے کی دیر ہے، اور اس طویل و عریض دنیا سے میرا سارا سروکار ختم ہو جائے گا، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ میری زندگی کا پیمانہ ایک مسکراہٹ بھی اتنا ہی ہو سکتی ہے جتنا کہ پوری کائنات؛ دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب سراسر مسامانی حرکت ہی ہوگی۔ پھر انتخاب کا حق کب میرا تھا۔

میں نے لوئس کو جواب لکھ دیا۔ مجھے مناسب الفاظ ضرور مل گئے ہوں گے، کیوں کہ اُس کا اگلا خط نہایت پُرسکون اور روزمرانہ تھا۔ اس کے بعد سے اُس نے اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے مجھے دوستانہ سازباز کے انداز میں باخبر رکھا۔ اُس نے اپنی کتاب ہالی وُڈ کو بیچ دی تھی۔ اس کے پاس روپیا پیسہ آ گیا تھا۔ اس نے لیک مِشی گن کے کنارے مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ خوش ہے۔ یہ بہار کے دن تھے۔ نادین اور ہینری نے شادی کر لی تھی؛ اور وہ بھی خوش لگ رہے تھے۔ تو آخر میں بھی کیوں نہ خوش ہوں؟ میں نے ہمت کر کے لکھ دیا: "جھیل کنارے والا گھر دیکھنے کی میری بڑی خواہش ہے۔" وہ چاہے تو اس جملے کو نظر انداز کر سکتا ہے، یا چاہے تو یوں کہہ سکتا ہے: "اگلے سال دیکھ ہی لوگی،" یا شاید یہ کہ "نہیں، مجھے نہیں لگتا کہ تم کبھی اسے دیکھ سکو گی۔" میں جب جواب میں آیا ہوا اُس کا لفافہ لیے کھڑی تھی تو میرا جسم یوں اکڑ گیا تھا گویا میں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑی ہوں۔ "مجھے اپنے کو دھوکا نہیں دینا چاہیے،" میں نے سوچا۔ "اگر اس نے کچھ نہیں کہا تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ مجھ سے دوبارہ ملنے کا خواہش مند نہیں۔" میں نے بیسے رنگ کا تہہ کیا ہوا کاغذ کھولا اور یہ الفاظ میری آنکھوں میں کوندے کی طرح لپک گئے: "جولائی کے ختم پر تمھارے اُسی وقت مکان رہنے کے قابل ہو چکا ہوگا۔" میں صوفے پر ڈھیر ہو گئی؛ عین وقت پر میری بخشش ہو گئی تھی۔ میں اتنی زیادہ ہراساں تھی کہ اول اول مجھے کسی قسم کی مسرت محسوس نہیں ہوئی۔ اور پھر، سچ پوچھیے تو، مجھے اپنی جلد پر لوئس کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا، اور میں نے ہچکی سی لیتے ہوئے کہا: "لوئس!" گزشتہ سال، نیویارک کے ایک ہوٹل کے کمرے میں، اُس کے پہلو میں بیٹھے ہوئے میں نے پوچھا تھا: "کیا کبھی دوبارہ ملاقات ہو سکے گی؟" اور اب اس نے جواب دیا تھا: "آؤ!" سوال اور جواب کے درمیانی وقفے میں جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا؛ وہ پورا سال، جو محض

Scanned with CamScanner

واہمہ تھا، محو ہو چکا تھا، اور مجھے اپنا زندہ اور متحرک جسم دوبارہ مل گیا تھا۔ کیسا زبردست معجزہ ہے! میں نے اپنے جسم کے ساتھ یوں پیار کیا جیسے وہ کوئی لاڈلا بچہ ہو؛ میں، جو عام طور پر اپنے جسم کی اتنی کم پروا کرتی ہوں، میں نے چاہا کہ اُس کی ناز برداریاں ہوں، اس کے سوسنگھار ہوں، اسے طرح طرح سے آراستہ کیا جائے، اور پورے ایک ماہ تک میں نے اس پر دل کھول کر اپنی توجہ صرف کی۔ میں نے ساحل پر پہننے کے کپڑے، نیکر اور کھلی پشت کے اور بے آستین بلاؤز سلوائے؛ پھول دار سوتی کپڑوں میں مَیں گویا جھیل پر پہنچ چکی تھی، اُس کے بوسوں کا لمس محسوس کر سکتی تھی۔ اُس سال دکانوں کی کھڑکیوں میں لمبے، ریشمی، فضول سے پیٹی کوٹوں کی نمائش کی جا رہی تھی؛ میں نے متعدد خرید ڈالے۔ اور میں نے پولا کو اجازت دے دی کہ مجھے پیرس کی گراں ترین خوشبو کی ایک شیشی تحفتاً دے۔ اس بار میں نے پاسپورٹ، ویزا، ایرلائن کمپنیوں، غرض سفر سے متعلق ہر چیز کی ذمےداری ٹریول ایجنسیوں کو سونپ دی۔ جب میں ہوائی جہاز میں سوار ہوئی تو وہ مجھے اتنا ہی محفوظ لگا جتنی کہ نواحی علاقے سے بلاناغہ شہر آنے والی کوئی ٹرین ہوتی ہے۔

رابرٹ نے انتظام کر دیا تھا کہ نیویارک پہنچنے پر مجھے ڈالر تیار ملیں۔ میں اُسی ہوٹل میں اُتری جہاں پچھلے سفر کے دوران ٹھہری تھی، اور وہاں، چھوٹی منزلوں کے فرق کے ساتھ میرے واسطے پہلے والا کمرہ فراہم کر دیا گیا۔ راہداری، جس میں ہلکا سا گھمس اور مدھم سی سرخ روشنی پھیلی ہوئی تھی، مجھے آج بھی اتنی ہی خاموش لگی جتنی دو سال پہلے، جب نجس ہی میرا واحد جنون ہوا کرتا تھا۔ چند گھنٹوں کے لیے میں پھر سے نجست ہو گئی۔ پیرس کا کہیں وجود نہیں تھا، شکاگو ایک وہم تھا؛ میں خالی الذہن، نیویارک کی سڑکوں پر گھومتی پھری۔ اگلی صبح میں مختلف بینکوں اور دفتروں میں بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے ضروری کام نمٹانے میں مصروف ہو گئی۔ اس کے بعد سوٹ کیس لیے اپنے کمرے کو لوٹی۔ آئینے میں مَیں نے اُس عورت کو غور سے دیکھا جسے لوئس شام کو اپنی آغوش میں بھرنے والا تھا۔ وہ جُوڑا کھول کر ان زلفوں کو آہستہ آہستہ گرا دے گا، اور مَیں، اپنے ہونٹوں پر اُس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے ہوئے، خود ہی نہایت نفیس سلا ہوا وہ بلاؤز اپنے جسم سے جدا کر دوں گی جو کسی اور وقت میں ایک انڈین بڑھیا کے شانوں کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ میں نے بلاؤز پر گلاب کا ایک پھول پن کے ذریعے ٹانک دیا — گلاب جس کی قسمت میں بہت جلد پامال ہونا لکھا تھا — اور اپنی گردن کی پشت پر وہی خوشبو تھپک تھپک کر لگائی جو پولا کا تحفہ تھی۔ مجھے مبہم سا احساس ہوا جیسے کسی شکار کو قربانی کے واسطے تیار کر رہی ہوں، لیکن شکار میں خود نہیں کوئی اور ہے۔ میں نے اُس عورت کا ایک آخری بار جائزہ لیا؛ مجھے لگا کہ اس سے محبت کی جا سکتی ہے — اگر وہ محبت ہی تھی۔

چار گھنٹے بعد جہاز شکاگو اترا۔ میں نے ٹیکسی کی اور اس بار مکان تلاش کرنے میں مجھے کوئی

Scanned with CamScanner

وقت نہیں ہوئی۔ ہر چیز اپنی جگہ صحیح سلامت ملی۔ شلتز بیئر کا سرخ اشتہار دیو ہیکل بل بورڈ کے سامنے فروزاں تھا؛ لوئس پورچ میں میز کے سامنے بیٹھا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھ کر ہاتھ لہرایا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ دوڑتا ہوا زینے سے نیچے اترا، مجھے اپنے سے چمٹا لیا اور وہی الفاظ ادا کیے جو متوقع تھے: "تم واپس آ گئیں! آخر تم واپس آ گئیں!" شاید یہ منظر بڑی باصابطگی کے ساتھ رونما ہو رہا تھا، اسی لیے کچھ غیر حقیقی سا لگ رہا تھا۔ جیسے یہ اُس دن کا عکس ہو جو پارسال ہم نے پہلی بار ایک ساتھ گزارا تھا۔ یا پھر یہ کہ میں کمرے کے اجاڑپن سے کچھ زیادہ ہی مضطرب ہو گئی تھی، ایک تصویر، ایک کتاب تک کمرے میں نہ تھی

"کتنا خالی خالی سا لگ رہا ہے!" میں نے کہا۔

"میں نے سارا سامان پار کر بھیج دیا ہے۔"

"نیا مکان تیار ہے؟ کیسا ہے؟"

"تم دیکھ ہی لوگی،" اس نے کہا۔ "بہت جلد۔" اُس نے مجھے اپنی آغوش میں بھر لیا۔ "بڑی عجیب خوشبو ہے!" وہ ہلکے سے تعجب کے ساتھ مسکرا کر بولا۔ "کیا گلاب سے آ رہی ہے؟"

"نہیں بھئی، مجھ سے آ رہی ہے۔"

"لیکن پہلے تو کبھی ایسی خوشبو تم سے نہیں آئی۔"

دفعتاً مجھے ندامت محسوس ہوئی: پیرس کی گراں ترین خوشبو پر، اپنے بلاوز کی شان دار وضع قطع پر، اپنے ریشمی ہیٹی کوٹ پر۔ یہ سب تکلفات۔۔ ان کی ضرورت ہی کیا تھی؟ میری خواہش کرنے کے لیے وہ کب ان سب کا رہینِ منت تھا؟ میں نے اپنے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ ڈھونڈ نکالے۔ یہ نہیں تھا کہ میں اس سے ہم جسم ہونے کو مری جا رہی تھی، بلکہ میں صرف یہ اطمینان کر لینا چاہتی تھی کہ اُسے اب بھی میری طلب ہے۔ اس کے ہاتھوں نے میرے ہیٹی کوٹ کے ریشم کو چُرمُر کر کے رکھ دیا؛ گلاب کا پھول فرش پر آ رہا، اور اس کے پیچھے پیچھے میرا بلاوز بھی، اور میں نے اپنے سے سوال جواب کرنا بند کر دیا۔

میں دیر تک سوتی رہی؛ جب اٹھی تو دوپہر ہو رہی تھی۔ جب تک میں ناشتہ کرتی رہی، لوئس بتاتا رہا کہ پارک میں کون کون لوگ ہمارے پڑوسی ہوں گے۔ اوروں کے علاوہ اس نے ڈورو تھی کے بارے میں بھی بتایا۔۔ ایک دیرینہ دوست جو ناشاد ازدواجی زندگی کے بعد اب مطلقہ ہو چکی تھی، اور جو ہمارے مکان سے دو تین میل دور اپنی بہن اور اس کے شوہر کے ساتھ مقیم تھی۔ مجھے ڈورو تھی سے بہت زیادہ دل چسپی نہیں محسوس ہو رہی تھی، اور شاید وہ بھی اس بات کو بھانپ گیا تھا، جبھی تو اس نے یک لخت سوال کر ڈالا: "ریڈیو پر بیس بال کا کھیل آ رہا ہے۔ لگا دوں تو برا تو نہیں مانو گی؟"

Scanned with CamScanner

"بالکل نہیں۔ میں بیٹھ کے اخبار پڑھوں گی۔"

"میں نے نیویارکر کے سارے شمارے تمہارے لیے سنبھال رکھے ہیں،" لوئس نے گرم جوشی سے کہا، "اور جو مضامین دلچسپ نظر آئے اُن پر نشان بھی لگا دیے ہیں۔"

اس نے ناشتہ ٹیبل پر رسالوں کا انبار لگا کر ریڈیو چلا دیا۔ ہم بستر پر پسر گئے اور میں نیویارکر کی ورق گردانی کرنے لگی۔ لیکن مجھے بے چینی محسوس ہوئی۔ اُن دوسرے برسوں میں بھی بارہا ایسا ہوا تھا کہ ہم بستر پر پہلو بہ پہلو پڑے، بغیر ایک دوسرے سے بات کیے، اخبار پڑھتے یا ریڈیو سنتے۔ تاہم آج، جب کہ میں ابھی وارد ہی ہوئی تھی، مجھے عجیب سا لگا کہ میں لوئس کے پہلو میں پڑی ہوئی ہوں اور اُسے صرف بیس بال کا دھیان ہے۔ پچھلے سال، ہم نے پورے کا پورا پہلا دن جنسی ملاپ میں گزارا تھا۔ میں نے ورق اُلٹا لیکن اخبار پر اپنی توجہ قائم نہ رکھ سکی۔ اس بار، دخول سے پہلے، لوئس نے بتی بھی گل کر دی تھی؛ اس نے مجھ پر اپنی مسکراہٹ نچھاور نہیں کی تھی، مجھے میرا نام لے کر نہیں پکارا تھا۔ کیوں؟ میں اپنے سے کوئی سوال کیے بغیر ہی سو گئی تھی، لیکن سوال کو جھٹک دینا سوال کا جواب دینے کے مترادف تو نہیں ہوتا۔ 'شاید وہ مجھے دوبارہ پوری طرح پا نہیں سکا ہے،' مجھے خیال گزرا۔ 'پورا ایک سال گزر جانے کے بعد دوسرے کو پوری طرح پا لینا اتنا آسان بھی تو نہیں۔ مجھے صبر سے کام لینا چاہیے۔ وہ مجھے ضرور دوبارہ پا لے گا۔' میں نے ایک مضمون پڑھنا شروع کیا لیکن پھر رک گئی۔ مجھے حلق میں تناؤ محسوس ہوا۔ مجھے فاکنر کی تازہ ترین تصنیف کی ذرا پروا نہ تھی، نہ کسی اور چیز کی۔ مجھے لوئس کی آغوش میں ہونا چاہیے تھا، اور میں اس کی آغوش میں تھی۔ کیوں؟ وہ بیس بال کا کھیل شیطان کی آنت کی طرح لمبا نکلا۔ گھنٹوں گزر گئے اور لوئس ہنوز ریڈیو سننے میں منہمک تھا۔ اور کچھ نہیں تو نیند ہی آ جاتی۔ مگر میں نیند سے سیر ہو چکی تھی۔ آخرکار میں نے فیصلہ کر ڈالا۔

"لوئس، ایک بات بتاؤں؟ مجھے بھوک لگی ہے،" میں نے بشاشت سے کہا۔ "تمھیں نہیں لگی؟"

"بس دس منٹ اور،" اُس نے جواب دیا۔ "میں نے جائنٹس پر اسکاچ کی تین بوتلوں کی شرط لگا رکھی ہے۔ اسکاچ کی تین بوتلیں! بڑی بات ہے، ہے نا؟"

"ہاں، بہت بڑی۔"

میں لوئس کی وہی پرانی مسکراہٹ پہچان گئی، اور اُس کی مذاق اڑاتی ہوئی اُنس بھری آواز بھی۔ کسی اور دن یہ سب حسبِ معمول ہوتا؛ شاید آج بھی تھا، کہ آج کے دن اور دوسرے تمام دنوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ بہرکیف، وہ آخری دس منٹ مجھے قیامت کے انتظار کی طرح طویل معلوم ہوئے۔

Scanned with CamScanner

"جیت گیا!" لوئس نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ پھر وہ اٹھا اور ریڈیو بند کر دیا۔ "بےچاری بھوکی عورت! تمھیں کھانا کھلواتے ہیں۔"

میں بھی بستر سے اٹھی اور کنگھی کرنے لگی۔ "کہاں لے جا رہے ہو کھانا کھلانے؟"

"وہ پرانا جرمن ریستوراں کیسا رہے گا؟"

"اچھا خیال ہے۔"

مجھے وہ ریستوراں پسند تھا، اس سے میری خوش گوار یادیں وابستہ تھیں۔ سا سیبزا اور لالی بند گوبھی کھاتے ہوئے ہم خوش دلی کے ساتھ گپیں مارتے رہے۔ لوئس نے مجھے اپنے ہالی وُڈ کے تجربے کے بارے میں بتایا۔ بعد میں وہ مجھے اُس سستے سے شراب خانے میں لے گیا جہاں شہر بھر کے رند اور اوباش جمع تھے، اور وہاں سے اُس چھوٹی سی نیگرو رقص گاہ میں جہاں بگ بلی گاتا تھا۔ لوئس ہنس رہا تھا، میں ہنس رہی تھی؛ ماضی پھر سے زندہ ہو رہا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا، "نہیں، یہ تو بس ایک اچھی سی نقل ہے!" مجھے یہ خیال کیوں آیا؟ کیا ہو گیا تھا؟ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ ضرور میرا سر ہی پھر گیا ہو گا جو ادھر اُدھر کے اندیشوں میں پڑ گئی۔ جہاز کے سفر اور اپنی آمد سے پیدا ہونے والے جذباتی اثر نے مجھے نڈھال کر دیا تھا۔ بالکل ظاہر ہے کہ میں ہلکے سے نشے میں آ گئی تھی۔ سال بھر پہلے لوئس نے مجھ سے کہا تھا۔ "میں تم سے محبت نہ کرنے کی کوشش چھوڑ دوں گا۔۔۔ میں نے آج سے پہلے تمھیں اس دیوانگی سے نہیں چاہا ہے۔" اُس نے مجھ سے یہ کہا تھا، مگر یہ گزرے کل کی بات تھی، اور میں ہنوز وہیں تھی، اور وہ ہنوز وہ تھا۔ ٹیکسی کے اندر، جو ہمیں ہمارے بستر کی طرف لے جا رہی تھی، میں اس کی آغوش میں جم کر بیٹھ گئی۔ اس میں کیا کلام تھا کہ وہ وہی تھا؛ میں نے اُس کے کندھے کی کھرردی حرارت کو فوراً پہچان لیا، لیکن اس کے ہونٹوں تک دوبارہ نہ پہنچ سکی؛ اُس نے میرا بوسہ نہیں لیا۔ اور اپنے سر کے اوپر مجھے جمائی لینے کی آواز سنائی دی۔

میں ذرا بھی نہیں ہلی، مگر مجھے محسوس ہوا جیسے رات کی گہرائیوں میں اُترتی چلی جا رہی ہوں۔ "پاگل پن شاید اسی کیفیت کا نام ہے،" میں نے سوچا۔ دو چُندھیا دینے والی روشنیاں اندھیرے کو چھیدتی ہوئی اُبھریں، دو سچائیاں جو یکساں طور پر سچ تھیں، اور جو بیک وقت سچ نہیں ہو سکتی تھیں: لوئس میرا عاشق ہے؛ لیکن عین اُس وقت جب مجھے آغوش میں لیے ہوئے ہے، جمائی بھی لے رہا ہے۔ میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ کپڑے اتارے۔ میرے لیے لوئس سے ایک سوال پوچھنا ضروری تھا، ایک سادہ سا سوال۔ اب بھی یہ سوال میرے حلق کو اُدھیڑے ڈال رہا تھا؛ مگر اس اوسان خطا کر دینے والی دہشت سے کوئی بھی شے بہتر تھی جیسے بستر میں گھس گئی۔ وہ میرے پہلو میں آ کر لیٹ گیا اور چادر کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔

"شب بخیر۔"

Scanned with CamScanner

اس وقت تک وہ میری طرف پیٹھ پھیر چکا تھا۔ میں نے اس کا شانہ مضبوطی سے گرفت میں لے لیا اور اس سے اور زور سے چمٹ گئی۔

"لوئس، کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں۔ بس تھکا ہوا ہوں۔"

میرا مطلب ہے پورا دن، کیا ہو گیا تھا؟ مجھے دوبارہ پا نہیں سکے؟"

'بالکل پا گیا تھا،' اس نے جواب دیا۔

"اب مجھ سے محبت نہیں رہی، یہی بات ہے نا؟"

خاموشی چھا گئی، فیصلہ کن خاموشی۔ اس خاموشی نے مجھے سُن کر کے رکھ دیا۔ پوری شام مجھے اس بات کا دھڑکا لگا رہا تھا، لیکن مجھے اپنے خوف کے درست ہونے کا سنجیدگی سے یقین نہیں تھا۔ مگر اب، اچانک، شک کی گنجائش بالکل ختم ہو گئی تھی۔

تمہیں مجھ سے محبت نہیں رہی؟' میں نے دوبارہ پوچھا۔

"میں اب بھی تمہارا اُتنا ہی گرویدہ ہوں۔ تمہارے لیے اتنی ہی اُلفت محسوس کرتا ہوں،' لوئس نے خواب آلود آواز میں کہا۔ 'لیکن اسے محبت نہیں کہہ سکتے، پہلے جیسی۔"

آخر کار اُس نے کہہ ہی دیا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے وہ الفاظ سنے، اور کوئی چیز نہیں مٹا نہیں سکتی تھی، کبھی نہیں۔ میں مُہر بہ لب تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے ساتھ کیا کروں۔ میں اب بھی پہلے ہی جیسی تھی، ہو بہو اور ماضی، مستقبل، حال --- ہر چیز میرے سامنے بکھر رہی تھی۔ حتیٰ کہ میری آواز بھی لگتا تھا میری نہیں رہی۔

مجھے پتا تھا!' میں نے کہا۔ "مجھے پتا تھا کہ تمہیں کھو دوں گی۔ یہ تو مجھے پہلے دن سے معلوم تھا۔ اسی لیے تو میں کلب ڈیلیسا میں رو پڑی تھی۔ اور اب یہ ہو رہا ہے۔ یہ کیسے ہوا؟"

'سارا روگ ہی یہ ہے کہ کچھ نہیں ہوا،' لوئس بولا۔ 'اس سال میں نے بغیر کسی بے تابی کے تمہارا انتظار کیا۔ ٹھیک ہے، عورت کا آس پاس ہونا بڑی اچھی بات ہے؛ باتیں کی جا سکتی ہیں، ساتھ سویا جا سکتا ہے، اور پھر وہ چلی جاتی ہے۔ اب یہ ایسی بات تو نہیں جس کے پیچھے پاگل ہوا جائے۔ لیکن میں خود سے مسلسل یہی کہتا رہا کہ اگلی بار تم سے ملتے پر واقعی کچھ ہو رہے گا۔

'سمجھتی ہوں،' میں نے نقاہت سے کہا۔ 'اور کچھ نہیں ہوا۔"

'نہیں۔

حواس باختہ ہو کر مجھے خیال آیا۔ 'ہو بہو یہ سب اُسی خوشبو، اُنھیں ریشمی کپڑوں کا کیا دھرا ہے۔ مجھے پھر سے ابتدا کرنی پڑے گی؛ میں وہی لباس پہنوں گی جو پچھلے سال پہنا تھا---- لیکن ظاہر ہے، اس معاملے کا میرے چھٹی کوٹ سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے ایسی آواز بڑی دور سے آتی

Scanned with CamScanner

سنائی دی۔ "اچھا، تو اب کیا کریں گے؟" میں کہہ رہی تھی۔

"ظاہر ہے پوری گرمیاں بہت خوش گواری سے ساتھ گزاریں گے!" لوئس نے جواب دیا۔ "کیا آج کا دن اچھا نہیں گزرا؟"

"نہایت خبیث دن تھا!"

"اچھا؟" وہ بڑے کرب کی حالت میں نظر آیا۔ "میرا خیال تھا کہ تمھیں کسی بات کا احساس نہیں ہوا۔"

"مجھے ہر بات کا احساس ہوا۔"

میری آواز رندھ گئی؛ اور کچھ نہ بولا گیا۔ اور بولنے سے ہوتا بھی کیا؟ پچھلے سال جب لوئس نے مجھ سے مزید محبت نہ کرنے کی کوشش کی تھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ اپنے کینے اور مزاج کی برہمی کے باوجود اُسے اپنی کوشش میں کامیاب ہونے میں خاصی دقت پیش آ رہی ہے۔ اور اس بات سے میری امید بندھی رہی تھی۔ لیکن امسال اس کے اندر ہیں خود کو مجبور کرنے کی کیفیت نہیں تھی۔ اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی، اور یہ صاف ظاہر تھا۔ ایسا کیوں تھا؟ کیسے تھا؟ کب سے تھا؟ ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی؛ سب سوال بے کار تھے۔ تفہیم اُسی وقت اہم ہوتی ہے جب امید باقی ہو، اور مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ امید کرنے کے لیے اب میرے پاس کچھ باقی نہیں بچا ہے۔

"اچھا، تو شب بخیر،" میں بڑبڑائی۔

ایک لمحے کے لیے اُس نے مجھے اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ "میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ تم ناخوش ہو،" اس نے کہا۔ میرے بالوں پر ہاتھ پھیر کر ان کے خم نکالے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں۔

"میری پروا نہ کرو،" میں نے کہا۔ "مجھے نیند آ رہی ہے۔"

"تو سو رہو،" وہ بولا۔ "اچھی طرح سونا۔"

میں نے آنکھیں موند لیں؛ ہاں، میں یقیناً سوؤں گی۔ میں اپنے کو بے حد تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی، اور یہ کیفیت اُس خستگی سے کہیں زیادہ شدید تھی جو ساری رات بخار میں بھٹکنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔ "اچھا، تو یہ بات ہے،" میں نے ٹھنڈے دل سے سوچا۔ "کچھ نہیں ہوا، یعنی بات معمول کے مطابق ہے۔ غیر معمولی تو یہ تھا کہ کسی دن کچھ ہو رہتا۔ کیا؟ اور کیوں؟" دراصل یہ بات میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی کہ محبت ہمیشہ بلا استحقاق ملتی ہے۔ لوئس نے کسی معقول وجہ کے بغیر مجھ سے محبت کی تھی؛ اس پر مجھے تعجب نہیں ہوا تھا۔ اور اب اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی؛ یہ بات بھی باعثِ تعجب نہ تھی، بلکہ یہ تو قطعی معمول کے مطابق تھی۔ اچانک یہ الفاظ ایک دھماکے کے ساتھ میرے دماغ میں پھٹے: اسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔ یہ تیں تھی جس

Scanned with CamScanner

سے اُسے محبت نہیں رہی تھی؛ میں مرتے دم تک یہ بات چلا چلا کر دُہرانا چاہتی تھی۔ میں رونے لگی۔ وہ ہر صبح مجھ سے پوچھا کرتا تھا: 'تم ہنس کیوں رہی ہو؟ یہ خوش مزاجی، یہ کشش -- ان کی وجہ؟' اب میں اس طرح نہ ہنس سکوں گی۔ 'ایلن!' وہ اپنے منفرد انداز میں میرا نام لیا کرتا تھا۔ اب وہ کبھی مجھے اس طرح نہیں پکار سکے گا۔ اب کبھی بھی میں وہ محبت اور راحت بھری نظر اس کے چہرے پر نہ دیکھ سکوں گی۔ 'ہر قرض، اول آخر، چکانا ہی پڑتا ہے'، میں نے سسکیاں بھرتے ہوئے سوچا۔ 'ہر چیز جو مجھے دی گئی تھی، اور بلا مانگے دی گئی تھی، اسے برابر آنسوؤں کے وزن میں لوٹانی پڑے گی۔' فاصلے میں کسی سائرن کی ماتمی آواز بلند ہوئی، ریل گاڑی کی سیٹیوں سے فضائے شب کا سینہ چاک ہوا۔ میں رو پڑی۔ میرا جسم بُری طرح تھر تھر انے لگا، اور یوں اپنی تمام تر حرارت سے تہی ہو گیا؛ میں سرد اور ڈھیلی پڑ گئی، کسی کمہلائی لاش کی طرح۔ کاش میں مکمل طور پر اپنے سے جاتی رہتی! کم از کم رونے کے دوران فردا کے اندیشوں سے نجات مل جاتی تھی اور سر تمام خیالات سے خالی ہو جاتا تھا۔ مجھے لگا جیسے میں تھکے بغیر وقت کی انتہا تک یوں ہی سسکیاں بھرتی رہ سکتی ہوں۔

تھکن کا احساس خود رات کو مجھ سے پہلے ہوا؛ کچن میں سُتی ہلکی کا رنگ بتدریج پھیلا ہوتا گیا، اور پتّے کی شکل کا کوئی سایہ مضبوطی کے ساتھ اس سے چپک گیا۔ جلد ہی مجھے اٹھنا ہوگا، بولنا ہوگا، ایک ایسے آدمی کا سامنا کرنا ہوگا جس نے رات بغیر آنسو بہائے گزاری تھی۔ کاش میں اسے کم از کم اسی بات کا قصوروار ٹھہرا سکتی؛ یوں یہ بات ہمیں ایک دوسرے کے قریب لانے کا بہانہ بن جاتی۔ لیکن نہیں، وہ محض ایک ایسا انسان تھا جس کو کچھ نہیں ہوا تھا۔ میں اٹھی۔ کچن میں صبح خاموش اور آشنا تھی، بہت سی اور صبحوں کی طرح۔ میں نے اپنے واسطے تھوڑی سی اسکاچ انڈیلی اور اس کے ایک گھونٹ کے ساتھ زکام کی ایک ٹکیا حلق سے تار لی۔

"نیند آئی؟" لوئس نے پوچھا۔

"تھوڑی سی۔"

"خاصی احمقانہ حرکت کی تم نے!"

وہ کچن کے کاموں میں لگ گیا۔ اس کی پشت میری طرف تھی، جس کے باعث میرا اس سے بات کرنا آسان ہو گیا۔ "بس ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی،" میں نے کہا۔ "ایسا ہی تھا تو مجھے کیوں آنے دیا؟ خبردار ہی کر دیتے۔"

"لیکن میں تم سے ملنا چاہتا تھا،" لوئس نے گرم جوشی سے جواب دیا۔ وہ مڑا اور میری طرف دیکھ کر بڑی معصومیت سے مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں ہو، مجھے خوشی ہے کہ ہم دونوں گرمیاں ساتھ ساتھ گزاریں گے۔"

Scanned with CamScanner

"تم ایک بات بھولے جا رہے ہو،" میں نے کہا۔ "یہ کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔ ایسے آدمی کے ساتھ رہنا جس سے پیار ہو، مگر جو پیار نہ کرتا ہو، بڑے جوکھم کا کام ہے۔"

"لیکن تمھیں مجھ سے ہمیشہ محبت کہاں رہے گی،" لوئس نے میری ہمت افزائی کی غرض سے سبک سے لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر فی الحال تو مجھے تم سے محبت ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "تم بڑی باشعور ہو، زیادہ دن تک اسے چلنے نہیں دو گی۔" پھر اس نے اضافہ کیا، "سنجیدگی سے کہتا ہوں، کسی کو پوری طرح چاہنے کے لیے آدمی کو بڑے شدید اضطراب سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب دو طرفیں کھیل میں شریک ہوں تو واقعی یہ اس قابل ہے کہ کھیلا جائے؛ لیکن اگر صرف ایک ہی کھیل رہا ہو تو اسے حماقت ہی کہا جا سکتا ہے۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ واقعی بے حس تھا یا محض بے حس ہونے کا ڈھونگ بھر رہا تھا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ یہ بات پوری دیانت داری سے کہہ رہا ہو؛ شاید محبت اس کی نظر میں بالکل بے توقیر ہو چکی ہو، کیوں کہ اسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی تھی۔ کچھ بھی سہی، اس کی خود غرضی نے، خواہ وہ دانستہ رہی ہو یا نادانستہ، یہ ضرور ثابت کر دیا تھا کہ میں اس کے لیے تقریباً بے حیثیت ہو چکی ہوں۔ میں بستر پر لیٹ گئی۔ میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ لوئس لکڑی کے ڈبوں میں کتابیں بھرنے لگا۔ دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ میں ہنوز تحت الثریٰ سے نہیں جا لگی ہوں۔ میں میکسیکن کمبل پر دراز تھی، زرد جھلمی اور دیواروں کو دیکھ رہی تھی؛ مانا کہ مجھ سے اب محبت نہیں کی جا رہی تھی، تاہم میں وہی آسودگی محسوس کر رہی تھی جو صرف اپنے آنگن میں محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ سب کسی اور کی ملکیت تھا۔ شاید لوئس کسی اور عورت کی محبت میں گرفتار تھا۔ پچھلے سال مختلف دوسری عورتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں؛ اس نے مجھے ان کے بارے میں لکھا بھی تھا، اور ان میں سے کوئی بھی مجھے باعثِ تشویش نہیں لگی تھی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ کسی ایسی عورت سے بھی ملا ہو جس کے بارے میں اس نے جان بوجھ کر مجھے کچھ نہیں لکھا۔

"لوئس،" میں نے اسے پکارا۔

اس نے سر اٹھا کر کہا، "کہو۔"

"میں ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں: کیا کوئی دوسری عورت ہے؟"

"خدارا، نہیں!" وہ چیخ اٹھا۔ "میں دوبارہ کسی محبت میں مبتلا نہیں ہوں گا!"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری جان بدترین انجام سے بچا لی گئی تھی۔ وہ چہرہ مجھے دوبارہ کبھی نظر نہیں آئے گا، وہ آواز دوبارہ کبھی سنائی نہیں دے گی، لیکن تم اگر کسی اور کو بھی

Scanned with CamScanner

نہیں۔

"تم یہ کیوں کہہ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ "کسے معلوم۔"

لوئس نے سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے کہ میں محبت کرنے کے واسطے نہیں پیدا کیا گیا،" اس نے قدرے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "تم سے پہلے کبھی کسی عورت کی میرے لیے اہمیت نہیں رہی۔ جن دنوں تم سے ملاقات ہوئی، زندگی بڑی خالی خالی سی لگ رہی تھی۔ اسی لیے میں اس محبت میں اندھا دھند کود پڑا۔ اور نتیجے میں یہ بھی ختم شد۔" اس نے خاموشی سے میرا جائزہ لیا۔ "تاہم،" اس نے اضافہ کیا، "اگر کبھی کوئی عورت میرے واسطے تخلیق کی گئی ہو تو وہ صرف تم ہی ہو سکتی ہو۔ تمہارے بعد کوئی اور نہیں۔"

"کبھی"

لوئس کے دوستانہ لہجے نے میری یاس کا پیمانہ بھر دیا۔ اگر اس کا انداز جارحانہ ہوتا، غیر منصفانہ ہوتا، تو میں اپنے دفاع کی کوشش کرتی۔ لیکن نہیں، ہمیں جو کچھ پیش آرہا تھا، اس سے وہ بھی تقریباً اتنا ہی آزردہ تھا جتنی میں تھی۔ میرا سر اور شدت سے دکھنے لگا تھا، چناں چہ میں نے اس سے مزید سوال کرنا بند کر دیا۔ بس تنہا فیصلہ کن سوال کا پوچھنا بے سود تھا: لوئس، اگر میں یہیں رہ گئی ہوتی تو کیا تم مجھ سے محبت کیے جاتے؟" کیوں کہ میں یہاں نہیں رہ گئی تھی۔

لوئس میرے لیے سکون آور دوا خریدنے گیا: میں نے دو ٹکیاں کھائیں اور سو گئی۔ پھر میں بڑبڑا کر اٹھ پڑی۔ "اور نتیجے میں یہ بھی ختم شد!" میں نے فوراً اپنے سے کہا۔ میں کھڑکی کے پاس جا بیٹھی؛ میرے عقب میں لوئس پلیٹیں وغیرہ پیک کر رہا تھا۔ ابھی سے خاصی گرمی ہو گئی تھی: زمین کے ایک خالی قطعے کے خس و خاشاک کے درمیان بچے گیند کھیل رہے تھے؛ ایک ننھی سی بچی تین پہیوں کی سرخ سائیکل پر لڑکھڑا رہی تھی، اور میں خود کو رو پڑنے سے باز رکھنے کی کوشش میں اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک لمبی سی شاہانہ کار کا تعاقب کیا جو سڑک پر فٹ پاتھ سے لگی لگی چل رہی تھی۔ میں نے اپنا رُخ پھیر لیا: وہی منظر تھا، وہی کمرہ، زرد جھلسی پروہی ساخ: لوئس ایک پرانی، پیوند لگی پتلون پہنے ہوئے تھا، وہ ہولے ہولے سیٹی بجا رہا تھا۔ ماضی سرکشی کا کھلم کھلا اظہار کر رہا تھا، یہ سب مزید برداشت کرنے کی مجھ میں تاب نہ رہی۔

میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہی ہوں،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں ٹیکسی میں لوپ پہنچی اور وہاں دیر تک بے مقصد گھومتی پھری؛ چلنا آدمی کو تقریباً اتنا ہی مصروف رکھتا ہے جتنا کہ رونا۔ سڑکیں مجھے اپنی بیری لگیں۔ مجھے یہ شہر پسند تھا۔ مجھے یہ ملک بھی پسند تھا۔ لیکن ان دو برسوں میں بہت کچھ بدل گیا تھا، اور لوئس کی محبت اب میری محافظ نہیں رہی تھی۔ اب امریکا کا مطلب تھا ایٹمی بم، جنگ کا خطرہ، فاشزم جو پیدا ہو رہا تھا۔ میں جن لوگوں کے

پاس سے گزری ان میں زیادہ تر دشمن تھے، میں اکیلی تھی، حقارت کا ہدف، گم گشتہ "میں یہاں کیا کر رہی ہوں؟" میں نے اپنے سے پوچھا۔ دوپہر ڈھلے تک میں سے دیکھا کہ میں شلٹز کے اُسی اشتہار کے پاس سے ہو کر گزر رہی ہوں۔ ایک گلی میں کوڑے کے ڈبوں سے دھواں اُٹھ رہا تھا جس سے حراں کی خوش گوار سی مہک آ رہی تھی۔ میں چوبی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور کھڑکی سرخ اور سفید چوخانوں والے تختے کو تکنے لگی جو گیس ٹینک کو چھپانے کا کام دیتا تھا۔ فاصلے میں کوئی ریل گاڑی گزری اور پورا پورچ لرزنے لگا۔ پہلے دن بھی ہو بہو یہی منظر تھا، اور باقی دنوں میں بھی۔ بہتر ہوگا کہ پیرس لوٹ جاؤں، میں نے اپنے سے کہا۔ سڑک کا وہ کونا مجھے نظر آ رہا تھا جہاں میری روانگی ابھی سے میری منتظر تھی۔ وہ ٹیکسی جو مجھے یہاں سے پرے لے جانے والی تھی، کہیں شہر میں گھومتی پھر رہی تھی؛ لوئس ہاتھ کے ایک مانوس اشارے سے اُسے بلانے گا اور پھر دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے گا۔ دروازہ تو پہلے بھی بند ہو چکا ہے — ایک بار، دو بار، تین بار — لیکن اس بار ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ "دہشت کے تین ماہ جھیلنے کی آخر کیا ضرورت؟" جب تک میں لوئس کو دیکھتی رہوں گی، جب تک وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتا رہے گا، مجھے محبت کو اپنے اندر مار دینے کی ہمت کبھی نہ ہو سکے گی۔ لیکن فاصلے سے قتل کیا جا سکتا ہے۔" میں نے ریلنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں اس محبت کو قتل نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں، میں نہیں چاہتی کہ ایک دن لوئس بھی میرے واسطے اتنا ہی مُردہ ہو جائے جتنا دیا گو ہو چکا تھا۔

"امید ہے کہ تمہیں گھر پسند آئے گا،" لوئس نے اگلی صبح مجھ سے کہا۔

"بالکل پسند آئے گا، مجھے یقین ہے،" میں نے کہا۔

وہ طشتریوں کے ڈبوں میں بند اشیا اور چند آخری کتابیں ایک ڈبے میں بھر رہا تھا۔ شکاگو چھوڑتے ہوئے مجھے طمانیت محسوس ہو رہی تھی۔ پارکر میں کم از کم چیزوں کو ماضی کی نقالی پر تو اصرار نہیں ہوگا۔ وہاں ایک باغیچہ ہوگا، دو ہمارے الگ الگ بستر ہوں گے؛ گفتگو بھی مقابلتاً کم ہوگی۔ میں اپنا سوٹ کیس پیک کرنے لگی۔ وہ انڈین بلاوز، میں نے اُسے سب سے نیچے دفن کر دیا۔ اب سے دوبارہ کبھی نہ پہن سکوں گی؛ مجھے لگا جیسے اس کی کشیدہ کاری میں کوئی موذی روگ چھپا بیٹھا ہو۔ بدل ناخواستہ میں نے اُن تمام اسکرٹوں کو چھوا، ان تمام بلاؤزوں کو، ور ساحل پر پہننے کے کپڑوں کو جن کا میں نے کتنی کاوش سے انتخاب کیا تھا۔ میں نے سوٹ کیس بند کر دیا اور اپنے لیے سکاچ کا ایک شُدہ تیز جام تیار کیا۔

"تم اتنی نہ پیا کرو،" لوئس نے کہا۔

"وہ کیوں؟"

میں نے بیئر ڈرنک کی ایک ستون آور گھیا حلق سے اتاری؛ ان دنوں کو گزارنے کے لیے،

Scanned with CamScanner

جن میں مجھے باقاعدہ ہر گھنٹے خود کو یاددہانی کرنی پڑتی تھی کہ اُسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی، مجھے بہرحال سہارے کی ضرورت تھی۔ خاص طور پر آج کے دن، جب دوست ہمیں کار میں لینے آرہے تھے؛ مجھے کسی کونے کھدرے میں سمٹ کر تھوڑی دیر کے لیے رو لینے کا موقع کہاں سے ملے گا۔

"ایمی، یہ ایول اور نیڈ ہیں۔"

میں نے دونوں سے ہاتھ ملایا۔ خوش خلقی سے مسکرائی۔ کار شہر سے اور پھر باغات اور مضافات سے ہو کر گزری۔ ایول نے کچھ کہا۔ میں نے جواب دیا۔ ہم نے ایک بے حد وسیع اور سپاٹ میدان کو پار کیا جو چمنیوں، ہاؤسنگ کالونیوں اور ایسے پیڑوں کے جھنڈوں سے اٹا پڑا تھا جن کی بڑے سلیقے سے نگہداشت کی گئی تھی، اور پھر ایک سڑک کے آخر پر آکر رک گئے جہاں دیوقامت گھاس نے راستا بند کر رکھا تھا۔ کنکروں کی روش ایک سفید سے گھر کی طرف جاتی تھی؛ گھر کے سامنے ایک لان تھا جو بڑی ہمواری سے، نیچے ایک تالاب کی طرف جھکا آرہا تھا۔ میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چمکتے ٹیلوں، سطحِ آب پر تیرتی ہوئی بیدوں اور گھنے درختوں کی چلمن کو دیکھا۔ دو ماہ تک میں یہاں رہنے والی تھی، جیسے اپنے ہی گھر میں۔ اور پھر مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا تھا، کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

"کیسا ہے؟" لوئس نے پوچھا۔

"بے حد شاندار!"

لان کے آخری سرے پر کچھ لوگ اینٹوں سے بنے ہے باربی کیو کے گڑھے کے گرد بیٹھے ہوئے تھے جس میں سے دھواں اُٹھ رہا تھا۔ انھوں نے بڑی زندہ دلی کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا: ڈوروتھی، اس کی بہن ورجینیا، سنوئی دن جو پاس کی کسی فیکٹری میں ملازم تھا، اور برٹ، ایک بھاری بھرکم شخص جو شکاگو کے کسی ابتدائی اسکول میں پڑھاتا تھا۔ گڑھے پر پڑی جالی کے اوپر ہیمبرگر پڑے سُوں سُوں کر رہے تھے؛ تلی ہوئی پیاز اور جلتی ہوئی لکڑی کی بڑی مرغوب مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کسی نے مجھے وہسکی کا گلاس پکڑ دیا اور میں غٹاغٹ چڑھا گئی۔ مجھے اس کی بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی۔

"بالکل ہیرے جیسا نہیں ہے یہ گھر؟" ڈوروتھی نے کہا۔ "ٹیلوں سے ذرا آگے جھیل ہے۔ تالاب کو پار کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی کشتی بھی ہے۔ آدمی پانچ منٹ میں بیچ پر پہنچ جاتا ہے۔"

وہ ایک سخت سیاہ فام عورت تھی جس کا چہرہ سخت اور وماندہ اور آواز جارحانہ تھی۔ کبھی اُسے لوئس سے محبت رہی تھی؛ شاید اب بھی ہو۔ تاہم اُس کی آنکھوں میں مخلصانہ گرم جوشی تھی۔

"شام پڑے یہاں کھلے میں ڈنر تیار کرنے میں بڑا مزہ آئے گا،" وہ بولی۔ "بس خشک لکڑیوں

Scanned with CamScanner

سے آنے پڑے ہیں، بس کچھ لکڑیاں اٹھا کر لانے کی دیر ہے۔"

"میں تمہارے لیے چھوٹی سی کلہاڑی خرید لاؤں گا،" لوئس نے زندہ دلی سے کہا۔ "جب بھی بدتمیزی کرو گی، سزا میں لکڑیاں کاٹنی پڑیں گی۔" اس نے میرا بازو پکڑ کر کہا، "چلو، چل کر گھر دیکھو۔"

ایک بار پھر مجھے اس کے چہرے پر بے صبری کی مسرت آمیز گرمی نظر آئی؛ وہ کبھی مجھے بھی اس طرح دیکھا کرتا تھا، فخر سے تمتماتی مسکراہٹ کے ساتھ۔

"باقی فرنیچر کل پہنچے گا۔ بستر ہم اسی جگہ لگائیں گے؛ اور پیچھے کے کمرے میں لائبریری بنائیں گے۔"

کوئی بھی سمجھتا کہ ہم واقعی عاشق معشوق ہیں اور اپنا بسیرا تیار کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ جب ہم واپس باغ میں پہنچے تو مجھے ہر کسی کی آنکھوں میں نمایاں تجسس کا احساس ہوا۔ "تم گرمی کی چھٹیاں یہیں گزارو گی، اب تو یہ جگہ بھی رکھ رہی ہو؟" ورجینیا نے پوچھا۔

"ہاں، ہم رکھ رہے ہیں۔"

انھوں نے ہماری طرف ایسے دیکھا جیسے ہم ایک ہی ہوں، اور میں بار بار "لوئس اور میں" اور "ہم" استعمال کیے جا رہی تھی۔ "ہم ساری گرمیاں یہیں رہیں گے؛ نہیں، ہمارے پاس کار نہیں ہے؛ ہمیں امید ہے کہ تم خود اکثر ہم سے ملنے آ جایا کرو گے۔" لوئس بھی "ہم" ہی استعمال کر رہا تھا۔ وہ بڑے جوش سے بول رہا تھا۔ میری آمد سے لے کر اس وقت تک ہم دونوں میں زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی، اور آج پہلی بار میں اُسے اس قدر زندہ دل پا رہی تھی۔ زندہ دل ہونے کے لیے اب اُسے دوسروں کی موجودگی کی ضرورت تھی۔ یہ جگہ شکاگو کے مقابلے میں ٹھنڈی تھی، اور گھاس کی مہک سے میرا سر چکرانے لگا۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح اُس بوجھ کو اتار پھینکوں جو مجھے کچلے ڈال رہا تھا، اور خود کو زندہ دل محسوس کرنے لگوں۔

"این، کشتی پر سیر کے لیے چلو گی؟" لوئس نے مجھ سے پوچھا۔

"اوہ، بالکل!" میں نے کہا۔

جب ہم چھوٹے سے ریتیلے جزیرے سے گزر رہے تھے تو جھٹ پٹے میں جگنو ٹمٹما رہے تھے۔ میں کشتی میں بیٹھ گئی اور لوئس نے اُسے دھکیل کر کنارے سے دور کر دیا؛ چپ دار آبی گھاس چپوؤں کے گرد لپٹ گئی۔ تالاب پر، ٹیلوں پر رات کا لطف بالکل ویسا ہی تھا جیسا مضافات میں ہوتا ہے؛ لیکن پل کے اوپر آسمان سرخ اور اُودا تھا، ایک شکستہ، بڑے شہر کا آسمان، کارخانوں کی بھٹیوں کی آگ سے جھلسا ہوا۔

"یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ یہ دریائے مسی سپی کے اوپر پھیلا ہوا آسمان ہے،" میں نے کہا۔

"ہاں، اور چند دن کی بات ہے، چاند بھی پورا ہو جائے گا۔"

ٹیلوں کے برابر آگ جل رہی تھی اور اس میں سے لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں جہاں تہاں کوئی کوئی روشن کھڑکی نظر آ رہی تھی؛ ان میں سے ایک کھڑکی ہماری بھی رہی ہوگی۔ رات کے وقت فاصلے میں روشن تمام کھڑکیوں کی طرح یہ بھی مسرت کا سندیسہ لا رہی تھیں۔

"ڈورو تھی بڑی اچھی ہے،" میں نے کہا۔

"ہاں،' لوئس نے کہا۔ "بے چاری ڈورو تھی۔ پار کر کے ایک ڈرگ اسٹور میں ملازم ہے۔ کچھ نان نفقہ سابقہ شوہر سے بھی مل جاتا ہے۔ دو بچے، ساری زندگی یہیں گزری، اور اپنا ذاتی گھر تک نہیں۔ گزر اوقات بڑی مشکل سے ہوتی ہے۔'

ہم غیروں کے بارے میں بڑی اُنسیت کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ سیاہ پڑتے ہوئے پانی نے ہمیں عالم سے جدا کر دیا تھا۔ لوئس کی آواز مہربان تھی اور مسکراہٹ اُس ساتھی کی سی جو شریکِ جرم رہا ہو۔ اچانک میں نے خود سے پوچھا، "کیا واقعی سب کچھ ختم ہو چکا ہے؟' میں نے اپنے کو بہت جلد، مایوسی کے سپرد کر دیا تھا، فخر کے مارے، تاکہ ان عورتوں سے بالاتر نظر آؤں جو خود کو فریب میں مبتلا رکھتی ہیں؛ اور احتیاط کی خاطر، تاکہ خود کو شک و شبے، انتظار اور مایوسی کی اذیت سے محفوظ رکھ سکوں۔ شاید میں نے کچھ زیادہ ہی جلد بازی سے کام لیا۔ لوئس کی بے پروائی، حد سے بڑھی ہوئی صاف بیانی، یہ سب قدرتی نہیں ہے؛ حقیقت میں وہ نہ لاابالی ہے اور نہ بے رحم۔ وہ کبھی بھی اتنی ناشائستگی کے ساتھ سرد مہری کا مظاہرہ نہیں کرے گا سوائے اس کے کہ اس نے بڑے غور و فکر کے بعد اس کا فیصلہ کیا ہو۔ اس نے مجھ سے محبت ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، درست! لیکن فیصلہ کرنا اور فیصلے پر عمل کرنا دو مختلف باتیں ہیں۔

'ہمیں اپنی چھوٹی سی کشتی کا نام رکھنا ہے،' لوئس نے کہا۔ 'اگر این رکھیں تو تمہیں اعتراض تو نہیں ہوگا۔"

"میں بڑا فخر محسوس کروں گی!"

اب وہ مجھے بالکل اُنہیں نظروں سے دیکھ رہا تھا جن سے پہلے دیکھا کرتا تھا، اور اس عاشقانہ سیر کی تجویز بھی اُسی نے پیش کی تھی۔ شاید وہ اپنی بناوٹی احتیاط سے تنگ آ گیا تھا؛ مجھے اپنے دل سے دور رکھنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ ہم باغ میں لوٹ آئے، اور جلد ہی ہمارے مہمان رخصت ہو گئے۔ لائبریری میں عارضی طور پر لگائے گئے تنگ سے بستر پر ہم پہلو بہ پہلو لیٹ گئے۔ لوئس نے بتی بجھا دی۔

'کیا خیال ہے، تمہیں یہ جگہ پسند آئے گی؟" اس نے پوچھا۔

Scanned with CamScanner

"بالکل یقین ہے کہ پسند آئے گی۔"

میں نے اس کے ننگے شانے سے اپنا رخسار لگا دیا؛ وہ دھیرے دھیرے میرا بازو تھپتھپا رہا تھا اور میں مضبوطی کے ساتھ اس کے جسم سے چمٹ گئی۔ میرے بازو پر اُسی کا ہاتھ تھا، یہ آنچ اُسی کے جسم سے آ رہی تھی، یہ اُسی کی مہک تھی، اور پیدار ہو یا احتیاط، دونوں میرے اختیار سے جاتے رہے تھے۔ میں نے اس کے ہونٹ پھر ڈھونڈ نکالے، اور جوں ہی میرا ہاتھ رینگتا ہوا اس کے گرم گرم پیٹ پر پہنچا میرا جسم خواہش سے جل اٹھا۔ وہ خود بھی میری خواہش مند تھا، اور خواہش ہی ہم دونوں کے درمیان، دراصل، محبت تھی۔ مجھے اس کا مکمل یقین تھا۔ اور یہ سب اتنی تیزی سے پیش آیا کہ میں چکرا کر رہ گئی۔

پہلے میں ہی بولی۔ "شب بخیر!"

"شب بخیر،" لوئس نے دیوار کی طرف رخ پھیرتے ہوئے کہا۔

غصے کے مارے میرا گلا رُندھ گیا۔ "اُسے اس برتاؤ کا کوئی حق نہیں پہنچتا،" میں بڑبڑائی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنی موجودگی سے سیراب نہیں کیا؛ وہ مجھ سے اس طرح پیش آیا جیسے میں کوئی لذت پہنچانے والی مشین ہوں۔ اگر اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی تب بھی ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں بستر سے نکل آئی؛ مجھے اس کے جسم کی حرارت سے نفرت محسوس ہوئی۔ میں لِونگ روم میں پہنچی، اور بیٹھ کر بُری طرح رونے لگی۔ یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر تھا۔ ہمارے جسم، جو کتنے کمال کے ساتھ ایک دوسرے سے ہم کنار تھے، ایک دوسرے سے یوں مکمل طور پر بے گانہ ہو جائیں گے، یہ کیسے ممکن تھا؟ اس نے کہا تھا: 'میں بہت خوش ہوں، مجھے خود پر اتنا فخر محسوس ہو رہا ہے۔' اس نے کہا تھا: 'این!' اس نے مجھے اپنا دل دے دیا تھا۔ اپنے ہاتھوں، اپنے ہونٹوں، اپنے پورے جسم کے ساتھ۔ لیکن یہ گزرے وقت کی بات تھی۔ وہ ساری راتیں جن کی یاد اب تک میرے اندر سلگ رہی تھی—— میکسیکن کمبل کے نیچے، اپنی بر تھ میں جس کو دریائے مسس سپی کی لہریں جھلا رہی تھیں، مچھرانی کے اندر، آگ کے سامنے جس میں سے لکڑی کے چیپ کی سوندھی سوندھی مہک آ رہی تھی —— وہ ساری راتیں۔ کیا وہ اب دوبارہ کبھی زندہ نہ ہو سکیں گی؟

جب میں، نڈھال، بستر پر واپس آئی تو لوئس نے خود کو کہنی کے بل اٹھایا۔ جھلاہٹ سے پوچھا، 'کیا پوری گرمیوں یہی پروگرام رہے گا؟ پُرلطف دن گزار کر پوری رات آنسو بہاؤ؟"

"اوہ! اتنا بڑا پن مت دکھاؤ!" میں نے آگ بگولا ہو کر کہا۔ میں یوں رو رہی تھی کہ غصے میں تھی۔ اتنی سرد مہر لستری، یہ—— یہ بڑی ہولناک بات ہے! تمہیں ایسا نہیں——

"میں تمہیں وہ حرارت نہیں دے سکتا جو اب مجھے خود بھی محسوس نہیں ہوتی،" لوئس نے

Scanned with CamScanner

کہا۔

"ایسا ہے تو تمھیں میرے ساتھ نہیں سونا چاہیے تھا۔"

"تمھیں اس کی اتنی بُری طرح خواہش جو ہو رہی تھی،" وہ سکون سے بولا۔ "مجھ سے انکار کرتے نہ بنتا۔"

"انکار کر دینا بہتر ہوتا۔ ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ اب کبھی ساتھ نہیں سوئیں گے۔"

"ہاں، تمھارے رات بھر کے رونے دھونے سے تو یہی بہتر ہو گا۔ خیر، اب تھوڑا بہت سونے کی کوشش کرو۔"

اس کی آواز میں عداوت نہیں، بس سرد مہری تھی۔ اس کے سکون نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا۔ میں پشت کے بل لیٹی خالی خالی نظروں سے چھت کو تکنے لگی؛ دور، جھیل کی موجیں کنارے پر کسی اَن کی طرح تھپیڑے مار رہی تھیں۔ کیا لوئس سچ بول رہا تھا؟ کیا قصوروار میں ہی تھی؟ ہاں، اس میں کیا شک تھا کہ میں قصوروار تھی ــ گڑگڑا کر اس سے پیار کی التجا کرنے کی اتنی نہیں جتنی جھوٹی امیدوں سے خود کو فریب دینے کی۔ اس میں کلام نہیں کہ خود لوئس کا ضمیر بھی سو فیصدی صاف نہیں تھا، جس سے اس کی متلوّن مزاجی کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس جیسے آدمی کے لیے محبت سے انکار اور محبت کے نہ ہونے کے درمیان کم ہی فاصلہ ہوتا ہے۔ اس نے جان بوجھ کر مجھ سے محبت ترک کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی۔ اس میں کیا شک ہے کہ ماضی مر چکا تھا ــ ایک ایسی موت جو پیچھے اپنا لاشہ بھی نہیں چھوڑ گئی تھی، ٹھیک دیاگو کی موت کی طرح۔ اسی لیے تو اس پر اعتبار کرنے میں اتنی مشکل پیش آ رہی تھی۔ اگر مجھے رونے کے لیے کوئی لوحِ مزار مل جاتی تو یقیناً اس سے میری مشکل آسان ہو جاتی۔

"اس بار تمھارے قیام کی شروعات ہی غلط ہو رہی ہے،" اگلی صبح لوئس نے مجھ سے کہا۔

"بالکل نہیں،" میں نے کہا۔ "کوئی ایسی تشویش ناک بات نہیں ہوئی ہے۔ اس نئی صورتِ حال سے ذرا مانوس ہو جانے دو، پھر دیکھنا، سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میں خود یہی چاہتا ہوں،" لوئس نے کہا۔ "مجھے لگتا ہے جیسے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش گوار وقت گزار سکتے ہیں۔ تم اگر رو نہ رہی ہو تو میری تم سے خوب بنتی ہے۔"

اس کی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں۔ اس کی رجائیت میں ریاکاری کی خاصی مقدار تھی، اور وہ معاملے میں میرے جذبات کو کم سے کم خاطر میں لا رہا تھا۔ تاہم اُس کے اضطراب میں کوئی کھوٹ نہیں تھی؛ مجھے دکھ پہنچاتے ہوئے اسے واقعی بڑی تکلیف ہو رہی تھی۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ ہماری گرمیاں ایک دوسرے کے ساتھ بہت اچھی گزریں گی،" میں نے کہا۔

وہ گرمیاں بڑی دلکش لگ رہی تھیں۔ ہم روز صبح کو آبی گھاس سے پٹے تالاب کو کشتی کے پار کرتے، پھر اُن ٹیلوں پر جا چڑھتے جو ہمیشہ میرے تلوے جلا کر رکھ دیتے۔ دائیں طرف سنسان بیچ لامتناہیت تک پھیلا ہوا تھا؛ اور بائیں طرف دھات پگھلانے کی شعلے اگلتی جھاڑیوں کے دامن میں جا کر ختم ہو جاتا تھا۔ ہم تیرتے؛ اور اپنے جسموں کو سفید چڑیوں کے ایک غول کا نظارہ کرتے ہوئے (جو اپنی پایانے جیسی ٹانگوں پر کھڑی، ریت پر ادھر اُدھر ٹھونگیں مار رہی ہوتیں) تمازتِ آفتاب سے سنولاتے۔ اور پھر امریکی انڈینز کی طرح خشک ایندھنی لکڑیوں سے لدے پھندے گھر لوٹتے۔ میں بھوری رنگت کی گلہریوں، نیل کنٹھوں، تتلیوں اور سرخ سینوں والی بڑی بڑی کشمشی چڑیوں کی سنگت میں لان پر بیٹھی گھنٹوں مطالعہ کیا کرتی۔ فاصلے میں مجھے لوئس کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی رہتی۔ شام کو ہم باربی کیو کے گڑھے میں آگ جلاتے، میں برف کا ٹکڑا پگھلاتی جس میں مرغ کے گوشت کے پارچے حنوط کیے ہوئے ہوتے؛ یا لوئس گائے کے گوشت کا ایک ستھرایا ہوا پارچہ گویا آرے سے تراشتا، اور نم پتیوں میں لپٹے مکئی کے بھٹے بھوبل میں بھونتا۔ ہم، پہلو بہ پہلو، ریکارڈ سنتے یا ٹیلی ویژن پر کوئی پرانی فلم یا باکسنگ کا کوئی میچ دیکھتے۔ ہماری مسرت کا یہ بہروپ اتنا ماہرانہ تھا کہ مجھے اکثر لگتا کہ کسی بھی لمحے یہ حقیقت میں بدل جائے گا۔

ڈوروتھی اس دام میں خوب آ گئی؛ اس سے مسحور ہو کر رہ گئی۔ اکثر شام کے وقت وہ اپنی سرخ سائیکل پر سوار ہماری طرف آ نکلتی، بکتے ہیمبرگروں کی مہک سونگھتی اور جلتی ہوئی خشک ٹہنیوں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں میں خوب لمبے لمبے سانس لیتی۔ "کتنی شاندار رات ہے! تمہیں جگنو دکھائی دے رہے ہیں؟ اور ستارے؟ اور وہ ٹیلوں پر جلتے ہوئے الاؤ؟" وہ بڑے حرص، بڑی آرزومندی کے ساتھ اُس زندگی کی تصویر کشی کرتی جو کبھی اُس کے حصے میں نہیں آنے والی تھی، اور جو، سچ تو یہ ہے، خود میرے حصے میں بھی نہیں آئی تھی۔ وہ مجھے ستائش، پند و نصیحت اور عقیدت مندی سے مغلوب کر لیتی۔ یہ وہی تھی جس نے گھر کو ساز و سامان سے آراستہ کیا تھا؛ وہی سارا سودا سلف خرید کر لاتی اور اس کے علاوہ بھی ہزاروں غیر ضروری نوازشوں سے ہمیں نوازتی رہتی۔ وہ جب بھی آتی، ہمیشہ کوئی حیرت انگیز پیغام یا خبر ساتھ لاتی: کسی نئے پکوان کی ترکیب، کوئی نئی قسم کا سوپ، کپڑے دھونے کی مشین کے کسی تازہ ماڈل کی مدح میں کوئی دستی اشتہار، کسی نئی سنسنی خیز کتاب پر تبصراتی مضمون۔ وہ ہفتوں ایسے ایجاد شدہ ریفریجریٹر کے ہونے کے خواب دیکھنے میں گزار سکتی تھی جس میں، اگر پیرل بھر آئس کریم رکھی جائے تو وہ بالکل تازہ رہے۔ کہنے کو اس کے سر پر اپنی چھت تک نہیں تھی، مگر فنِ تعمیر سے متعلق ایک ضخیم سا رسالہ اپنے نام منگوا رکھا تھا جس میں کروڑپتیوں کے دہقانی محلوں کا بڑے لطف و سرور کے ساتھ نظارہ کیا کرتی۔ میں بہت صبر و تحمل سے اس کے بے سروپا منصوبوں اور جوشیلی چیخوں کو سنتی۔ یہ ایک

Scanned with CamScanner

بدحواس عورت کی بک بک تھی جس کے پاس امید کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ لوئس اُس پر اکثر برہم ہو جاتا تھا۔ "میرا اس کے ساتھ کبھی گزارا نہیں ہو سکتا تھا!" اس نے مجھ سے کہا۔ نہیں، وہ ڈوروتھی سے کبھی شادی نہیں کر سکتا تھا، اور میں اُس سے شادی نہیں کر سکی تھی، اور اب اُسے مجھ سے محبت نہیں رہی تھی۔ وہ باغ، وہ گھر، ایک ایسی خوشی کا ضامن تھا جو ہم میں سے کسی کی تقدیر میں نہیں لکھی تھی۔

ظاہر ہے یہ ڈوروتھی ہی تھی جو ایک اتوار کو ہمیں پارک میں لگنے والے میلے میں گھسیٹ لائی۔ وہ اجتماعی سیروں کی دلدادہ تھی۔ برٹ اپنی کار میں ہمیں لینے آیا، اور ڈوروتھی اپنے چھکڑے میں ورجینیا، ولی اور ایولن کو لادلائی۔ لوئس کو لگا کہ وہ انکار نہیں کر سکے گا، مگر وہ اس مہم کے سلسلے میں پُرجوش نظر نہیں آرہا تھا۔ رہی میں، تو ساری دوپہر رنگ رلیوں میں گزارنے اور اس کے بعد ورجینیا کے ہاں رات کا کھانا کھانے کے امکان ہی سے مجھ پر نزع کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ جب بھی میں دیر تک لوگوں کی متجسس نظروں کا ہدف بنی رہتی، مجھے مستقل یہ دھڑکا لگا رہتا کہ آسودہ عورت کا جو یہ سوانگ میں نے رچا رکھا ہے، اُسے آخر تک ٹھیک سے نبھا بھی سکوں گی۔

"خدایا، کس قیامت کی بھیڑ ہے! کتنی دھول اڑ رہی ہے!" لوئس نے اَمیوزمنٹ پارک میں داخل ہوتے ہی شکایت کی۔

"یہ کیا غرانے لگے،" ڈوروتھی نے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی، "یہ بیزار رہنے کا فیصلہ کر لے تو لگتا ہے سورج کو بھی بجھا کر رکھ دے گا!"

جب وہ ایک اسٹینڈ کی طرف لپک کر پہنچی اور غباروں پر تیر اندازی کرنے لگی تو اس کا چہرہ خفیف سی باولی امید سے گلنار ہو رہا تھا۔ ہر اسٹینڈ پر وہ کسی غیر معمولی انکشاف کے ہونے کی متوقع نظر آتی تھی۔ رہی میں، تو میں نے صرف مسکراتے رہنے ہی پر دھیان دیا۔ جس قدر بھی تجسس مجھ سے جمع ہو سکا، میں نے اس کے ساتھ سدھائے ہوئے بندروں، عریاں ناچنے والوں، ریچھ نما آدمی اور آدمی عورت کے تماشے دیکھے۔ میں ایسے کھیلوں کو ترجیح دیتی تھی جو مجھ سے مکمل جسمانی توجہ کا مطالبہ کرتے ہوں؛ چناں چہ میں نے نہایت جوش و خروش کے ساتھ بولنگ پنوں اور ٹین کے ڈبوں کو نشانہ بنا کر گرایا، متحرک فرش پر بالشتی موٹروں کو دوڑایا، اور رنگ روغنی آسمانوں میں ہوائی جہاز اڑائے۔

لوئس مجھے بڑے تمسخر سے دیکھتا رہا۔ "یقین نہیں آتا کہ تم بعض چیزوں کے معاملے میں اتنی سنجیدگی بھی برت سکتی ہو!" اس نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے جیسے اپنی جان داؤ پر لگا کر کھیل رہی ہو!"

کیا مجھے چاہیے تھا کہ اُس کی مسکراہٹ میں کوئی مخفی معنی تلاش کرتی؟ کیا اُس کے خیال میں

Scanned with CamScanner

میں نے محبت کے معاملے میں بھی اتنی ہی لاحاصل سنجیدگی، اتنی ہی جھوٹی گرم جوشی سے کام لیا تھا؟ ڈوروتھی نے طنزیہ انداز سے ترکی بہ ترکی جواب دیا، "ہر وقت منہ بسورنے سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔" اس نے مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ جب ہم ایک فوٹوگرافر کے سٹینڈ کے سامنے سے گزرے تو اس نے اپنے کھردرے ہاتھوں سے میرے ریشمی فراک کی سلوٹیں نکالیں۔ "ہاں، لوئس کے ساتھ تصویر ضرور اترواؤ! تمھارا فراک بڑا دلکش ہے اور بالوں کی یہ وضع بھی تم پر خوب جچتی ہے۔"

"ہاں ہاں، ضرور!" ورجینیا نے لقمہ دیا۔ "بڑی خواہش ہے کہ ہمارے پاس تمھاری کوئی تصویر ہو۔"

میں گومگو میں پڑ گئی۔ لوئس نے مجھے بازو سے پکڑا اور زندہ دلی سے بولا، "آؤ چلو، چل کر خود کو جاوداں کر لو۔ تم اس قدر پرکشش لگ رہی ہو۔"

"اور ول کو،" میں نے افسردگی سے سوچا، "اسے نہیں، دوبارہ کبھی نہیں۔" میں ایک رنگ روشن ہوئی بہار میں اس کے برابر بیٹھ گئی اور خود کو مسکرانے پر مجبور کرنے میں خاصی دقت محسوس کی۔ اس نے میرے بالوں پر کوئی توجہ نہیں دی؛ اس کی دانست میں اب میرا جسم نہیں رہا تھا، اور چہرہ بمشکل ہی باقی تھا۔ کاش میں اتنا ہی محسوس کر سکتی کہ کسی شدید اکھاڑ پچھاڑ نے میری صورت مسخ کر کے رکھ دی ہے۔ لیکن میں وہی میں تھی جس سے اسے پہلے محبت رہی تھی لیکن اب نہیں تھی: ڈوروتھی کا خروش اس کا شاہد تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس نے میرا سارا توازن درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ میں ذرہ ذرہ منتشر ہو رہی تھی، ٹکڑے ٹکڑے ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس حالت میں مجھے خود کو استوار رکھنا تھا اور رات دیر گئے تک مسکراتے رہنا تھا۔

"لوئس، تم پول کے ساتھ رہو،" ڈوروتھی نے کہا۔ "دھوپ سے اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ وہ ذرا سائے میں سستانا چاہتی ہے۔ جب وہ ٹوائلٹ سے لوٹے تو اسے کوئی مشروب دلا دینا، ہم اتنی دیر میں دوسری چیزیں دیکھ آتی ہیں۔"

"کیوں نہیں؟ رہنے دیں!" لوئس نے جواب دیا۔

"لیکن اسے اپنی دیکھ ریکھ کے لیے ایک مرد کی ضرورت ہے۔ ہرٹ سے وہ واقف نہیں، اور ول کو برداشت نہیں کر سکتی۔"

"ورجینیا پول کو برداشت نہیں کر سکتا،" لوئس نے کہا۔

"بچی تھک گئی ہے، میں اسے شہر لے جاتی ہوں،" ڈوروتھی غصے میں آ کر بولی۔ "میں نے تمھارے لیے بڑی خدمات پیش کیں لیکن" ورجینیا نے احتجاج کیا۔ "نہیں ماں، تم نہیں۔ تم ہو آؤ۔ اب چل دو۔ واپسی پر مجھے سب کچھ بتا دینا۔"

جیسے ہی ہم وہاں سے ہٹے، میں نے لوئس سے پوچھا، "تم ڈورو تھی کے ساتھ اچھی طرح کیوں پیش نہیں آتے؟"

"ایولن کو اُسی نے دعوت دی تھی۔ کس نے کہا تھا کہ بلائے؟"

میں نے درگزر کیا اور قاتلوں کے گیان دھیان میں غرق ہو گئی جو ارتکاب جرم کے عمل میں اپنے مقتولوں کے اوپر منجمد کھڑے تھے اور مقتولین اپنی موت کے لمحے میں منجمد۔ پیرو کی ایک پچ سالہ عورت ہسپتال میں اپنے بستر پر ایک نومولود بچے کو گود میں لیے بیٹھی تھی، گیرنگ (Goering) جاں کنی کے عالم میں اسٹریچر پر دراز تھا اور جرمن وردی میں ملبوس جسم سولی سے لٹکے جھول رہے تھے۔ ایک خاردار باڑھ کے پیچھے سوکھی لاشیں ایک مردہ انبار میں تلے اوپر پڑی تھیں۔ میں دم بہ خود ان کی طرف دیکھتی رہی۔ داخاؤ (Dachao) اور بُوکن والڈ (Buchenwald) تھے جو تاریخ کی دھندلی گہرائیوں میں بتدریج سمٹتے جا رہے تھے، اتنے ہی دور افتادہ جتنے گریوں میوزیم میں شیروں کے سامنے پھینکے جانے والے عیسائی۔ جب میں نے خود کو باہر سورج کی چُندھیا دینے والی روشنی میں پایا تو پورے کا پورا یوروپ خلا کی باہری انتہاؤں میں کہیں روپوش ہو چکا تھا۔ میں نے ننگے شانوں والی عورتوں کو اور تمتماتے رنگوں کی اسپورٹس شرٹس پہنے مردوں کو ہاٹ ڈاگ کھاتے یا آئس کریم کون چاٹتے ہوئے دیکھا۔ کوئی بھی تو میری زبان نہیں بول رہا تھا، اور میں خود اسے بھول چکی تھی۔ میں اپنی تمام یادیں گُم کر بیٹھی تھی، حتیٰ کہ اپنے چہرے کی یاد بھی: لوئس کے گھر میں کوئی آئینہ ایسا نہیں تھا جس میں آنکھ کی سطح تک اپنے سراپے کو دیکھ سکتی، اور میک اَپ بھی ایک دستی آئینے میں ٹٹول ٹٹول کر کرنا پڑتا تھا۔ مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ کون ہوں، اور حیرت سے سوچتی کہ کیا پیرس اب بھی اپنی جگہ موجود ہو گا۔

میں نے ڈورو تھی کو غصے میں کہتے ہوئے سنا، "بس تم نے خود ہی خود فیصلہ کر لیا کہ اب واپس چلنا چاہیے، اور اِن سے پوچھا تک نہیں کہ اس کا کیا خیال ہے۔ سنا ہے سات بجے پرانی خاموش فلمیں دکھائی جائیں گی؛ اور کوئی مجھ سے ایک بڑے زبردست جادوگر کا بھی تذکرہ کر رہا تھا۔۔۔"

اُس کی آواز میں تیکھا پن تھا، تاہم ہم سب کے اردگرد سارے چہرے سختی سے جمے رہے۔

"ارے بس، چلو گھر چلیں!" ولی نے کہا۔ "مارٹینی کے جام وہاں ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ پھر سب کو بھوک بھی لگ رہی ہے۔"

"مرد کتنے خود غرض ہوتے ہیں،" وہ بڑبڑائی۔

میں اس کی پرانی کار میں اس کے اور ولی کے درمیان بیٹھ گئی؛ وہ اتنی دل شکستہ محسوس کر رہی تھی کہ سارا راستا ایک لفظ تک نہ بولی۔ جوں ہی ہم کار سے اترے، اس نے میرا بازو پکڑ کر

Scanned with CamScanner

بڑے اصطرار سے کہا، "تم ہمیشہ کے لیے یہیں کیوں نہیں رہ جاتیں؟ تمہیں ضرور رہ جانا چاہیے۔"

"ممکن نہیں۔"

"کیوں نہیں؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

"بس نہیں۔"

"تو کم از کم واپس تو آؤ گی، آؤ گی نا؟ بہار میں آنا؛ یہاں کا خوشگوار ترین موسم ہوتا ہے۔"

"کوشش کروں گی۔"

مجھ سے اس طرح بات کرنے کا اسے کیا حق پہنچتا ہے؟ گھر میں داخل ہوتے ہی میں نے بڑی سے ساتھ خود سے پوچھا۔ اس خالی خولی ہمدردی کی کیا ضرورت تھی؟ خاص طور پر جب کہ خود لوئس نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا: "واپس آؤ گی نا؟" ولی نے مارٹینی کا گلاس پیش کیا تو میں نے بڑے اشتیاق سے لے لیا۔ میرے اعصاب بُری طرح دُکھ رہے تھے۔ میں نے بڑی تکلیف کے ساتھ میز پر نظر ڈالی جو سینڈوچز پر لگائے جانے والے اسپریڈ، سلادوں اور کیکوں سے اَٹی پڑی تھی۔ یعنی یہاں دیر تک رکنا پڑے گا۔ ڈورو تھی بھی غائب ہو چکی تھی؛ بعد میں جب لوٹی تو پاؤڈر تھوپ رکھا تھا اور ایک لمبے، پھول دار، فرسودہ گاؤن میں گویا غرق تھی۔ ہمارے چند منٹ بعد برٹ، ورجینیا، ایولن اور لوئس بھی ہنستے ہنستے آ پہنچے۔ وہ سب ایک ساتھ باتیں کر رہے تھے، اور میں نے ان کی گفتگو پر دھیان دینے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے لوئس کی طرف دیکھا جس کی بشاشت لوٹ آئی تھی، اور سوچا، "ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہونے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہو گا؟" اس سے پہلے میں نے بالکل اسی طرح شیڈمی کے رخصت ہونے کا انتظار کیا تھا، ماریا کے رخصت ہونے کا انتظار کیا تھا۔ لیکن اب، میری بے صبری نری حماقت ہی تھی، دوسروں سے دور ہو کر لوئس مجھ سے قریب نہیں ہونے والا تھا۔ برٹ نے سینڈوچز کی ایک پلیٹ میرے گھٹنوں پر ٹکا دی؛ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا، اور میں نے اسے یہ پوچھتے ہوئے سنا، "۲۴ اگست ۱۹۴۴ کے دن تم پیرس ہی میں تھیں؟"

"جنگ کا پورا زمانہ ہی این نے پیرس میں گزارا تھا،" لوئس نے ایک قسم کے فخر کے ساتھ کہا۔

"کیا زبردست دن تھا!" برٹ نے کہا۔ "ہم تو یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ جب داخل ہوں گے تو پورا شہر ویران ملے گا۔۔۔ مگر دیکھا تو تمازتِ آفتاب سے سنولائی ہوئی ننگی ٹانگوں والی عورتیں چمکتے رنگوں کے پھول دار کپڑے پہنے ہر طرف پھر رہی تھیں! یہ اُن فرانسیسی عورتوں سے کتنی مختلف تھیں جن کا ہم یہاں بیٹھے تصور کر رہے تھے!"

"ہاں،" میں نے کہا، "تمہارے ماہرینِ فنِ بمباری اچھی صحت سے دھوکا کھا گئے۔"

Scanned with CamScanner

صرف چند گاودی ہی!" برٹ نے کہا۔ "یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی تھی کہ بوڑھے اور بیمار باہر سڑکوں پر نہیں تھے، اور نہ ملک بدر اور فوت شدہ لوگ۔" اُس کے بڑے سے چہرے پر یک خوابی کیفیت چھا گئی۔ "خیر کچھ بھی سہی، وہ بڑا غیر معمولی دن تھا۔

"جب میں وہاں پہنچا،" ولی نے تاسف سے کہا، "تو کایا ہی پلٹ چکی تھی: کوئی ہمیں ذرا بھی پسند کرنے کو تیار نہیں تھا۔"

"ہاں، اپنے سے نفرت کروانے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی،" برٹ نے کہا۔ "ہم بالکل جانوروں کی طرح پیش آئے۔"

"قدرتی بات ہے،" لوئس نے کہا۔

"اس سے باز رہا جا سکتا تھا۔ بس ذرا سے نظم و ضبط کی ضرورت تھی---"

"تمہارے خیال میں کافی آدمیوں کو پھانسی نہیں چڑھا دیا گیا تھا؟" لوئس نے تاؤ میں آ کر کہا۔ "پہلے تم آدمیوں کو جنگ میں جھونک دیتے ہو اور پھر، بس زنا بالجبر کے ارتکاب کی دیر ہے، انہیں پھانسی پر چڑھا دیتے ہو!"

"مجھے تم سے اتفاق ہے،" برٹ نے کہا۔ "کچھ زیادہ ہی پھانسیاں لگیں۔ اور رونا بھی تو یہی ہے: ضروری اقدامات فوراً نہیں کیے گئے۔"

"کیا اقدامات؟" ولی نے پوچھا۔

"اگر یہ لوگ اپنی جنگ و جنگ کا قصہ لے بیٹھے تو ساری رات چلتا رہے گا!" ڈوروتھی نے کہا۔

دونوں جنگ بازوں کے چہرے جوشِ حیات سے جگمگا رہے تھے: وہ بڑی روانی سے باتیں کر رہے تھے، اور دوران گفتگو میں مسلسل ایک دوسرے کی قطع کلامی بھی۔ فرانس کے لیے ان کی ہمدردی پر بالکل شک نہیں کیا جا سکتا تھا، وہ اپنے ملک کے بارے میں رتی بھر بھی آسودہ خاطر نہیں تھے: تاہم ان کی باتیں سنتے ہوئے مجھے بے طمینانی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جنگ جس کے بارے میں وہ گفتگو کر رہے تھے، اُن کی اپنی جنگ تھی، ایک ایسی جنگ جس میں ہماری حیثیت ایک حقیر سے دردانگیز عذر سے زیادہ نہ تھی۔ ہمارے سلسلے میں ان کے ضمیر کی رد و کد ایسی ہی تھی جیسی آدمی کسی کم زور عورت یا مشغل چانور کے لیے محسوس کرتا ہے۔ اور تو اور، وہ ابھی سے ہماری تاریخ سے موٹی داستانیں ڈھونے لگ گئے تھے۔

آخر کار جب وہ چپ ہوئے تو ایون نے نڈھال ہو کر مجھ سے پوچھا، "پیرس کا کیا حال چال ہے ان دنوں؟"

"ریلیوں سے اَٹا پڑا ہے،" میں نے جواب دیا۔

"تم اس بات سے کچھ خوش نہیں لگتیں،" لوئس نے کہا۔ "کتنی ناشکری قوم ہے! ہم

Scanned with CamScanner

انہیں حلق تک پاؤڈر ملک سے بھرے دے رہے ہیں، اُن کے ہاں کوکاکولا اور بکتر بند گاڑیوں کا سیلاب لے آئے کو ہیں -- ور یہ ہیں کہ ہمارے سامنے عاجزی سے گھٹنے ٹیکنے پر آمادہ نہیں ہوتے!" وہ ہنسنے لگا۔ "یونان، چین، فرانس؛ بس ہم امداد کیے چلے جا رہے ہیں، امداد کیے جا رہے ہیں۔ بالکل پاگل پن! ہم بوائے اسکاوٹ کی قوم ہیں!"

تو تم اسے تفریح کی بات سمجھتے ہو، ہے نا؟ ڈوروتھی نے جارحانہ انداز میں کہا۔ "حس مزاح کا ہونا بڑی بات ہے! اس نے اپنے شانے اچکائے۔ "جب ہم ساری دنیا پر ایٹم بم گرا چکے ہوں گے تو لوئس چند مریضانہ لطیفے سنا کر پھر سے ہمارا دل خوش کر دے گا۔'

لوئس نے خوش مزاجی سے میری طرف دیکھا۔ "کیا یہ کسی فرانسیسی کا مقولہ نہیں ہے کہ حالات پر رونے دھونے کے بجائے ان پر ہنسنا زیادہ اچھا ہے؟"

بات رونے دھونے یا ہنسنے ہنسانے کی نہیں، عمل کرنے کی ہے، ڈوروتھی نے کہا۔

لوئس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ میں والس کو ووٹ دیتا ہوں، اُس کی حمایت میں بحث کرتا ہوں۔ اب اس سے زیادہ کیا عمل کروانا چاہتی ہو؟'

حد ہو گئی ڈوروتھی!" دلی نے کہا۔ 'ایک بچی بائیں بازو کی جماعت پیدا کرنا لوئس کے بس کی بات نہیں، اور نہ ہم میں سے کسی اور کے بس کی۔"

تاہم،" میں نے کہا، 'اور بہت سے لوگ ہیں جو تمہارے جیسے خیالات رکھتے ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم سب کسی طرح متحد ہو جاؤ؟

"پہلی بات تو یہ کہ ہم جیسے لوگ بہت زیادہ نہیں؛ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں،" لوئس نے جواب دیا۔ "دوسرے یہ کہ ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔"

'اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تمہیں واقعی کچھ کرنے کے بجائے منہ دبا کر ہنسنا زیادہ اطمینان بخش لگتا ہے،" ڈوروتھی نے کہا۔

خود میں بھی بعض اوقات لوئس کے پُراطمینان خفی طنز کی عادت پر جھنجھلا جاتی تھی۔ وہ شفاف ذہن کا مالک تھا، تنقید کی صلاحیت رکھتا تھا؛ حتیٰ کہ اکثر اوقات طیش میں بھی آ جاتا تھا۔ لیکن امریکا کی جن کوتاہیوں اور نقائص پر معترض تھا، اُن سے اس کا رشتہ اتنا ہی قریبی تھا جتنا کسی مریض کا اپنی بیماری سے یا آوارہ گرد کا اپنی غلاظت سے ہوتا ہے۔ اور یہ بات میرے نزدیک اُس کو مبہم طور پر ان خرابیوں میں شریک سمجھنے کے لیے کافی تھی۔ معاً مجھے یاد آیا کہ اُس نے مجھے اس کے ملک کو نہ اپنانے کا قصوروار ٹھہرایا تھا، ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تو کہا تھا کہ وہ خود کبھی میرے ملک میں مستقل قیام اختیار نہیں کر سکتا۔ اسے گھمنڈ نہیں تو اور کیا کہیں گے! "میں کسی قیمت پر امریکی نہیں بنوں گی!' میں نے اپنے سے احتجاجاً کہا۔ وہ بیٹھے ایک دوسرے سے ٹوٹو میں میں کرتے

Scanned with CamScanner

رہے، اور میں ظرافت سے یہ عقدہ سلجھاتی رہی کہ اتنے غصیلے، جنگ جُو، وطن پرست کو آخر میں اتنے برسوں سے کہاں چھپائے بیٹھی تھی۔

برٹ ہمیں اپنی کار میں گھر چھوڑ گیا، اور اندر داخل ہوتے ہی لوئس نے مجھے کمال نرمی سے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ "دن اچھا گزرا تمہارا؟"

میرے مزاج کا اتار چڑھاؤ کسی اور کی دلچسپی کی چیز نہیں تھا، اور اس پُرتپاک مسکراہٹ نے میرے جواب کا تعین کر دیا۔ "بہت اچھا،" میں نے کہا۔ "اور یہ ڈورو تھی کتنی جھگڑالو واقع ہوئی ہے!" میں نے اضافہ کیا۔

وہ ناخوش ہے، لوئس نے کہا۔ لمحے بھر کے لیے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا، "خوش تو ورجینیا بھی نہیں، نہ ولی اور نہ ایولن۔ ہم دونوں کافی خوش قسمت ہیں کہ اپنی تقدیر سے کم و بیش مطمئن ہیں۔"

"میں اپنی تقدیر سے اتنی مطمئن نہیں۔"

"بعض بعض موقعوں پر تمہارا مُوڈ ضرور بگڑ جاتا ہے، سب کی طرح، لیکن یہ کوئی مستقل مرض نہیں۔"

وہ اس قدر اعتماد سے یہ بات کہہ رہا تھا کہ مجھے جواب دیتے نہ بن پڑی۔

"یہ سب کم و بیش غلام ہیں،" اس نے بات جاری رکھی۔ "اپنے شوہروں، اپنی بیویوں، اپنے بچوں کے۔ یہ ان کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔"

"لیکن پارسال،" میں نے کہا، "تم خود مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ایک نہ ایک دن شادی کرنے کے خواہش مند ہو۔"

"کبھی کبھی اس کے بارے میں سوچتا ضرور ہوں۔" وہ ہنسنے لگا۔ "لیکن مجھے ایک گھر میں بیوی اور بچوں کے ساتھ قید کر دو، پھر دیکھو۔ مجھے ایک ہی خیال میں غلطاں پاؤ گی: فرار کیسے ہوا جائے!"

اس کی آواز کی زندہ دلی نے مجھے حوصلہ دیا۔ "لوئس، کیا خیال ہے تمہارا، اب ہم دوبارہ کبھی مل سکیں گے؟"

اس کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ "کیوں نہیں؟" اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دیا۔

"اس لیے کہ ہم ایک دوسرے سے اتنی دور جو رہتے ہیں۔"

"ہاں،" وہ بولا، "ہم واقعی ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر چل دیا اور غسل خانے میں غائب ہو گیا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا: جوں ہی میں اس تک رسائی کی کوشش کرتی، وہ رسی تڑا کر بھاگ نکلتا۔ یقیناً اسی ڈر سے کہ کہیں تم اس سے پیار کی گرمی یا

جھوٹی باتوں یا وعدوں کا مطالبہ نہ کر بیٹھوں جن کو مہیا کرنا اس کے بس میں نہ تھا۔ میں کپڑے اتارنے لگی۔ مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ وہ ہلکی پھلکی سی، رازونیاز کی بات دل شکستگی کا باعث ہو گی؛ لیکن یہ علم بھی کچھ کم دل شکستگی کا باعث نہ تھا۔ کم از کم میری قسمت میں تھوڑی سی کامیابی ضرور لکھی تھی: یہ کہ میرا جسم لوئس کے جسم سے اتنے حیرت انگیز طور پر ہم آہنگ تھا کہ مجھے اس کی سرد مہری کا مقابلہ کرنے میں ادنیٰ سی دشواری بھی نہیں پیش آئی۔ ہم اپنے اپنے بستروں میں جا سوئے، ہمارے درمیان ایک برفانی دراڑ حائل تھی، اور اب مجھے لفظ 'خواہش' کے معنی تک یاد نہیں رہے تھے۔

میری تمنا تھی کہ بالکل ایسی ہی ہم آہنگی کا عالم میرا دل بھی ہوتا۔ لوئس کا دعویٰ تھا کہ محبت کرنے کے لیے شدید ہیجان میں آنے کی ضرورت ہوتی ہے؛ میں اگر اپنے کو ہیجان میں آنے ہی نہ دوں تو؟ لوئس محوِ خواب تھا؛ میں نے اُس کے تنفس کو سنا جو ہمواری سے آ جا رہا تھا، اور پہلی بار اُسے اپنی نہیں بلکہ دوسروں کی نظر سے دیکھنے کی کوشش کی۔۔۔ مثلاً ڈوروتھی کی کینہ پرور نظر سے۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ خود غرض تھا۔ فیصلہ کیے بیٹھا تھا کہ کم سے کم زحمت میں پڑے، ہمارے معاشقے سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو، اور میرے محسوسات کی اُس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس نے کسی بات سے خبردار کیے بغیر مجھے شکاگو آنے دیا تھا؛ صرف اس لیے کہ مجھے اپنے پاس رکھنے میں اسے مسرت محسوس ہوتی تھی۔ اور جیسے ہی میں اُس کے رحم و کرم پر آ پڑی، فوراً یہ نوٹس دے دیا کہ اُسے اب مجھ سے محبت نہیں رہی۔ بس پر یہ خواہش مستزاد کہ یوں ظاہر کروں جیسے میں بھی اس سے لطف اندوز ہو رہی ہوں۔ سچ، اسے بس اپنے ہی سے سروکار تھا۔ میں پوچھتی ہوں، پچھتاووں، جذبات اور اذیت کے خلاف اتنے بہیمانہ طریقے پر اپنی مدافعت کرنے کی اسے آخر ضرورت کیا تھی؟ اس احتیاط و حذر میں بُخل کا بڑا ہاتھ تھا۔ اگلی صبح میں نے صورت حال کے سامنے خود کو بے حس بنانے کی کوشش کی۔ میں اسے کسی سوچ میں غرق، لان میں آبیاری کرتا دیکھتی رہی، اور اپنے سے بولی، 'یہ لکھوکھا مردوں میں سے بس ایک مرد ہی تو ہے۔ آخر میں کیوں اس ڈھٹائی سے اسے یکتائے روزگار سمجھنے پر مُصر ہوں؟' اتنے میں مجھے ڈاکیے کی گاڑی کے آنے کی آواز سنائی دی۔ ڈاکیے نے چھوٹی سی سرخ اطلاعی جھنڈی کو، جو سر اٹھائے کھڑی تھی، جھکایا اور ڈاک کے ساتھ لیٹر بکس میں ڈال دی۔ میں کنکروں کی روش پر چلتی ہوئی گئی۔ خط تو کوئی نہیں تھا، بہت کچھ اخبار رسالے آئے تھے۔ میں انہیں سرسری سا دیکھوں گی، اور پھر لائبریری سے کوئی کتاب نکال کر پڑھوں گی؛ میں تیرنے جاؤں گی، اور دوپہر کو ریکارڈ بجا کر سنوں گی۔ بہت سی خوش گوار چیزیں تھیں جو میں اپنے ذہن یا دل کو مزید اذیت پہنچائے بغیر کر سکتی تھی۔

'این!' لوئس نے زور سے آواز دی۔ 'یہاں آ کر دیکھو! میں نے دھنک پکڑی ہے۔' وہ

لان کو پانی دے رہا تھا اور پھوار میں دھنک ناچ رہی تھی۔ "جلدی سے آؤ!" میں وہ تعمیل طلب، دوستانہ آواز فوراً پہچان گئی، اور شادمانی سے دمکتا ہوا وہ چہرہ بھی۔۔۔ جو کسی اور چہرے کی طرح نہیں تھا۔ یہ لوئس تھا؛ عین مین وہی؛ کوئی اور نہیں۔ اسے مجھ سے چاہت نہیں رہی تھی، تاہم وہ وہی تھا۔ تو پھر کیوں میں اس کے بارے میں بدخیال کر رہی تھی؟ نہیں، میری جان اتنی آسانی سے نہیں چھوٹنے والی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اسے خوب جانتی تھی۔ خود مجھے بھی افسردگی سے نفرت تھی اور قربانی دیتے ہوئے کراہت محسوس ہوتی تھی: میری وجہ سے اذیت برداشت کرنے، ساتھ ہی ساتھ مجھے کھو بیٹھنے سے اس کا انکار۔۔۔ میں اسے سمجھ سکتی تھی؛ اور یہ بھی کہ وہ اپنی واردات قلب کو سمجھنے میں اتنا منہمک ہے کہ میرے دل پر جو بیت رہی ہے اس کو جاننے کے لیے اس کے پاس بہت زیادہ مہلت نہیں۔ اور تب میرا دھیان اس کی آواز کی طرف گیا جب اس دن اس نے میرا شانہ مضبوطی سے دبا کر کہا تھا، 'میرا بس چلے تو میں کل تم سے شادی کر لوں۔' ٹھیک اسی لمحے میں نے ہر قسم کے بغض و عداوت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ محبت کا تو یہ ہے کہ جب وہ قائم نہیں رہتی تو نہیں رہتی، آپ ارادہ کر کے اسے ختم نہیں کر سکتے۔

چناں چہ میں لوئس سے محبت کیے گئی؛ اس سے ذرا بھی تو تسلی نہیں ہوئی۔ اس کی آواز کے ایک مخصوص زیر و بم کو سننے کی دیر ہوتی اور یکایک اس کا پورا وجود پھر سے میری دسترس میں آ جاتا۔ اور پھر لمحے بھر بعد میں اسے دوبارہ کھو بیٹھتی۔ جب ہفتے کے آخر پر وہ ایک دن کے لیے شکاگو گیا تو مجھے کہ گونہ اطمینان محسوس ہوا۔ چوبیس گھنٹوں کی خلوت ایک خوش آئند وقفہ ثابت ہوگی!

میں بس اسٹاپ تک اسے چھوڑنے گئی اور آہستہ خرام ایک ایسی سڑک سے ہوتی ہوئی گھر لوٹی جس کے دورویہ باغیچے اور گرمیاں گزرنے کے کانچ تھے۔ میں کتابوں کا ایک ڈھیر لے کر لان میں جا بیٹھی۔ گرمی سخت تھی؛ یک پنا تمک سیں بل رہا تھا؛ جھیل ساکن تھی۔ میں نے پرس سے رابرٹ کا خط نکالا: اس نے مڈگاسکر والے مقدمے کے بارے میں تفصیل سے لکھا تھا۔ ہینری ایک مضمون لکھ رہا تھا جو 'ویجیلنس' کے اگلے شمارے میں نکلنے والا تھا، لیکن صرف یہی کافی نہ تھا؛ عوام کی رائے کو حرکت میں لانے کے لیے ہمیں کسی کثیر الاشاعت یومیہ یا ہفتہ وار اخبار کی ضرورت تھی۔ حتیٰ جلسہ کرنے کا بھی خیال تھا، لیکن وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے خط تہہ کیا اور واپس پرس میں رکھ لیا۔ میری آنکھیں اوپر اڑتے ہوئے ایک جہاز کا تعاقب کرنے لگیں؛ یہاں سے جہاز ہر وقت گزرا کرتے تھے، یہ مجھے بہ آسانی پیرس واپس لے جا سکتے تھے۔ لیکن اس سے کیا فائدہ ہوتا؟ اگر میں رابرٹ کے پاس ہوتی تو اس نے لکھنے کے بجائے مجھ سے بات کی ہوتی، لیکن اس سے اس کا کیا حل ہوتا؟ میں اس کے لیے کر ہی کیا سکتی تھی، پھر یہ کہ وہ مجھے واپس کب بلا رہا تھا: اس جگہ کو چھوڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ میں نے اپنے ارد گرد نظر ڈالی: لان کی خوب دیکھ بھال کی گئی

Scanned with CamScanner

تھی، آسمان چمکیلا تھا، گلہریاں اور چڑیاں پالتو جانداروں کی طرح لگ رہی تھیں؛ اور میرے یہاں ٹکے رہنے کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔ میں نے ایک کتاب نکالی: نیو انگلینڈ کا ادب۔ ایک سال پہلے مجھے اس سے گہری دل چسپی ہوتی، لیکن اب لوئس کے علاوہ، اس کے ماضی سے میرا سروکار جاتا رہا تھا؛ سبزے پر بکھری ہوئی وہ تمام کتابیں بالکل گونگی تھیں۔ میں پھیل کر لیٹ گئی۔ کیا کیا جائے؟ کرنے کے لیے کچھ بھی تو نہیں تھا۔ بڑی دیر تک میں وہیں بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ پھر یک لخت مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ میں پہلے سے اکثر کہتی آئی تھی کہ فالج زدگی، اندھا اور بہرا ہو جانے سے، اس صورت میں کہ ذہن پوری طرح فعال ہو، زیادہ الم ناک اور کوئی قسمت نہیں ہو سکتی۔ میری قسمت یہی تھی۔ آخر میں اٹھی اور گھر کے اندر چلی آئی۔ میں نے غسل کیا، بال دھوئے، لیکن میں اپنے جسم کی دیکھ ریکھ پر کسی بھی صورت زیادہ وقت صرف نہیں کر سکی تھی۔ میں نے ریفریجریٹر کھولا: ایک جگ ٹماٹر کے عرق سے بھرا ہوا، دوسرا موسمی کے عرق سے، مختلف قسم کے تیار شدہ سلاد، کولڈ کٹس، دودھ —— بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ کچن کی الماریوں میں مختلف ڈبا بند کھانے کی چیزیں، جادوئی سفوف، ایک ابال دینے کے منتظر چاول بھی موجود تھے۔ پانچ منٹ میں میں اپنے ڈنر سے فارغ ہو چکی تھی۔ وقت گزاری کا کوئی نہ کوئی حل تو ضرور ہو گا، لیکن میرے لیے یہ ہمیشہ سراسر اجنبی رہا تھا۔ سو اب کیا کیا جائے؟ چند ریکارڈ سنے، پھر ٹیلی ویژن چلا دیا۔ میں ایک کے بعد ایک چینل بدل کر اور اس طرح فلموں، کامیڈی شوز، مہم جوئی کی وارداتوں، خبری تبصروں، جاسوسی ڈراموں، اور بوجھو تو جانیں قسم کے پروگراموں کو گڈمڈ کر کے جی بہلاتی رہی۔ لیکن ایک لمحہ ایسا بھی آیا جب وہاں، ساری دنیا میں کچھ ہو گیا۔ جس جگہ کی ٹیلی ویژن کا ڈائل گھمایا، پردہ تاریک ہی رہا۔ میں نے سوچا کہ سو رہوں، لیکن زندگی میں پہلی بار انسانی گیدڑوں، چوروں، ٹھگوں اور مفرور پاگلوں کا خوف آنے لگا؛ میں سونے سے خوف زدہ تھی اور جاگتے رہنے سے ہراساں۔ اب جھیل چمک رہی تھی، جانور خشک شاخوں کو تڑاق تڑاق چٹخاتے پھر رہے تھے، گھر کے اندر خاموشی جان لیوا تھی۔ میں نے سارے دروازوں کو تالا لگایا، اپنے کمرے سے کمبل اور تکیے اٹھائے، اور بتی جلتی چھوڑ کر کپڑوں ہی میں صوفے پر دراز ہو گئی۔ مجھے نیند آ گئی، جس کے بعد غنڈوں کا ایک پورا غول کھڑکیوں کے راستے اندر گھس آیا اور مجھے ذبح کر کے رکھ دیا۔ جب میں بیدار ہوئی تو ایک چڑیا گا رہی تھی، اور ایک اور چڑیا اپنی چونچ سے درخت کو کرید رہی تھی۔ میں اپنے ڈراؤنے خوابوں تک کو حقیقت پر ترجیح دیتی تھی، چناں چہ میں نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں؛ لیکن میرے پپوٹوں کے پیچھے دن نکلا ہوا تھا۔ میں اٹھی۔ گھر کتنا خالی خالی تھا! اور مستقبل کتنا تہی دست! ایک وقت ایسا بھی تھا جب کسی کرسی پر پڑی ہوئی باتھ روب، ڈیسک کے نیچے پڑے ان پرانے سلیپروں کا منظر ہی مجھے بے طرح متاثر کر دینے کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن

Scanned with CamScanner

آب ان اشیا کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رہی تھی۔ یہ لوئس کی ملکیت تھیں۔ ہاں، لوئس کا اب بھی وجود تھا۔ لیکن وہ آدمی جو مجھ سے محبت کرتا تھا، اپنا نام نشان چھوڑے بغیر روپوش ہو چکا تھا۔ یہ لوئس تھا، یہ لوئس نہیں تھا۔ میں اُس کے گھر میں تھی، اور ایک اجنبی کے گھر میں۔

میں باہر نکلی، چلتی ہوئی کنکروں والی روش کے آخر پر پہنچی؛ لینز بکس کی علامتی جھنڈی غائب تھی: ڈاکیا آچکا تھا۔ میں نے ڈاک نکالی۔ میرے نام بھی ایک خط آیا تھا۔ مریم اور فلپ میکسیکو میں سیر و سیاحت کر رہے تھے؛ واپسی پر شکاگو رکنے کا ارادہ تھا؛ انھیں امید تھی کہ مجھ سے ملاقات ہو سکے گی۔ میں نے انھیں ۱۹۴۶ کے بعد سے نہیں دیکھا تھا، لیکن نینسی گزشتہ مئی میں پیرس آئی ہوئی تھی اور میں نے اُسے اپنا ریاستہائے متحدہ کا پتا دے دیا تھا۔ مریم کا مجھے خط لکھنا یقیناً اتنی غیر معمولی بات نہیں تھی، تاہم میں نے اُس کے خط کو بھا بکا ہو کر دیکھا؛ یہ خط اُس وقت کو لوٹا لایا تھا جب لوئس کا میرے لیے وجود نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری کیسے اس خالی پن میں تبدیل ہو گئی تھی جو منہ چھوڑے ہر چیز کو نگل جانے کے لیے کھڑا تھا؟ باغیچہ بے جان تھا، اور میری یادیں بھی۔ مریم، فلپ، کسی میں ایک لمحے کے لیے بھی دل چسپی لینا مجھے ناممکن نظر آیا۔ اگر کسی چیز کی اہمیت تھی تو یہ وہ مرد تھا جس کی میں منتظر تھی، اور مجھے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ خود میں کون ہوں۔ میں نے باغیچے کا چکر لگایا، گھر میں اضطراب کے عالم میں زمین ناپتی رہی، زور سے چلا کر کہا، 'لوئس، لوٹ آؤ! میری مدد کرو!' میں نے وسکی اور بیسز ڈریں نکلی --- بے سود۔ اس ناقابلِ برداشت خالی پن نے میرا پیچھا چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ میں کھڑکی میں جا بیٹھی اور باہر دیکھنے لگی۔

لوئس! دوپہر کے دو بجے ہوں گے جب مجھے کنکروں کی روش پر اُس کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں حسرت بھر کر کھڑی ہو گئی۔ وہ پیکٹوں سے لدا پھندا تھا: کتابیں، ریکارڈ، چینی چائے، کیانٹی کی ایک بوتل۔ جیسے یہ سب تحفے ہوں، اور وہ تعطیل کا دن۔ میں نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی۔

'کیانٹی! کیا خوب خیال ہے! وقت اچھا گزرا، تمھارا؟ پوکر کے کھیل میں جیت ہوئی؟ کیا کھاؤ گے؟ اسٹیک؟ مرغ؟"

'میں لنچ کھا چکا ہوں،' لوئس نے جواب دیا۔ اس نے پیکٹ نیچے رکھ دیے، اور جوتے اتار کر سلیپر پہن لیے۔

'تمھارے بغیر مجھے یہاں پوری رات ڈر لگتا رہا۔ خواب میں دیکھا کہ ٹو تو گیر سے مجھے مارے ڈال رہے ہیں۔

'بہت پی لی ہو گی۔'

وہ کھڑکی کے پاس پڑی آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور میں صوفے پر جم گئی۔ "احباب کے سب کچھ ٹھیک سے بتاؤ۔" اس نے کہا۔

"کوئی ایسی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔" میں نے کہا۔

میں نے اس کا خیر مقدم اسی بے تکے پن سے کیا تھا جس کی وہ عورتیں عادی ہوتی ہیں جن سے محبت کر کے ترک کیا جا چکا ہو۔۔۔ ضرورت سے زیادہ تپاک، ضرورت سے زیادہ گرم جوشی، ضرورت سے زیادہ پوچھ تاچھ۔ اس نے بعد سے بات ضرور کی لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ محض بات کرنے کی خاطر۔ ہاں، اس نے پولو کھیلا تھا۔ نہ جیتا نہ ہارا۔ ڈیڈی حوالات میں بند تھا، پہلے جیسی سی وحشت ہے۔ نہیں، اس کی ماریتا سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ برٹ سے ہوئی تھی، لیکن دونوں کے درمیان کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوئی۔ جوں ہی میں کوئی تفصیل پوچھتی، اس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو جاتی۔ آخر میں یہ ہوا کہ اس نے اخبار اٹھا لیا اور میں ایک کتاب کھول کر پڑھنے کا ڈھونگ رچانے لگی۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا لیکن کھانے کی تاب بھی نہیں تھی۔

تو میں آخر کیا توقع کیے بیٹھی تھی؟ میں نے حیرت سے سوچا۔ میں ماضی کی کسی بازیافت کرنے کی امید ترک کر چکی تھی۔ تو پھر میں کس چیز کی آس لگائے بیٹھی تھی؟ ایسی دوستی جو اس کھوئی ہوئی محبت کی جگہ لے سکے؟ لیکن اگر کوئی رشتہ محبت کی جگہ لے سکتا تو پھر خود اسی محبت ہی کی بہت زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ نہیں، یہ بات موت کی طرح حتمی تھی۔ میں نے ایک بار پھر سوچا، اور کچھ نہیں تو کاش میں ایک لاش ہی کو اپنی آغوش میں بھر سکتی! میں چاہتی تھی کہ لوئس کے جسم سے قریب ہو جاؤں، اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھوں، اس سے پوچھوں، ہماری جیسی محبت آخر یوں کیسے فنا ہو گئی؟ مجھے سمجھاؤ! لیکن اس نے یہی جواب دیا ہوتا، سب نے کو دھرایا گیا ہے۔

"بچے پر سیر کرنے نہیں چلو گے؟" میں نے تجویز پیش کی۔

"نہیں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ "ابھی نہیں چاہ رہا۔"

صرف دو گھنٹے ہی گزرے تھے۔ دوپہر کا باقی حصہ، پھر شام، پھر رات، پھر اگلا دن، اور اس کے بعد کے اور ست سے دن۔۔۔ نہیں، کیسے گزاروں گی؟ کاش آس پاس کوئی سینما ہی ہوتا! یا کچھ کا دیہاتی علاقہ جہاں بن اور سبزہ زار ہوتے جن میں پیدل چل چل کر خود کو نڈھال کر سکتی! لیکن وہ سیدھی سیدھی سڑکیں جن کے دو رویہ باغیچے تھے، کسی زنداں کے احاطے کی طرح تھیں۔ میں نے اپنے لیے شراب انڈیلی۔ سورج چمک رہا تھا، مگر اس کی روشنی میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ اشیا کو دور کر سکتیں؛ یہ اشیا مجھے کچلے دے رہی تھیں؛ کتاب کے چھپے ہوئے حروف میری آنکھوں میں کھب کر مجھے اندھا کیے دے رہے تھے۔ پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے پیرس کے

بارے میں سوچنے کی کوشش کی، رابرٹ، ماضی اور مستقبل کے بارے میں۔ ناممکن۔ میں اس یک لے میں اسیر تھی؛ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور گردن میں لوہے کا طوق تھا۔ میرے جسم کا بوجھ میرا دم گھونٹے دے رہا تھا اور میری سانسوں سے فضا مسموم ہو رہی تھی۔ میں خود اپنے سے فرار کی خواہش مند تھی اور یہ بات میری قسمت میں دوبارہ نہیں لکھی تھی۔ 'میں بھوسہ بیچ دینے پر بھی راضی ہوں،' میں نے سوچا، 'اور کسی بڑھیا کا لباس پہننے پر بھی، حتیٰ کہ اس بات پر بھی کہ میرا سارا سر سفید ہو جائے۔ لیکن دوبارہ کبھی اپنے سے فرار ہونا ممکن نہیں ۔۔ یہ کیسا عذاب ہے!' میرے ہاتھ نے بوتل کو چھوا، پھر اس سے دور ہٹ گیا۔ مجھے شراب کی کچھ زیادہ ہی لت پڑ گئی تھی؛ اس نے میرے پیٹ کا ستیاناس کر کے رکھ دیا تھا، اور یہ بھی نہیں کہ اس سے حرارت ہی پہنچتی یا اعصاب ہی سن ہو جاتے۔ کیا ہوگا؟ کچھ۔ کچھ ہونا ضروری تھا۔ یہ غیر متحرک اذیت ابد تک تو جاری نہیں رہ سکتی۔ لوئس مستور اخبار پڑھ رہا تھا۔۔ اور اچانک ساری بات مجھ پر واضح ہو گئی۔ یہ وہ آدمی نہیں تھا! وہ آدمی جو مجھ سے محبت کرتا تھا غائب ہو چکا تھا اور ساتھ ہی لوئس بھی۔ میں اتنے مکمل طور پر بے وقوف کیوں کر بن گئی تھی! لوئس! وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا۔ وہ کہا کرتا تھا، "مجموعی طور پر، تم اتنے خوب صورت سر کی مالک ہو۔۔۔ کچھ پتا ہے میں تم سے کتنی شدید محبت کرتا ہوں؟" اس نے مجھے ایک پھول پیش کیا تھا، اس نے مجھ سے پوچھا تھا، 'کیا فرانس میں پھول کھائے جاتے ہیں؟' وہ آدمی کیا ہوا؟ اور کس نے مجھے اس بہروپیے کے ساتھ وہ، تھی سرگوشیاں کرنے کی سزا سنا دی؟ معاً ایک نفرت انگیز یاد کی گونج میرے کانوں میں ابھری: ایک جمائی۔

'خدا کے واسطے جمائی مت لو!' میں نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا کے واسطے رومت!" اس نے کہا۔

میں نے خود کو صوفے پر گرا دیا۔ میں خلا سے لڑھکتی ہوئی نیچے آ رہی تھی؛ تاریکی طبق میری آنکھوں کے سامنے گردش کر رہے تھے، اور میں اندھیرے میں گرتی چلی جا رہی تھی۔

جب تم لوسے بہانے بیٹھ جاتی ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ چلا جاؤں اور کبھی واپس نہ آؤں،" لوئس نے غصے سے کہا۔

مجھے اس کے کمرے سے باہر جانے کی آواز سنائی دی؛ میں اسے نیچ کیے دے رہی تھی، اسے ہمیشہ کے لیے کھوئے دے رہی تھی۔ مجھے اس کو روک لینا چاہیے تھا۔ کچھ دیر تک میں ہاتھ پاؤں مارتی رہی اور پھر تہہ سے جا لگی۔ بہت دور سے مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی؛ لوئس تہہ خانے میں چل پھر رہا تھا، باغیچے میں پانی دے رہا تھا، واپس اندر آ رہا تھا۔ میں روتی رہی۔

'رونا دھونا بند نہیں ہوا اب تک تمہارا؟'

میں نے جواب نہیں دیا۔ میں نڈھال ہو چکی تھی، پھر بھی روئے جا رہی تھی۔ حیرت کی بات

Scanned with CamScanner

ہے کہ کوئی عورت اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کی اتنی زیادہ مقدار رکھ سکتی ہے۔ لوئس اپنے ڈیسک پر جا بیٹھا، ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ شروع ہو گئی۔ وہ تو کسی کتے کو بھی تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا، میں نے سوچا، اور یہاں میں اس کے لیے روئے جا رہی ہوں اور اس پر ذرا اثر نہیں ہوتا۔ میں نے سختی سے اپنے دانت بھینچ لیے۔ میں نے اپنے سے عہد کیا تھا کہ اس سے کبھی نفرت نہیں کروں گی، اس آدمی سے جس نے بغیر کسی تامل کے میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اب یہ وہ کہاں رہا ہے، میں نے دہرایا۔ میرے دانت کٹکٹا رہے تھے؛ میں ایک بے قابو ہیجان کی گرفت میں تھی۔ میں نے اپنے کو پرسکون رکھنے کی کوشش کی جس سے مجھے سر سے پیر تک چیر کر رکھ دیا؛ میں نے آنکھیں کھول دیں، دیوار کو گھورنے لگی۔

"تو تم کیا چاہتے ہو، میں کیا کروں؟" میں نے چلا کر کہا۔ "میں یہاں ہوں، محبوس، تمہارے ساتھ قید۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ باہر جا کر کسی گڑھے میں لیٹ جاؤں۔"

"خدایا!" اس نے قدرے زیادہ دوستانہ لہجے میں کہا۔ "تم کس کس طرح خود کو اذیت پہنچاتی ہو!"

"دوست تو مجھے تم پیارے ہو،" میں نے کہا۔ "میری مدد کی کوشش تک نہیں کرتے۔"

"روتی ہوئی عورت کے لیے بھلا کوئی کیا کر سکتا ہے؟"

"کوئی اور ہوتا، کوئی بھی، تو تم ضرور اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔"

"مجھے اس خیال سے نفرت ہوتی ہے کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

"تو تمہارے خیال میں یہ سب میں جان بوجھ کر کر رہی ہوں؟ کسی ایسے شخص کے ساتھ رہنا کوئی آسان بات ہے جس سے محبت ہو مگر جو محبت نہ کرتا ہو؟"

وہ اپنی کرسی پر بیٹھا رہا، اس نے دوبارہ فرار ہونے کی کوشش نہیں کی، لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس منظر کو اختتام تک پہنچانے کے لیے جو الفاظ درکار تھے وہ اس کی زبان سے نہیں نکلنے والے تھے۔ جاتے کا مشن مجھے خود ہی کرنا ہوگا۔ میں نے اوٹ پٹانگ یہ الفاظ اچھال دیے: "میں یہاں صرف تمہاری خاطر آئی ہوں؛ تمہیں میرے سب کچھ ہونے کے باوجود مجھے یہ محسوس ہونے لگے کہ تم پر بوجھ بن رہی ہوں تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"صرف اس بات پر آنسو بہانے کی کیا ضرورت ہے کہ جب تمہارا دل بات کرنے کو چاہ رہا ہو تو وہی میرا دل بھی چاہے،" اس نے کہا۔ "کیا مجھ پر تمہارے سب نخرے اٹھانا لازم ہے؟"

"یہ سراسر ناانصافی ہے!" میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نے گرمیاں گزارنے کو یہاں بلایا تھا۔ تمہیں نے کہا تھا کہ میرے یہاں ہونے پر بہت خوش ہو۔ اتنی عداوت کی کیا ضرورت ہے؟"

صدوت کہاں ہے؟ جب تم رونے بیٹھ جاتی ہو تو میرا جی چاہتا ہے کہ بھاگ کھڑا ہوں۔ بس۔"

"میں اتنا تو نہیں روتی،" میں نے کہا، اور اپنے رومال کو ہاتھوں میں بٹنے لگی۔ "ممکن ہے تمہیں اس کا احساس نہ ہو، مگر بعض وقت تمہارے طرزِ عمل سے ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی دشمن ہوں، جیسے تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں۔ اس سے بہت صدمہ پہنچتا ہے!"

لوئس مسکرا دیا۔ 'ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ تم پر تھوڑا کم بھروسا کرتا ہوں۔'

"تمہیں اس کا کوئی حق نہیں پہنچتا!' میں نے کہا۔ 'مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں۔ میں اب کبھی محبت جیسی کوئی چیز تم سے نہیں مانگوں گی۔ اپنی سی کوشش کر رہی ہوں کہ ہمارا ساتھ نبھ جائے۔"

'ہاں، تم بہت مہربان ہو،' لوئس نے کہا۔ 'بس یہی تو ساری مصیبت ہے،' اس نے اضافہ کیا۔ 'اسی لیے تو تم پر بھروسا نہیں کرتا۔' اس کی آواز قدرے بلند ہو گئی۔ "تمہاری مہربانی ہی تو سب سے خطرناک دام ہے! اسی میں تو تم نے مجھے پھانس لیا تھا پارسال۔ ایسے شخص کے خلاف جو حملہ نہ کر رہا ہو، اپنی مدافعت کرنا بڑی پوچ بات لگتی ہے۔ چناں چہ آپ کبھی مدافعت نہیں کرتے۔ جب دوبارہ تنہائی میسر آتی ہے تو لگتا ہے کہ آپ کا دل پھر تہ و بالا ہو کر رہ گیا ہے۔ نہیں، میں دوبارہ اس تجربے سے نہیں گزرنا چاہتا۔'

میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ دو چار قدم کمرے میں چلی پھری تاکہ اپنے کو پُرسکون کر سکوں۔ مجھے مہربان ہونے پر ملامت کرنا — حد ہو گئی!

'اب میں جان بوجھ کر اپنے کو نامہرباں تو بنانے سے رہی!' میں نے کہا۔ 'پھر تم بھی تو میری مشکل آسان نہیں کر رہے۔ ایسے حالات میں تو ایک ہی حل نظر آتا ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔'

'لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم چلی جاؤ!' لوئس نے کہا۔ اس نے کندھے اچکائے۔ 'حالات میرے لیے بھی اتنے آسان نہیں۔'

"میں جانتی ہوں،" میں نے کہا۔

سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بالکل ناراض نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ہمیشہ کے لیے مجھے اپنے ساتھ رکھنے کی تمنا کی تھی، اور میں نے ہی انکار کر دیا تھا۔ سو، اگر آج اس کے مزاج میں تلوّن اور خواہشات میں انتشار کی کیفیت ہے تو مجھے اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ آدمی کوئی چیز چاہے لیکن اس کے ماسوا کو چاہنے پر مجبور کر دیا جائے تو وہ لامحالہ اپنی تردید کرنے لگے گا۔

'میں خود نہیں جانا چاہتی،' میں نے کہا۔ 'بس اتنا چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے نفرت کرنا نہ

Scanned with CamScanner

شروع کر دو۔

"وہ مسکرایا [illegible] ابھی اس کی نوبت نہیں آئی ہے!
[illegible] پہلے تم نے مجھے یوں ہی مر جانے دیا ہوتا؛ مجھے بچانے کے لیے تم ذرا سی جنبش بھی نہ کرتے۔"

"ہاں، یہ درست ہے،" وہ بولا۔ "میں جنبش کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس میں میرا کیا قصور، میں سکتے کے عالم میں تھا۔"

میں [illegible] ہنس [illegible] کر [illegible] ایک دوسرے سے صاف صاف بات تو کرنے لگے تھے۔ میں [illegible] سوچنے سے [illegible] نہ رہ سکتی تھی۔

"[illegible] کے معاملے میں تم غلطی پر ہو،" میں نے کہا۔ "ایک بات ہے جو تمہیں [illegible] ہے: میں تمہیں اس کا قصور وار نہیں ٹھہراتی، [illegible] نہیں ٹھہراؤں گی کہ تمہیں [illegible] تمہارے لیے یہ سوچنا کہ میں تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہوں، بالکل [illegible] نہیں ہونا چاہیے۔ تم میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو تمہارے لیے ناخوشگوار ہو۔"

میں نے [illegible] بات کاٹ دی؛ وہ مجھے کسی قدر فکر کے عالم میں دیکھ رہا تھا۔ وہ الفاظ سے خوف زدہ تھا [illegible] میں بہت سی عورتوں کو اپنے جسم کے پچھتاووں کو الفاظ کے ذریعے تسکین دینے کی کوشش کرتے دیکھ چکی تھی؛ بہت سی ایسی عورتوں سے واقف تھی جو [illegible] ہوئے مردوں کو اپنے بستر پر کھینچ لانے میں بڑے افسوس ناک طریقے سے کامیاب ہوئی تھیں۔ یہ [illegible] بات ہے کہ عورت اپنے جسم تک مرد کے ہاتھوں کی رہنمائی کے لیے اس کے ذہن سے مدد طلب کرے۔

میں نے صرف [illegible] "لوئس، ہم دوست ہیں۔"

"بالکل!" اس نے [illegible] میرے گرد ڈال دیا اور سرگوشی میں کہا، "مجھے افسوس ہے کہ [illegible] سختی سے پیش آیا۔"

"مجھے افسوس ہے کہ اتنی بے وقوف نکلی۔"

"[illegible] بے وقوف [illegible] دوست! ویسے خیال تمہیں اچھا سوجھا تھا۔ تو جا کر گڑھے میں کیوں نہیں لیٹ گئیں؟"

"اس لیے کہ تم مجھے ڈھونڈنے نہ آتے۔"

وہ ہنس دیا۔ [illegible] دوسرا [illegible] نہ کرتا۔

"دونوں صورتوں میں [illegible] تمہاری ہی ہوتی،" میں نے کہا۔ "یہ بالکل بے جا ہے۔ میں کبھی [illegible] تکلیف میں [illegible] اور تمہیں تو ایک لمحے کے لیے بھی نہیں۔"

جانتا ہوں۔ تمہارے بے چارے دل میں اتنی گنجائش کہاں! اور تمہارے اس سر میں اتنی دانائی!

بس، اسی لیے تمہیں چاہیے کہ میرے ساتھ مہربانی سے پیش آیا کرو۔

کوشش کروں گا۔ اس نے کھلنڈرے پن سے مجھے چمٹاتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہمارے درمیان دوری کا احساس کچھ کم ہو گیا۔ ساحل پر چہل قدمی اور آفتابی غسل کے درمیان، یا شام کے وقت جب ہم ریکارڈ سن رہے ہوتے، لوئس بے حد بے روک ٹوک بات کرنے لگا تھا۔ ہمارا باہمی اتفاق دوبارہ زندہ ہو رہا تھا۔ مجھے آغوش میں لیتے یا میرا بوسہ لیتے میں اب اسے تذبذب نہیں ہوتا تھا؛ ہم نے دو تین بار جنسی ملاپ بھی کیا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں نے میرے ہونٹ دوبارہ ڈھونڈ نکالے ہیں تو میرا دل بڑے وحشیانہ طور پر دھڑکنے لگا: خواہش کا بوسہ محبت کے بوسے سے کتنا ملتا جلتا ہے! لیکن جلد ہی میرا جسم اپنا کھویا ہوا سکون پا لیتا۔ ایک مختصر سے بھوگ ہی کی تو بات تھی۔ ایک ایسے بے حقیقت عمل کی بات کہ سمجھ میں نہیں آتا لذت اور درد کے عظیم تصورات آخر کس طرح اس سے وابستہ کر کے رکھ دیے گئے ہیں۔

دن، بہت زیادہ وقت کے بغیر، گزرتے گئے: زیادہ تر راتیں تھیں جو تکلیف سے گزرتیں۔ ڈوروتھی نے ننھے زرد کیپسولوں کی اچھی خاصی مقدار مجھے تحفتاً دی تھی؛ اس کے پاس ہر قسم کی شکایت کے لیے گولیوں، سفوفوں، لوشنز اور کیپسولوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ میں سونے سے پہلے دو تین سکون آور گولیاں حلق سے اتار لیتی؛ نیند تو آ جاتی لیکن ساتھ ہی ساتھ برے برے خواب بھی لے آتی۔ جلد ہی مجھے ایک بالکل نئے مرض کی شکایت ہو گئی: ایک ماہ میں، دو ہفتوں میں، دس روز میں، مجھے یہاں سے چل دینا تھا۔ کیا کبھی واپس آنا بھی ہو سکے گا؟ کیا لوئس کو دوبارہ دیکھنا نصیب ہو گا؟ خود اس کو بھی شاید اس کا جواب معلوم نہیں تھا؛ وہ اپنے دل کی حالت کا قیاس کرنے کے معاملے میں خاصا کورا واقع ہوا تھا۔

آخری ہفتہ ہم نے شکاگو میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ایک شام مریم نے مجھے ڈیٹرائٹ سے فون کر کے ملاقات کے لیے پوچھا۔ میں نے ہاں کر دی، اور لوئس کے مشورے سے یہ پروگرام بنایا کہ اس سے ایک دن پہلے شکاگو جاؤں اور اگلے دن نصف شب کے قریب دونوں اپنے فلیٹ پر ملیں۔ اس وقت یہ سب کس قدر سہل لگا تھا۔ لیکن جس صبح مجھے شکاگو جانا تھا، میری حالت غیر ہونے لگی۔ ہم دونوں بیچ پر ٹہل رہے تھے؛ جھیل کا رنگ تانبے جیسا سرخ تھا کہ اس سے سطح کی بھیگی کا اتنا پتہ ہو گیا تھا اور لگتا تھا جیسے آپ لہروں کے اوپر چل سکتے ہوں۔ ریت پر مردہ تتلیاں پڑی ہوئی تھیں؛ سارے کاٹیج سردیوں کی مدت کے لیے بند ہو چکے تھے، صرف مچھیروں کی جھونپڑیاں

Scanned with CamScanner

ہی کھلی تھیں جہاں ایک سیاہ سی کشتی کے پہلو میں جال سوکھنے کے لیے پھیلا دیے گئے تھے۔ آخری بار اس جھیل کو دیکھ رہی ہوں، میں نے سوچا، زندگی میں آخری بار۔ میں ہر ہر چیز کو بڑے انہماک سے دیکھ رہی تھی؛ میں بھولنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن ماضی کو زندہ رکھنے کے لیے پچھتاووں اور آنسوؤں سے اس کی آبیاری کرنی پڑتی ہے۔ اپنی یادوں کو تھامے رکھنا، اور اپنے دل کو بھی محفوظ رکھنا۔۔ یہ میں کیسے کرتی؟

اچانک، میں نے کہا، 'میں اپنے دوستوں کو فون کر دیتی ہوں کہ شام کو نہیں آ رہی۔'

'کیوں؟' لوئس نے استفسار کیا۔ 'بڑا احمقانہ خیال ہے!'

'یہاں ایک دن زائد ٹھہر کے مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔'

'لیکن تم تو ان سے ملنے کی راہ دیکھ رہی تھیں،' لوئس نے ملامت آمیز لہجے میں کہا، جیسے اچانک ارادے بدل دینے سے زیادہ ناقابل فہم کوئی اور چیز کیا ہو سکتی ہے۔

'بس اب جی نہیں چاہ رہا،' میں نے کہا۔

اس نے شانے اچکائے۔ 'میرے خیال میں تم بے وقوف ہو۔'

میں نے فون نہیں کیا۔ اگر لوئس کے حساب سے میرا یہاں ٹھہرنا حماقت تھا تو یہ واقعی حماقت تھی۔ میرے ساتھ ایک دن زیادہ یا ایک دن کم گزارنے کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تو پھر یہاں رکی رہ کر ایک دن اور لگے رہنے سے مجھے کیا فائدہ ہوتا؟ میں نے سب لوگوں کو خدا حافظ کہا۔ 'تم واپس آؤ گی، آؤ گی نا؟' ڈوروتھی نے پوچھا۔ اور میں نے کہا، 'ہاں۔' میں نے اپنے سوٹ کیس تیار کر کے لوئس کے حوالے کر دیے؛ صرف ایک ہلکا پھلکا سا نائٹ بیگ ساتھ رکھ لیا۔ پچھلے گھر کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے پوچھا، 'تالاب کو الوداع نہیں کہو گی؟' میں نے انکار میں سر ہلایا اور بس اسٹاپ کی طرف چل پڑی۔ اگر اسے مجھ سے محبت ہوتی تو چوبیس گھنٹے کے لیے اس سے جدا ہونا کوئی المیہ نہ ہوتا۔ لیکن میرے اندر محبت کا پالا پڑا ہوا تھا، اور مجھے اس کو گرمانے کے لیے لوئس کے قرب کی ضرورت تھی۔ میں نے اس گھر میں اپنے لیے ایک آشیانہ بنا لیا تھا؛ زیادہ آرام دہ نہیں تھا، مگر آشیانہ تو تھا؛ میں اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ مجھے باہر کھلے میں پاؤں دھرتے ہوئے خوف آ رہا تھا۔

بس قریب آ گئی۔ لوئس نے میرے رخسار کا سرسری سا بوسہ لیا۔ 'خوب مزے کرنا!' اور دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا، وہ غائب ہو گیا۔ عنقریب ایک اور دروازہ اسی طرح بند ہو گا اور وہ ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گا۔ اس سے دور، افتادہ، میں کس طرح اس حقیقت کو برداشت کر سکوں گی؟

جب میں ٹرین میں ٹھیک سے بیٹھ چکی تو باہر شام پڑ رہی تھی؛ آسمان پہلے سے گلابی رنگ کا ہو چلا تھا، اور تب مجھے پتا چلا کہ گلاب کی خوشبو کیوں کر بے ہوش کر دیتی ہے۔ ہم سطح میدانوں سے

گزرے۔ آخرکار ٹرین شکاگو کے سوادِ شہر میں داخل ہوئی۔ میں چوبی زینوں اور چھتوں والے کالی اینٹوں کے پیش رخ کو پہچان گئی؛ میری محبت کا گھر، جو اب میرا نہیں رہا تھا، اپنی ہزاروں نقلوں میں موجود تھا۔

میں اسٹیشن پر اتری۔ عمارتوں کی کھڑکیوں میں بتیاں روشن ہونے لگی تھیں؛ نیون سائنز بھی چمکنے لگے تھے۔ ہیڈلائٹوں، دکانوں کی نمائشی کھڑکیوں اور ٹریفک کے شور سے میرا سر چکرانے لگا۔ میں دریا کے پہلو میں آ کر رک گئی۔ اس کا پل اٹھا ہوا تھا اور یک مال بردار بڑی جہاز پنی چمنیوں کے پھل سے شہر کو بڑی گمبھیرتا کے ساتھ دو ٹکڑوں میں تقسیم کرتا گزر رہا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دریا کے سیاہ پانی کے سہارے سہارے چلتی ہوئی، جس میں اسیر روشنیاں جھلملا رہی تھیں، جھیل کی طرف آئی۔ وہ شفاف پتھر، وہ رنگا ہوا آسمان، وہ پانی جس میں سے مرکاب شہر کی روشنیاں ور شور بلند ہو رہا تھا — یہ کوئی خواب نہیں تھا، کسی اور کا دیکھا ہوا خواب — یہ یک نسانی، لوگوں سے بھرا پڑا، سچ مچ کا شہر تھا، بالکل اسی کرۂ ارض کا شہر، جس میں میں، گوشت پوست کی ہستی، محوِ خرام تھی۔ اپنے سیمیں مخمل کے نیچے یہ کس قدر دل آویز لگ رہا تھا! میں آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتی رہی، اور کوئی چیز سہمے سہمے سے انداز میں میرے دل میں حرکت کرنے لگی۔ ہم سوچتے ہیں کہ یہ محبت ہے جو دنیا کو آب و تاب عطا کرتی ہے، لیکن خود دنیا بھی تو محبت کو اپنی دولت سے مالا مال کرتی ہے۔ محبت مر چکی تھی، لیکن دنیا اپنی جگہ پر قائم تھی، جوں کی توں، اپنے پوشیدہ نغموں، اپنی خوشبوؤں، اپنی ملائمت کے ساتھ۔ اس خیال سے میں عجیب طور پر متاثر ہوئی، اس روبہ صحت مریض کی طرح جس پر منکشف ہو کہ اس کی بیماری کے دوران سورج بجھ کر نہیں رہ گیا تھا۔

نہ مریم شکاگو سے واقف تھی نہ فلپ، مگر مجھ سے ملنے کی خاطر انھوں نے شہر کا سب سے شائستہ ریستوران ڈھونڈ نکالا تھا۔ جگر جگر کرتی لابی سے گزرتے ہوئے میں ایک آئینے کے سامنے رک گئی؛ ہفتوں میں آج پہلی بار مجھے اپنے سراپے کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ میں نے قرینے سے بال سنوارے تھے، شہر میں جانے کا میک اپ کیا تھا، اپنے انڈین جیولرز کو قبر سے کھود کر نکالا تھا؛ اس کے رنگ آج بھی اتنے ہی شستہ تھے جتنے چی چی کاستیناگو میں؛ اور جہاں تک میرا تعلق ہے، تو میری عمر ڈھلی نہیں تھی، میں بدشکل نہیں ہوئی تھی، دوبارہ اپنا عکس دیکھنا بالکل ناگوار نہیں لگ رہا تھا۔ میں بار میں آ بیٹھی اور مارٹینی کا گھونٹ پیتے ہوئے تعجب سے یاد کیا کہ انتظار راحت بخش بھی ہو سکتا ہے اور تنہائی خوش گوار بھی۔

"این ڈارلنگ!" مریم نے میرے گال پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ اپنے کھچڑی بالوں کے ساتھ وہ پہلے سے زیادہ جوان اور ثابت قدم نظر آ رہی تھی۔ فلپ کا مصافحہ ناقابلِ اظہار شاروں

Scanned with CamScanner

کر دیں سے پڑتی تھی۔ وہ کچھ ذرا ضرور تھک رہی تھی مگر اس کی شخصیت کی دلکشی اور خوبصورت نفاست ہنوز باقی تھی۔ ہم دونوں، بیسی کی شادی اور میکسیکو کی بے ربط باتیں کرتے رہے۔ پھر ہم اس کی میز کی درخواست پر ایک وسیع کمرے میں گئے جس کی چھت سے مور کے طاؤس گویا برس رہے تھے اور جس کا انتظام ایک متکبر ہائی کے ہاتھوں میں تھا۔ اب نے کس رنگ کی بنیاد پر ایک کمرہ ایک اور کمرہ --- ٹیپی باتھ کے پمپ روم --- کی ہوبہو نقل تھا جہاں اٹھارویں صدی کے شائستہ اور نفاست پسند امراء معدنی پانی سے علاج کرانے آیا کرتے تھے۔ ہندوستانی مہاراجوں کے حبشی میں بیرو پہرے بھیس بھرائے پھر رہے تھے جن پر بھیڑ کے گوشت کے دہکتے سرخ تکے چڑھے ہوئے تھے۔ کچھ اور بیرے، اٹھارویں صدی کے باوردی خدمت گاروں کے روپ میں، بڑی بڑی مچھلیوں کی نمائش کرتے پھر رہے تھے۔

"کیا زبردست سوانگ میلہ ہے!" میں نے کہا۔

"مجھے ایسی واہیات حکموں سے عشق ہے،" فلپ نے اپنی مخصوص لطیف مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ مجھے سے ہم کار فلپ کو وہ میز دے ہی دی جو اس نے رکوائی ہوئی تھی۔ اس نے سعادت دے دار احتیاط کے ساتھ ہمارے لیے کھانوں کا انتخاب کیا۔ جب ہم نے باتیں شروع کیں تو مجھے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا کہ ہم لوگوں کا کسی کی بات پر اتفاق نہیں تھا۔ انھوں نے بوس کی لکھی ہوئی کتاب پڑھی تھی؛ ان کے خیال میں اس کی وقعت حسب ضرورت کم نہیں تھی۔ میکسیکو میں بل فائٹس دیکھتے دیکھتے ان کی حالت غیر ہو گئی تھی؛ اس کے برخلاف جو مزدوروں اور گو گتے اسے ہندوں دہشت حسین شاعرانہ باغ عدن کی طرح نظر آئے تھے۔

"سیاح کے لیے ضرور شاعرانہ ہیں!" میں نے کہا۔ "لیکن تمھیں وہ تمام زیبا لگے، وہ سب عام طور میں نظر نہیں آتیں؟ عجیب حشت ہے!"

"تمھیں حقیر کا یہ روز ہمارے معیاروں سے نہیں جانچنا چاہیے،" فلپ نے کہا۔

"فرق تو فرق ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون مر رہا ہے۔"

فلپ نے معنوی ادا کوشش میں۔ "کتنی عجیب بات ہے!" وہ بولا۔ "یورپی امریکیوں کو مادہ پرست ہونے کا الزام دیتے ہیں؛ لیکن تم ہمارے مقابلے میں زندگی کے مادی پہلوؤں کو کہیں زیادہ اہمیت دیتی ہو"

"پہلے اداسی آسائشوں سے آدمی لطف اندوز تو ہو لے، پھر پتا چلے کہ آسائشوں کی کتنی کم اہمیت ہوتی ہے،" مریم نے کہا۔

وہ دو موش جیسے کی سی تیزی کے ساتھ ہلکی پھلکی سی بیچ کو ہضم کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اس کا شوخ نیلا لباس سڈول گدرے ہوئے کندھوں کو خوب عیاں کر رہا تھا۔ اس میں کانوں میں سونے

اور کچھ وقت کے لیے بڑی احتیاط سے مرتب کی ہوئی محض ترکاریوں پر مشتمل غذا پر گزارا کرنے کی صلاحیت یقیناً موجود تھی۔

"بات آسائش کی نہیں،" میں نے کچھ زیادہ ہی بے صبری سے کہہ دیا۔ "سارا فرق بنیادی ضرورتوں کی محرومی سے پڑتا ہے، کسی اور چیز کی محرومی سے نہیں۔"

فلپ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "ضروری نہیں کہ جو چیز ایک آدمی کے لیے ضروری ہو، وہی دوسروں کے لیے بھی ہو۔ تم یہ بات مجھ سے بہتر جانتی ہو کہ مسرت کتنی داخلی چیز ہوتی ہے۔" مجھے جواب دینے کی مہلت دیے بغیر اس نے یہ اور جڑ دیا، "ہمارا جی چاہ رہا ہے کہ دو ایک سال ہم دور اس میں گزاریں، وہاں سکون اور خاموشی کے ساتھ کام کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ہم ان قدیم تہذیبوں سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا سیکھ سکتے ہیں،" میں نے کہا۔ "چوں کہ تمہیں ریاست ہائے متحدہ میں فی الوقت ہونے والی بعض باتوں پر اعتراض ہے، یہ کہیں بہتر ہوگا کہ ان کے تدارک کی کوشش کی جائے۔"

"تم بھی؟ تو کیا تم بھی اسی ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی ہو؟" فلپ نے کہا۔ "عمل! اس کا جنون ہر دیسی ادیب کے سر پر سوار ہے! یہ بعض بڑے عجیب نفسیاتی الجھنوں کا غماز ہے۔ کیوں کہ انہیں معلوم ہے وہ کبھی بھی کوئی تبدیلی نہیں لا سکیں گے۔"

"یہی امریکی دانش ور اپنی ناتوانی کی دہائی دیتے ہیں،" میں نے کہا۔ "بس یہی عجیب نفسیاتی دکھاوا لگتا ہے۔ جس دن ریاست ہائے متحدہ پوری طرح فاشسٹ بن جائے گا، یا جنگ کا آغاز کر دے گا، تمہیں شکایت کا حق نہیں رہے گا۔"

مریم اپنے منہ میں جنگلی چاول کا لقمہ رکھنے ہی والی تھی کہ اچانک کانٹے کو واپس پلیٹ پر رکھ دیا۔ "تم بالکل کسی مشنری کی طرح بات کرتی ہو،" اس نے جز بز ہو کر کہا۔

"ریاست ہائے متحدہ جنگ کا خواہاں نہیں ہے، ہاں!" فلپ نے مجھ پر گہری ملامتی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "تم اپنے دیسی احباب کو ان کی خامیاں دکھا دو۔ اگر ہم اتنی مستعدی سے جنگ کی تیاریاں کرتے دکھائی دیتے ہیں تو صرف اس واسطے کہ جنگ لڑنے سے باز رہ سکیں۔ اور ہم فاشسٹ تو کبھی نہیں ہوں گے۔"

"لیکن یہ وہ بات تو نہیں جو تم دو سال پہلے کہہ رہے تھے،" میں نے کہا۔ "اس وقت تمہارے خیال میں امریکی جمہوریت واقعی بڑے خطرے میں تھی۔"

فلپ کا چہرہ بہت گمبھیر ہو گیا۔ "تب سے میں نے یہی سیکھا ہے کہ جمہوریت کا دفاع جمہوری ذرائع سے ممکن نہیں۔ سوویت یونین کا سخت گیر پن ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ توازن

برقرار رکھنے کے لیے کتنی ہی سخت گیر پالیسیاں اختیار کریں، اور یہ بات تجاوز کی طرف لے جاتی ہے، جس کی مذمت میں، میں پیش پیش ہوں۔ لیکن تجاوز کا یہ مطلب نہیں نکلتا کہ ہم نے فاشزم اختیار کر لیا ہے۔ اس سے صرف جدید دنیا کے عالم گیر المیے کا اظہار ہوتا ہے۔

میں متحیر ہو کر اس کا جائزہ لیتی رہی۔ دو سال پہلے ایک دوسرے کو سمجھنے میں ہمیں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی؛ اس وقت وہ اپنی ذہنی آزادی کا بڑا زور مدعی تھا۔ اور اب کس آسانی سے سرکاری پروپیگنڈے پر ایمان لے آیا تھا! لوئس نے مجھ سے یقیناً بالکل درست کہا تھا، ہم جیسوں کی تعداد روز بہ روز گھٹتی جا رہی ہے۔"

"بالفاظ دیگر،" میں نے کہا، "تمہارے خیال میں سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی موجودہ پالیسی کا سبب یہی صورت حال ہے؟"

"اگر کسی مختلف پالیسی کا تصور کر بھی لیا جائے پیاری این،" وہ نرمی سے بولا، "تو کم از کم میں تو اسے ان کے سر نہیں تھوپ سکتا۔ نہیں، اگر آدمی ان تلخیوں، وہ عہد کے ساتھ کسی بھی قسم کی ساجھے داری سے بچنا چاہتا ہے تو اس کا بس ایک ہی طریقہ ہے: کسی دور افتادہ گوشے میں جا کے اور وہاں دنیا سے منقطع ہو کر زندگی گزار دے۔"

وہ اپنی آرام دہ، فکروں سے آزاد، جمال پرستانہ زندگی اسی طرح گزارتے رہنے کے خواہاں تھے؛ کوئی دلیل، کوئی حجت، ان کی رجائیت پر اثر انداز ہونے والی نہیں تھی۔ میں نے اس موضوع پر مزید گفتگو کا ارادہ ترک کر دیا۔ "مجھے یقین ہے کہ ہم پوری رات اس موضوع پر، بغیر ایک دوسرے کو قائل کیے، گفتگو کر سکتے ہیں،" میں نے کہا۔ "ایسے مباحثے جن کا کوئی نتیجہ نہ نکلے، تضیع اوقات ہی ہوتے ہیں۔"

"خاص طور پر جب ہم تم سے ایک طویل مدت تک محروم رہے ہیں، اور تمہیں دوبارہ دیکھ کر بے حد خوش ہوئے ہیں!" فلپ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ ایک نئے امریکی شاعر کے بارے میں بتانے لگا۔

"این، آج رات ہم خود کو تمہارے سپرد کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایک قابل تعریف گائیڈ ہو،" جب ہم ریستوران سے باہر نکل رہے تھے تو فلپ نے کہا۔

ہم کار میں سوار ہوئے اور میں انہیں جھیل کنارے لے گئی۔ فلپ نے اسے پسند کیا۔ "ریاست ہائے متحدہ کی دل آویز ترین اسکائی لائن ہے۔ نیویارک کی اسکائی لائن سے بھی زیادہ حسین!" دوسری طرف، یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ یہاں کے برلسک شو بوسٹن کے برلسک شوز سے کمتر تھے اور یہاں کے شراب خانے سان فرانسسکو کے شراب خانوں سے کم دلکش۔ اس قسم کے تقابل پر میری عقل دنگ رہ گئی۔ وہ نگیں جو ایک رات لوئس نے عدم کی کوکھ سے برآمد کی

تھیں، اُن کا بھلا کس سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا؟ کیا ان جگہوں کا کوئی جغرافیائی محلِ وقوع بھی تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی یادوں کے سہارے ان جگہوں تک جا پہنچنے کا راستہ بہ آسانی دریافت کر لیا تھا۔ کلب ڈیلیسا اب ایک ساقط ماضی کا حصہ بن چکا تھا، روئے زمین پر کہیں بھی واقع نہیں تھا۔ تاہم موجود تھا، وہ سامنے جہاں دو سڑکیں آ کر ایک دوسرے کو قطع کر رہی تھیں۔ اور ان دونوں سڑکوں کے اپنے نام تھے، دونوں نقشے پر موجود تھیں۔

'نہایت شاندار فضا ہے!' فلپ نے بالیدگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ نٹ قلابازوں کا تماشا دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ دو سال پہلے اگر اس نے فون پر مجھ سے کہہ دیا ہوتا کہ 'میں آ جاؤں گا'، تو کیا ہوتا؟ یقیناً ہم نے چند حسین راتیں ساتھ گزاری ہوتیں، لیکن میرے لیے اس کو دیر تک پسند کرتے رہنا مشکل تھا؛ اور محبت تو میں اس سے کبھی نہ کر پاتی۔ یہ بات بڑی عجیب لگ رہی تھی کہ محض اتفاق نے اسے بھرپور تپش کے ساتھ میرے لیے انتخاب کیا تھا۔ یقیناً یہ اتفاق کا نتیجہ نہیں تھا کہ فلپ نے کیپ کاڈ میں ایک ویک اینڈ گزارنے کو مجھ پر ترجیح دی تھی، کہ اپنی والدہ کا لحاظ کرتے ہوئے میرے کمرے میں مجھ سے ملنے نہیں آیا تھا۔ گر وہ جذبۂ شوق سے زیادہ سرشار ہوتا، زیادہ باہمت ہوتا، تو اس کی سوچ، احساس، اور زندگی بھی مختلف ہوتی؛ وہ کوئی اور ہی شخص ہوتا۔ بہرحال، ذرا سے مختلف حالات نے مجھے اس کی آغوش میں لا پھینکا ہوتا، مجھ لوئس سے محروم کر دیا ہوتا۔ اس خیال سے میری طبیعت مکدر ہو گئی۔ مجھے اس معاشقے کی، آنسوؤں کی شکل میں، بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی؛ تاہم میں اسے کسی بھی چیز کے عوض بیچ، حتیٰ کہ نوچ کر پھینک دینے کو تیار نہیں تھی۔ اور اچانک، یہ سوچنا باعثِ راحت تھا کہ زمانے اور بدقسمتی کے باوجود، یہ تعلقِ خاطر میرے اندر متواتر زندہ رہے گا۔

جب ہم کلب سے اُٹھے تو فلپ ہمیں کار میں واپس جھیل پر لے آیا۔ طویل قامت عمارتیں صبح سویرے کی دھند میں تحلیل ہو چکی تھیں۔ اس نے سیرگاہ کے برابر کار روک دی اور ہم زینے کی سیڑھیوں سے نیچے پہنچے تاکہ نیلگوں پانی کے تھپیڑے کھانے کی آواز کو ذرا قریب سے سن سکیں۔ سرمئی آسمان کے نیچے وہ پانی کس قدر نیا لگ رہا تھا۔ 'خود میں بھی!' میں نے پُرامید ہو کر اپنے سے کہا، 'میری زندگی بھی ازسرِ نو شروع ہو گی۔ یہ ایک بار پھر زندگی ہو جائے گی، میری اپنی زندگی!' اگلی دوپہر میں نے فلپ اور مریم کو اپنی رہنمائی میں سڑکوں اور شاہراہوں کے کنارے کے باغوں کا نظارہ کرایا۔ ان سڑکوں کے کنارے جن کا تعلق صاف ظاہر تھا کہ ایک ارضی شہر سے ہے، ایسے شہر سے جس سے میں اس حد تک واقف تھی کہ بغیر پتہ پوچھے گھوم پھر سکتی تھی۔ گر دنیا مجھے واپس دے دی گئی تھی تو مستقبل اب اتنا ناممکن نہیں رہا تھا۔

تاہم، شام ڈھلے، جب وہ سرخ کار زنّاٹے سے نیویارک کی طرف چل دی تو میں اپارٹمنٹ

لوٹنے سے ہچکچا رہی تھی: مجھے خالی گھر سے اور اپنے دل میں ہونے والے ماتم سے خوف آ رہا تھا۔ میں ایک فلم دیکھنے چلی گئی، اور اس کے بعد سڑکوں پر آوارہ پھرتی رہی۔ میں پہلے کبھی شکاگو میں رات کے وقت سڑکوں پر اکیلی نہیں گھومی تھی۔ اپنے جھلملاتے پردوں کے پیچھے شہر اپنا عداوتی رنگ ڈھنگ کھو چکا تھا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کروں۔ میں ایک ایسی دعوت میں بے مقصد گھومتی پھر رہی تھی جہاں مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ میری آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے اپنا ہونٹ کاٹا۔ نہیں، میں رو، نہیں چاہتی تھی۔ سچ۔ میں رو کہاں رہی ہوں، میں نے اپنے سے کہا: یہ تو رات کی روشنیاں ہیں جو میرے اندر لرز رہی ہیں، اور ان کی چمک نمکین قطروں کی شکل میں میری پلکوں کے کناروں پر جمتی جا رہی ہے۔ کیوں کہ میں یہاں ہوں، کیوں کہ میں کبھی واپس نہیں آؤں گی، کیوں کہ دنیا بہت عظیم ہے، بہت مفلس ہے، ماضی بے حد بوجھل ہے، بے حد لطیف ہے، کیوں کہ اس دل آویز گھڑی کو میں مسرت میں نہیں ڈھال سکی، کیوں کہ میری محبت مر چکی ہے، اور میں اس کے بعد بھی زندہ رہے وہی ہوں۔

میں نے ٹیکسی لی۔ ایک بار پھر میں نے خود کو اس گلی کے نکڑ پر پایا جس کے ایک کنارے پر کوڑے کے ڈبوں کی قطار چلی گئی تھی، اندھیرے میں میرا پیر زینے کی پہلی سیڑھی سے ٹھوکر کھا گیا۔ گیس ٹینک کے اوپر ایک سرخ سا تاج دمک رہا تھا، اور فاصلے میں کسی ٹرین نے سیٹی بجائی۔ میں نے دروازہ کھولا: اندر روشنی ہو رہی تھی لیکن لوئس محو خواب تھا۔ میں نے کپڑے اتارے، بتی بجھائی اور اس بستر میں گھس گئی جس میں کس بہتات سے آنسو بہانے تھے۔ اتنے سارے آنسو مجھ میں کہاں سے آ گئے تھے؟ کیوں؟ یا ایک کوئی چیز اس قابل نہیں رہی تھی کہ اس پر ایک سسکی بھی صرف کی جا سکے۔ میں نے اپنے جسم کو دیوار کے ساتھ دبایا: میں اتنی مدت سے لوئس کی حرارت کے سائے میں نہیں سوئی تھی کہ لگا جیسے کسی اجنبی نے رحم کر کے مجھے اپنے بستر کا ایک حصہ دے دیا ہو۔

اس نے جنبش کی، اور اپنا ہاتھ بڑھا کر مجھے چھوا۔ "لوٹ آئیں؟ کیا وقت ہوا ہے؟"

"بارہ بج رہے ہیں۔ میں یہاں تم سے پہلے نہیں پہنچنا چاہتی تھی۔"

"اوہ! میں تو دس بجے ہی پہنچ گیا تھا۔" اس کی آواز پوری طرح بیدار محسوس ہوئی۔ "یہ گھر کتنا اداس ہے، ہے نا؟"

"ہاں۔ جنازگاہ کی طرح۔"

"جنازگاہ بھی ایسی جسے لوگ تج چکے ہوں،" اس نے کہا۔ "روحوں سے بھری ہوئی۔۔۔ بیبو کی روح، پاگل عورت کی روح، حبیب کترے کی روح۔۔۔ وہ تمام لوگ جو دوبارہ کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں گے۔ یہ سب وہاں نہیں آئیں گے۔ مجھے یہ پار کر والا گھر بہت پسند ہے مگر وہ ضرورت سے

زیادہ ہوش مندانہ ہے۔ یہاں۔۔۔"

"یہاں ایک طرح کا گھر تھا،" میں نے کہا۔

"گھر؟ پتا نہیں۔ لیکن، کم از کم، گاہے گاہے لوگ ضرور آ نکلتے تھے۔ کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا تھا۔"

پشت کے بل پڑے پڑے اس نے اونچی آواز میں ان تمام دنوں اور راتوں کو اپنے تصور میں سامنے لا کھڑا کیا جو اس کمرے میں گزرے تھے، اور مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل کو جھٹکا دے کر کھینچا ہو۔ مجھے اس کی زندگی شاعرانہ لگی تھی؛ جیسے نذیر فلپ کو لگے تھے۔ لیکن خود اس کے لیے یہ کتنی پُرمشقت اور نادار زندگی تھی! کتنے ہفتے، کتنے مہینے، جو کسی دوست نہ ہمسیر کے بغیر، کسی ہمدم، کسی کی موجودگی کے بغیر گزرے تھے! اس نے کس شدت سے ایک عورت کی تمنا کی ہو گی، ایسی عورت کی جو مکمل طور پر اس کی اپنی ہو! لمحہ بھر کے لیے اسے لگا تھا جیسے وہ تنہائی سے بچ نکلا ہو؛ اس نے سلامتی کے علاوہ کسی اور چیز کی تمنا کرنے کی جرأت کی تھی۔ اور اس نے دھوکا کھایا، بڑی تکلیف اٹھائی، اور اس ابتلا سے جاں بر ہوا! میں اس کی زندگی میں کانٹا نہیں بننا چاہتی تھی۔ مجھے ایک پچھتاوے کا بھی حق نہیں تھا؛ ایک شکوہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

اچانک اس نے شمع جلا دی اور میری طرف مسکرا کر دیکھا۔ "این، تمھاری گرمیاں اتنی بُری تو نہیں گزریں؟"

میں ہچکچائی۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ میری زندگی کی بہترین گرمیاں نہیں تھیں۔"

"مجھے پتا ہے،" اس نے کہا۔ "مجھے پتہ ہے۔ وہ بہت سی باتیں ہیں جن کا مجھے افسوس ہے۔ بعض موقعوں پر تمھیں یہ گمان گزرا کہ میں خود کو برتر سمجھ رہا ہوں، یا میرا رویہ جارحانہ ہے۔ ایسا نہیں تھا۔ لیکن بات یہ ہے کہ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے سینے میں گرہ سی پڑ گئی ہو۔ ایسے موقعوں پر میں ٹس سے مس نہیں ہوتا، چاہے دوسرا مر ہی کیوں نہ جائے، چاہے میں خود ہی کیوں نہ مر جاؤں۔"

"میں بھی یہ جانتی ہوں،" میں نے کہا۔ "شاید یہ سب ماضی میں بہت پیچھے تک جاتا ہو۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ تمھیں اپنی جوانی بڑے مصائب میں گزارنی پڑی، اور غالباً بچپن بھی۔"

"نہیں! میں تمھیں اپنی تحلیلِ نفسی نہیں کرنے دوں گا!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ تاہم اس کے اندر زمیں مدافعت کی سی کیفیت آ گئی تھی۔

"اس بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں،" میں نے کہا۔ "لیکن مجھے دو برس پہلے کی وہ رات یاد آ رہی ہے جب ہم کلب ڈیبیٹ میں تھے اور میں تمھیں اپنی انگوٹھی واپس دے کر

Scanned with CamScanner

نیویارک لوٹ جانا چاہتی تھی۔ بعد میں تم نے مجھ سے کہا تھا: میں خود کو ایک لفظ بھی کہنے پر آمادہ نہ کر سکا۔"

"میں نے کہا تھا یہ؟ کس غضب کا حافظہ ہے تمہارا!"

"ہاں، میرا حافظہ بڑا اچھا ہے،" میں نے کہا۔ "لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ یاد نہیں تمہیں کہ پھر اس رات کو ہم ایک لفظ کہے بغیر ہم بستر ہوئے تھے؟ تم تقریباً جنگ پر آمادہ نظر آ رہے تھے، اور میں نے کہا تھا: تو کیا تم میرے لیے ذرا سی دوستی بھی نہیں محسوس کرتے؟ تم پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار سے جا لگے تھے، اور جواب دیا تھا: دوستی؟ ارے بھئی، مجھے تو تم سے باقاعدہ عشق ہے!"

میں نے اس کی نیم تمسخرانہ آواز کی نقل اتاری اور لوئس بے اختیار قہقہہ زن ہو گیا۔ "بالکل احمقانہ بات لگتی ہے!"

"تم نے یہی کہا تھا، اور اسی طرح کہا تھا۔"

وہ چھت کو گھورتے ہوئے بڑبڑایا، "کیا پتا میں اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں"

چند ہفتے پہلے میں اس جملے کو بڑے شوق سے پکڑ کر بیٹھ گئی ہوتی، اور کوشش کرتی کہ اسے پال پوس کر باقاعدہ ایک امید بنا دوں۔ لیکن اب یہ جملہ مجھ میں کوئی گونج نہیں پیدا کر سکا۔ اپنے جذبات کے بارے میں لوئس کا خود سے استفسار بالکل قدرتی بات تھی، اور پھر آدمی ہمیشہ ہی الفاظ سے کھیل سکتا ہے، لیکن اس میں کیا کلام کہ ہمارا معاشقہ ختم ہو چکا تھا۔ یہ وہ بھی جانتا تھا اور میں بھی۔

ان آخری دنوں میں ہم نے نہ ماضی کی بات کی نہ مستقبل کی، نہ اپنے جذبات کی۔ لوئس موجود تھا اور میں اس کے قریب تھی: اتنا ہی کافی تھا۔ چوں کہ ہمیں کسی چیز کا مطالبہ نہیں تھا، ہمیں کسی چیز سے روکا بھی نہیں گیا تھا: یہ تقریباً ناقابل یقین تھا کہ ہم جھگڑنے کی حد تک ایک دوسرے سے بیزار ہو جائیں گے۔ اور شاید ہم ہو بھی گئے تھے۔

اسی روانگی کی رات، میں نے کہا، "لوئس، مجھے نہیں معلوم کہ کوئی وقت ایسا آئے گا جب مجھے تم سے محبت نہ رہے؛ لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ جب تک زندہ ہوں تم میرے دل میں رہو گے۔"

اس نے مجھے اپنے سے چمٹا لیا۔ "اور تم میرے دل میں، جب تک زندہ ہوں۔"

"کیا ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے سے مل سکیں گے؟" میں اپنے سے مزید سوال جواب نہیں کر پاتی تھی۔ لوئس میرے ساتھ ایئرپورٹ آیا۔ مجھے ٹکٹ کی کھڑکیوں کے سامنے چھوڑ کر جانے سے پہلے اس نے بڑی تیزی کے ساتھ مجھے چوما، اور میں نے ہر چیز اپنے ذہن سے جھٹک کر ایک

طرف کر دی۔ جہاز میں سوار ہونے سے ذرا پہلے ایک ہرکارے نے ایک گتے کا ڈبا لا کر میرے ہاتھوں میں تھما دیا جس میں شفاف کاغذ کے غلاف میں لپٹا ہوا، آرکڈ کا ایک بہت بڑا سا پھول تھا۔ میرے پیرس پہنچنے تک وہ ہنوز کھلا نہیں تھا۔

**

سیمون دی بووار (Simone de Bouvoir) کے ناول *The Mandarins* کے چھٹے، ساتویں اور دسویں باب کے اقتباسات سے ترتیب دی ہوئی یہ کہانی اس تیسری قسط کے ساتھ مکمل ہوتی ہے۔ اس کی پہلی قسط آج کے اپریل ۱۹۹۲ اور دوسری آج کے اپریل ۱۹۹۳ کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔

سہ ماہی

سویرا

ترتیب: محمد سلیم الرحمٰن، سہیل احمد خاں

۱۵، سرکلر روڈ لاہور

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۳۲ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ادبی ماہ نامہ

دریافت

مدیر: قمر جمیل

بی ۵، قمر پلازا، گلشنِ اقبال، بلاک ۳، کراچی ۷۵۳۰۰

انتخاب

وِجے تیندولکر

کا مکمل ڈراما

خاموش! یہ عدالت ہے

ترجمہ: انتظار حسین

Scanned with CamScanner

وجے تینڈولکر (Vijay Tendulkar) نہ صرف مراٹھی زبان کے نمایاں ترین ڈراما نگار ہیں بلکہ انہیں بادل سرکار، گریش کرناڈ اور موہن راکیش کے ساتھ ہندوستان بھر کے تھیٹر کی اہم ترین شخصیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ تینڈولکر کے معروف ڈراموں میں "سکھارام بائنڈر"، "گھاسی رام کوتوال" اور "گدھ" (The Vultures) شامل ہیں۔ ان کی ہندوستان گیر شہرت کا آغاز ان کے کھیل "شانتتا! کورٹ چالو آہے" (Silence! The Court is in Session) سے ہوا جو مراٹھی زبان میں پہلی بار ۱۹۶۸ میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد سے ان کے اس کھیل کو انگریزی، ہندی اور دوسری کئی زبانوں میں ترجمہ اور اسٹیج کیا جا چکا ہے۔ آئندہ صفحات میں آپ اس کھیل کا اردو ترجمہ پڑھیں گے۔ معروف فن نگار انتظار حسین کا ترجمہ کردہ یہ ڈراما قدرے بدلی ہوئی صورت میں عنقریب لاہور میں اسٹیج کیا جائے گا۔

اس ڈرامے میں تینڈولکر نے ہندوستانی معاشرے کی تعلیم یافتہ، اونچے آدرش رکھنے والی اور معزز سرگرمیوں میں مشغول اقلیت کے اخلاقی دیوالیہ پن، ذہنی پس ماندگی اور ان کے آپس کے انسانی تعلقات کی سطحیت کو بڑی سفاکی کے ساتھ موضوع بنایا ہے۔ کھیل کی ہیئت اس قدر انوکھی اور ڈراما نگار کے تخلیقی مقاصد سے اتنی ہم آہنگ ہے کہ اس نے ایک نہایت کامیاب سماجی طنز کی صورت اختیار کر لی ہے۔

وجے تینڈولکر نے کئی فلموں کے اسکرپٹ بھی لکھے ہیں جن میں سے تازہ ترین فلم "سردار" ہے۔

وجے تینڈولکر

خاموش! یہ عدالت ہے

تین ایکٹ کا کھیل

انگریزی سے ترجمہ: انتظار حسین

Scanned with CamScanner

کردار

سامنت

لیلا بیہارے

سکھاٹے

بانورو کڑے

گوپال پونگشے

کارنک

کاشیکر

مسز کاشیکر

Scanned with CamScanner

پہلا ایکٹ

(ایک خالی ہال جس میں دو دروازے ہیں، ایک آنے کے لیے، دوسرا جانے کے لیے۔ دوسرا دروازہ برابر والے ایک کمرے میں کھلتا ہے۔

ہال کے اندر ایک پلیٹ فارم بنا نظر آتا ہے۔ ایک یا دو کرسیاں، ایک پرانا ٹوٹا سا بکس، ایک اسٹول، ایسا ہی کچھ اور سامان ایک طرف ڈھیر ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایک بڑی سی دیواری گھڑی۔ قومی رہنماؤں کی چند گھسی پٹی تصویریں۔ ایک لکڑی کا تختہ جس پر چندہ دینے والوں کے نام لکھے ہیں۔

باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ کوئی شخص دروازہ، جو بند تھا، کھول رہا ہے۔ اندر داخل ہوتا ہے۔ چاروں طرف یوں نظر ڈالتا ہے جیسے پہلی مرتبہ یہ جگہ دیکھ رہا ہے۔ یہ سامنت ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک تالا اور چابی ہے، ہرے کپڑے سے بنایا ہوا ایک توتا اور ایک کتاب۔)

سامنت: (چاروں طرف دیکھتے ہوئے) اچھا یہ جگہ ہے۔ اندر آ جائیں۔ یہ ہے وہ ہال۔ شاید ان لوگوں نے آج یہاں تھوڑی بہت صفائی بھی کر دی ہے۔ سوچا ہوگا کہ شو ہو رہا ہے، تھوڑی صفائی کر دو۔

(مس بیمار سے داخل ہوتی ہے۔ دروازے کے پاس کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک انگلی کی پور اس نے ہونٹوں میں دبا رکھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرس ہے اور ایک ڈبا جس میں کچھ سامان ہے۔)

ارے کیا ہوا؟ انگلی چٹخنی میں آ گئی؟ پرانی چٹخنیوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ آرام سے نہیں لگتیں۔ اور لگنے میں ذرا سی بھی کسر رہ جائے تو پھر یہی ہوتا ہے۔ دانتوں میں دبایئے، آرام آ جائے گا۔ میرے دائیں ہاتھ کی جو یہ انگلی ہے نا، یہ ایک مرتبہ تالے میں پھنس گئی تھی۔ ایسی پھول گئی کہ لگتا تھا نکلی نہیں، یہ بھی لنگوٹ ہے۔ سارا کام چار انگلیوں سے کرتا تھا۔

Scanned with CamScanner

بھارے: کوئی بات نہیں ہے۔ میرے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ ویسے اس وقت مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ سب دوسروں کے ساتھ اسٹیشن پر اتری۔ اور اچانک، کتنے دنوں کے بعد، میں ایک فرحت محسوس کر رہی تھی۔ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

سامنت: وجہ؟

بھارے: پتا نہیں۔ بہرحال تمھارے ساتھ یہاں آتے ہوئے بہت اچھا لگا۔ خوشی سی ہو رہی ہے کہ باقی سب پیچھے رہ گئے اور ہم فراٹے بھرتے ہوئے آگے نکل آئے۔ ہیں نا؟

سامنت: ہاں واقعی۔ مجھے تیز چلنے کی بالکل عادت نہیں ہے۔ مگر آپ اتنے جوش بھرے انداز میں چل رہی تھیں۔ بس اس تیز چال کا مجھ پر بھی اثر ہو گیا۔

بھنارے: ہمیشہ تو میں اتنا تیز نہیں چلتی۔ لیکن آج واقعی میں بہت تیز تیز چلی ہوں۔ بس دل میں کچھ سما گئی کہ ان لوگوں سے آگے نکلو۔ آگے، کہیں دور، بہت دور۔ تمھارے سنگ۔

سامنت: (ٹھٹھا کر) میرے سنگ؟

بھنارے: ہاں۔ تم مجھے اچھے لگتے ہو۔

سامنت: (بالکل ٹھٹھا جاتا ہے) کیا۔۔۔ کیِ۔۔۔ مَیں۔۔۔ میں تو۔۔۔

بھنارے: تم واقعی بہت نفیس آدمی ہو۔ بہت نفیس۔ اور ایک بات اور کہوں۔ تم دل کے بہت اچھے ہو۔ بہت اچھے آدمی ہو۔ مجھے تم بہت اچھے لگتے ہو۔

سامنت: میں؟

بھنارے: ہاں تم۔۔۔ اور ہاں، یہ ہال بھی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔

(ہال کا ایک چکر کاٹتی ہے۔)

سامنت: اچھا؟ یہ ہال بھی؟ پرانا ہال ہے۔ اس بستی میں جب بھی کوئی تقریب ہوتی ہے تو اسی ہال میں کی جاتی ہے۔ تقریریں، استقبالیے، شادیاں۔ اور ہاں، عورتوں کی بھجن منڈلیاں بھی تو ہیں۔ وہ بھی سہ پہر کو یہیں پریکٹس کرتی ہیں۔ آج یہ پروگرام ہے، اس لیے شاید آج بھجن کی پریکٹس نہیں ہو گی۔ ورنہ عورتوں کا کام شام تک کیسے پورا ہو گا۔

بھنارے: تمھاری بیوی بھی تو کسی بھجن منڈلی میں شامل ہے۔

سامنت: غلط۔ میری بیوی نہیں، میری بھابی۔ میری بیوی تو کوئی ہے ہی نہیں۔

بھنارے: (اس کے کپڑے کے توتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پھر یہ کس لیے ہے؟

سامنت: اچھا، آپ کا مطلب یہ توتا؟ یہ میرے بھتیجے کے لیے ہے۔ آپ کو یہ کھلونا پسند آیا؟

بھنارے: ہاں۔

سامنت: میری ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔ کوئی خاص وجہ تو نہیں ہے۔ اصل میں جو کچھ میں کماتا

ہوں اس میں مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ تو بس میری شادی نہیں ہوئی۔ اچھا، آپ کو پتا ہے، یہاں پچھلے دنوں کچھ میجک شو بھی ہوئے تھے۔ ہاتھ کی صفائی، مسمریزم وغیرہ۔

بینارے: تم نے دیکھا تھا؟

سامنت: لیجیے یہ آپ نے کیا بات کہی۔ یہاں جو شو بھی ہوتا ہے میں دیکھتا ہوں۔

بینارے: اچھا؟

سامنت: ہاں اور کیا۔ جو بھی شو ہو دیکھتا ہوں۔ اس بستی میں باقی اور کون سی تفریح ہے۔

بینارے: ہاں یہ تو ہے۔ (بالکل اس کے قریب آجاتی ہے اور سرگوشی کے لہجے میں کہتی ہے) کوئی جادو قریب سے بھی دیکھا ہے؟

سامنت: ہاں کیوں نہیں۔ خیر بہت قریب سے تو نہیں، لیکن اچھاخاصا قریب سے میں نے دیکھا ہے۔ مگر یہ کیوں پوچھ رہی ہیں آپ؟

بینارے: (اسی طرح قریب کھڑے ہوئے) یہ لوگ کیسے کرتے ہیں یہ کام؟ زبان کاٹ دی، اور پھر اسے جوڑ دیا۔ کیسے کرتے ہیں یہ؟

سامنت: (تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے) زبان؟ --- اچھا زبان --- بڑا مشکل ہے بتانا۔

بینارے: لیکن مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔

سامنت: اچھا --- مگر ---

(سرک کر پھر قریب آجاتی ہے۔ جبکہ وہ پھر ذرا پیچھے ہٹ جاتا ہے۔)

بس کچھ اس طرح ہوتا ہے --- کوشش کرتا ہوں --- میرا مطلب --- مشکل ہے --- اچھا دیکھیے جیسے یہ میری زبان ہے (اپنی انگلی کی پور کو اس کی طرف بڑھاتا ہے۔)

بینارے: اچھا، دیکھوں۔

(اس بہانے سے اور قریب آجاتی ہے۔ لے دو لے کے بیہ اسے احساس رہتا ہے کہ اس کے اتنے قریب کھڑی ہے۔ لیکن سامنت کو کوئی ایسا احساس نہیں ہے۔)

سامنت: تو یہ میری زبان ہے۔ جیسے یہ کٹ گئی ہے۔ اب کیا ہونا چاہیے؟ اس سے خون نکلنا چاہیے نا؟ لیکن نہیں نکلتا۔ کیوں نہیں نکلتا؟ مسمریزم میں کوئی ایسی بات ہو گی۔ کوئی چکر تو ہو گا۔ کوئی چال۔ جبھی تو خون نہیں نکلتا۔ کوئی اثر ہوتا ہی نہیں۔ درد ورد بالکل نہیں ہوتا ---

(یہ دیکھ کر کہ اس کے قریب آجانے کا سامنت پر کوئی اثر نہیں ہوتا، وہ ذرا پیچھے ہٹ جاتی ہے۔)

بینارے: یہ لوگ ابھی تک آئے کیوں نہیں؟ یہ چلتے تھوڑا ہی ہیں، رینگتے ہیں۔ آدمی میں کچھ چستی پھرتی ہونی چاہیے۔

سامنت: ہاں تو میں زبان کی بات کر رہا تھا۔ یہ جو مسمریزم ہے۔۔۔

بھنارے: اسکول میں پتا ہے میرے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ ادھر گھنٹی بجی، ادھر میرا قدم دہلیز میں۔ پچھلے آٹھ برسوں میں ایک مرتبہ بھی تو میری سرزنش نہیں ہوئی۔ نہ کبھی ٹیچنگ کے بارے میں کوئی شکایت پیدا ہوئی۔ جو سبق پڑھانے ہوتے ہیں ان میں مجال ہے کبھی پیچھے رہ جاؤں۔ ایکسرسائزوں کی بھی وقت پر چیکنگ کر دیتی ہوں۔ کسی قسم کی شکایت کا میں کبھی موقع ہی نہیں دیتی۔ ذرا کوئی انگلی تو رکھ کے دکھائے۔

سامنت: لگتا ہے بہت پکی استانی ہیں آپ۔

بھنارے: نہیں۔ بس استانی ہوں۔ میں پکی کس طرف سے نظر آتی ہوں؟

سامنت: نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

بھنارے: نہیں، کہہ دو جو کہنا چاہتے ہو۔

سامنت: نہیں۔ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ پکی استانی سے میری مراد یہ تھی کہ جو پڑھاتی ہے، سکھاتی ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے بچوں کو۔

بھنارے: ارے یہ بچے بڑوں سے تو لاکھ درجے اچھے ہوتے ہیں۔ کم از کم انہیں یہ زعم تو نہیں ہوتا کہ وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ اس قسم کا کوئی خناس ان کے اندر سمایا ہوا نہیں ہوتا۔ اور نہ یہ کرتے ہیں کہ پہلے نہیں چرکا لگایا اور پھر بزدلوں کی طرح بھاگ کھڑے ہوئے۔ ارے بھئی، ذرا کھڑکی تو کھولو۔ بہت حبس ہے یہاں۔

(سامنت بڑھ کر کھڑکی کھولتا ہے۔ بھنارے لمبا سانس لیتی ہے۔)

اب ذرا جان میں جان آئی۔

(یک مرتبہ پھر ہوا کا چکر کاٹتی ہے۔)

اچھا وہ زبان والی بات تو بیچ ہی میں رہ گئی۔ یہ جو مسمریزم ہے۔۔۔ (پھر ہنی کی پور آگے کرتا ہے) اب اسے دیکھیے۔ جیسے یہ میری زبان ہے۔ جیسے یہ کٹ گئی ہے۔

بھنارے: نہیں، اس وقت نہیں۔

سامنت: (تابعداری کے انداز میں) اچھا ٹھیک ہے۔

(ہاتھ پیچھے کر لیتا ہے۔ پھر اچانک ایک کرسی اٹھا کر اس کے قریب بچھا دیتا ہے۔)

کب تک کھڑی رہیں گی آپ؟ بیٹھ جائیے۔ کھڑے کھڑے پاؤں دکھنے لگیں گے۔

بھنارے: مجھے تو کھڑے رہنے کی عادت ہے۔ کھڑے ہو کر ہی پڑھاتی ہوں۔ کلاس میں جب تک پڑھاتی رہتی ہوں کبھی نہیں بیٹھتی۔ اسی طرح تو ساری کلاس پر میری نظر رہتی ہے۔ کسی بچے کو شرارت کا موقع ہی نہیں ملتا۔ ساری کلاس مجھ سے تھر تھر کانپتی ہے۔ لیکن وہ مجھے چاہتے بھی بہت

ہیں۔ مجھ پہ جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ میں بھی تو جان مار کر انہیں پڑھاتی ہوں۔ (لہجہ بدل کر) جبھی تو لوگ مجھ سے حسد کرتے ہیں۔ خاص طور پہ استانیاں اور انتظامی اسٹاف والے۔ لیکن وہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ کر کیا سکتے ہیں وہ! انکوائری کرائی جا رہی ہے۔ شوق سے کریں انکوائری۔ میری ٹیچنگ پہ کوئی حرف نہیں رکھ سکتا۔ اس میں اپنی جان کھپائی ہے۔ اتنا کھپایا کہ اپنے آپ کو خاک کر دیا۔ مجھ پہ کوئی تہمت ہی جوڑ دیں گے نا، اور کیا کریں گے۔ تو جوڑ دیں تہمت۔ مجھے نکال دیں گے۔ پھر نکال دیں۔ میں نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ اگر کسی کا بگاڑا ہے تو اپنا ہی بگاڑا ہے۔ اس بنیاد پہ مجھے نکالیں گے؟ یہ لوگ کون ہوتے ہیں یہ کہنے والے کہ یہ کرو یہ مت کرو۔ میری اپنی زندگی ہے۔ میں نے نوکری کے پیچھے زندگی کی تو نیلامی نہیں کی ہے۔ میں جو چاہوں کروں، میری اپنی مرضی ہے۔ اپنا اختیار ہے۔ کسی کو میری مرضی میں دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ جو میں چاہوں گی وہ کروں گی۔ میں خود طے کروں گی کہ۔۔۔

(نادانستہ اس کا ہاتھ اپنے پیٹ پر چلا جاتا ہے۔ مگر اچانک ہی سے کچھ خیال آ جاتا ہے اور وہ ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ سامنت کو دیکھتی ہے اور چپ ہو جاتی ہے۔ دھیرے دھیرے اس کا اعتماد پھر بحال ہو جاتا ہے۔ سامنت سٹپٹایا ہوا نظر آتا ہے۔)

سامنت: (سٹپٹانے انداز میں) میں جاؤں، جا کر دیکھوں کہ یہ لوگ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔

بینا رسے: (جلدی سے) نہیں۔ (آہستہ آہستہ سنبھل جاتی ہے) میں اکیلی ہوتی ہوں تو بہت ڈرتی ہوں۔

سامنت: پھر میں نہیں جاؤں گا۔ آپ کی طبیعت اچھی تو ہے نا؟

بینا رسے: (اچانک سنبھل کر) کیا فضول بات ہے۔ مجھے کیا ہوا ہے؟ کچھ بھی نہیں بہت ٹھیک ہوں۔

(تالی بجاتی ہے اور گنگنانا شروع کر دیتی ہے۔)

وہ لڑکا کتنا پیارا ہے
مرا بستہ لے کر چلتا ہے
مرے سنگ کھیلتا ہے گدگداتا ہے
یہ کہتا ہے تری آنکھوں کا رسیا ہوں
بتاؤں راز کی اک بات جو وہ مجھ سے کہتا ہے
یہ کہتا ہے کروں گا بیاہ میں تم سے
مگر ممی یہ کہتی ہیں
ابھی بچی ہو تم، معصوم ہو، بالی عمریا ہے

Scanned with CamScanner

نہیں یہ عمر شادی کی
(گنگنانا بند کر دیتی ہے۔)
'تمھیں پتا ہے آج ہم کیا کرنے والے ہیں۔ کیوں مسٹر۔۔۔
سامنت: سامنت۔

بینارے: ہاں مسٹر سامنت، تو آج ہم کیا کرنے والے ہیں؟
سامنت: مندر کے قریب ایک اشتہار لگا دیکھا تھا میں نے کہ ترقی پسند تھیٹریکل گروپ کوئی عدالتی ڈراما پیش کرے گا۔ عدالت کا ناٹک۔ آج رات آٹھ بجے۔
بینارے: اس کا مطلب کیا ہے، کچھ تمھاری سمجھ میں آتا ہے؟
سامنت: میری سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ بہرحال عدالت سے کچھ تعلق ہے اس کا۔
بینارے: بالکل ٹھیک۔ اصلی عدالت تو نہیں ہوگی نا، عدالت کا ڈراما رچایا جائے گا۔ عدالتی ناٹک۔
سامنت: دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے کہ عدالت کے نام پر کچھ دل لگی بازی ہوگی۔
بینارے: بالکل ٹھیک۔ دل لگی ہوگی۔ لیکن مسٹر سامنت، ہمارے پروگرام کے اعلیٰ مقاصد میں یہ بات بھی تو شامل ہے کہ روشن خیالی کی ترویج کی جائے۔ ہمارے چیئرمین کاشیکر جی تو یہی کہیں گے۔ کاشیکر جی میں یہی تو صفت ہے کہ کسی اونچے آدرش کے بغیر تو نوالہ بھی نہیں توڑتے۔ سامنے کوئی آدرش ہونا چاہیے۔ ان کے دوش بدوش وہ جھولا جھلانے والی شریمتی جی ہیں۔ میرا مطلب ہے مسز کاشیکر۔ بچاری خالص قسم کی گھریلو عورت ہے۔ وہ جو جھولا جھلانے والی ہیلائیں ہوتی ہیں ویسی۔ مگر کیا فائدہ۔ وہ جو ہمارے آدرش لال ہیں، شریمان آدرش لال، انھوں نے تو عوام کو سدھارنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور گھر میں کوئی جھولا ہے ہی نہیں کہ جھولا جھلانے والی شریمتی اُسے جھلائیں۔
سامنت: آپ کا مطلب ہے کہ ان کے کوئی بچہ۔۔۔
(ایسے کرتا ہے جیسے ہاتھوں میں بچے کو جھلا رہا ہو۔)
بینارے: بالکل ٹھیک۔ سامنت جی، آپ تو بہت ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ اصل میں کاشیکر جی اور ان کی جھولا جھلانے والی پتنی نے یہ سوچا کہ ان کے بجائیں بجائیں کرتے گھر میں کچھ تو ہونا ہی چاہیے۔ کم از کم انھیں بوریت کی موت نہیں مرنا چاہیے۔ تو انھوں نے ایک نوخیز صاحبزادے کو اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا۔ اسے پڑھایا لکھایا۔ اسے خوب پڑھایا بھی۔ اچھا خاصا غلام بنا کے رکھ دیا۔ اس کا نام ہے بالو۔۔ بالو روکڑے۔ یہ بالو میاں ہمارے ماہرِ قانون ہیں۔ ایسے ماہر ہیں کہ جس موکل کو کوئی وکیل گھاس نہ ڈالے وہ بھی شاید ان موصوف سے رجوع کرنے کی نہیں سوچے گا۔ بیرسٹر روم میں بیٹھے لاکھوں سے مکھیوں پر ضرب کاری لگاتے رہتے ہیں۔ گھر میں

بیٹھ کر بھی موصوف یہی کرتے ہیں۔ بس مکھیاں مارتے رہتے ہیں۔ لیکن آج کے ناٹک کے حساب سے یہ حضرت بہت بڑے بیرسٹر ہیں۔ دیکھنا کیا کمالات دکھاتے ہیں۔ اور یک صاحب ہیں مسٹر پونڈ۔ (منھ میں جیسے پائپ لگا ہو۔ لمبا سا پونڈ۔) بڑے بقراط ہیں۔ سائنس داں سمجھے جاتے ہیں۔ تعلیم کے نام انٹر فیل ہیں۔

سامنت: اچھا۔ پھر تو بہت لطف رہے گا۔

پونارے: ایک دانشور صاحب بھی ہیں۔ سر سے پیر تک انٹلکچوئل۔ انھیں یہ زعم ہے کہ انھوں نے کتابیں بہت پڑھ رکھی ہیں۔ ضرور پڑھی ہوں گی۔ لیکن جب زندگی میں کسی مسئلے سے دوچار ہوتے ہیں تو بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اور منھ چھپاتے پھرتے ہیں۔ وہ آج تو یہاں نہیں ہوں گے۔ آئیں گے بھی نہیں۔ ہمت ہو تو آئیں۔

سامنت: لیکن آج کا مقدمہ ہے کس بارے میں؟

پونارے: صدر جانسن کے خلاف مقدمہ لڑا جائے گا۔ الزام یہ ہے کہ انھوں نے ایٹمی ہتھیاروں کو فروغ دیا۔

سامنت: ہے رام!

پونارے: اے لو وہ آ گئے۔ (سے یک خیال سوجھتا ہے۔) ادھر آؤ۔ چھپ جاؤ۔ میں بھی تمھارے ساتھ چھپتی ہوں۔ ذرا کا عدسے سے چھپو۔ اچھا اب ان سے کہو کہ اندر آ جائیں۔

(سامنت اور پونارے اس دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں جو باہر کی طرف کھلتا ہے۔ ان کے جسم ایک دوسرے کو چھو رہے ہیں۔ کچھ اس قسم کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں: "بھئی یہ ہے وہ جگہ۔۔۔۔ آخر منزل پہ پہنچ ہی گئے۔۔۔" اس قسم کے فقرے کہتے ہوئے ایک ٹولی داخل ہوتی ہے۔ ان میں ایک تو سکھاتمے وکیل ہے۔ دوسرا سائنس کا طالب علم پونکشے ہے۔ تیسرا بالو روکڑے ہے جو اس عدالتی ناٹک کا کارکن ہے۔ یہ سب سامان سے لدے ہوئے ہیں۔ سامان میں دو تین سوٹ کیس ہیں، دو بیگ ہیں، ایک بیٹری سے آپریٹ ہونے والا مائیکروفون سوٹ ہے، اور اسی قسم کا دوسرا سامان۔ پیچھے پیچھے یک ملازم لکڑی کے دو کٹہرے سر پہ لادے داخل ہوتا ہے۔ یک ملزم کا کٹہرا اور دوسرا گواہوں کا۔ جیسے ہی یہ لوگ داخل ہوتے ہیں، پونارے اور سامنت دروازے کے پیچھے سے لپک کر آتے ہیں۔ پونارے ڈرانے کی نیت سے آواز نکالتی ہے: ہو! "سب لوگ بھر کے لیے ٹھٹھک جاتے ہیں۔ پھر جلدی سے سنبھل جاتے ہیں۔ پونارے ہنستی گاتی ہے۔ سامنت شوق اور حیرت سے یہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ سکھاتمے کے منھ میں بیڑی ہے۔ پونکشے نے منھ میں پائپ دبا رکھا ہے۔)

Scanned with CamScanner

بالو: (سامان ایک طرف رکھ کر) مس بینارے، یہ تو سوچا ہوتا کہ ان غریبوں کے سر پہ سامان لدا ہوا ہے۔ اگر میرے سر سے یہ سامان گر جاتا تو سیدھا میری جان کو آجاتیں۔ کرے کوئی، ڈانٹ ہمیشہ مجھ پہ پڑتی ہے۔ انھوں نے میری تعلیم کا انتظام کیا تھا۔ بس اسی کی سزا بھگت رہا ہوں۔

(ملازم سامان اٹھا کر ایک طرف رکھتا ہے۔ پونکشے اس کی اُجرت ادا کرتا ہے۔ وہ چلا جاتا ہے۔)

پونکشے: (سونے فریم والی عینک کو اتارتے ہوئے) اُف! یہاں ——— کہاں ہے؟ کدھر ہے؟

(یہ کہتا ہوا دروازے سے نکل کر اندر کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

سکھاتمے: (بیڑی کا ٹکڑا کش لے کر) مس بینارے، تم کبھی بالغ بھی ہو گی؟ شاید تم بالغ ہونا ہی نہیں چاہتیں۔

بینارے: دیکھیے سکھاتمے جی، میں جب کلاس میں ہوتی ہوں تو سخت سنجیدہ ہوتی ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ہر وقت آدمی کیوں سنجیدہ بنا رہے۔ کیوں ہر وقت اپنے اوپر یبوست طاری رکھے۔ جیسے یہ پونکشے جی ہیں۔ ارے بھئی، ہنسو کھیلو، گاؤ بجاؤ۔ بلکہ ناچو گاؤ۔ ایک جھوٹی قسم کی ثقاہت اپنے اوپر لادے رہنا، یہ کوئی بھی بات تو نہیں ہے۔ ارے یہ جیون جینے کے لیے ہے۔ اگر آپ کی زندگی ختم ہو گئی تو کوئی اپنی زندگی میں سے ٹکڑا نوالہ نکال کر دے دے گا؟ کیا خیال ہے آپ کا؟ سامنت جی، کیا خیال ہے جناب کا؟ کوئی اپنی زندگی میں سے رتی دو رتی جیون آپ کو دے سکتا ہے؟

سامنت: آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ تکارام نے کہا تھا ——— ہاں، شاید یہ تکارام جی کا قول ہے ———

بینارے: میں کہتی ہوں بھول جائیے تکارام کو۔ یہ میں کہہ رہی ہوں، میں، بینارے، ایک جیتی جاگتی ناری۔ میرا اپنا تجربہ ہے۔ اس تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں۔ میری آپ کی زندگی میرے آپ کے لیے ہے، کسی دوسرے کے لیے نہیں ہے۔ تمھاری زندگی تمھاری ہے، تمھاری اپنی۔ یہ سمجھنے کی بات ہے۔ اس کا ہر لمحہ، ہر گھڑی، ہر آن بہت قیمتی ہے۔

سکھاتمے: (تالی بجا کر) بہتر بہتر!

(پونکشے داخل ہوتا ہے۔)

بینارے: میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟ (پونکشے کی طرف اشارہ کر کے) اُدھر دیکھیے۔ (ہنسی روکنے کی کوشش کرتی ہے)

پونکشے: (سٹپٹا کر) کیا بات ہے؟

بینارے: پونکشے، بچی بچی بتاؤ۔ کہاں گئے تھے؟ یہی دیکھنے گئے تھے نا کہ باتھ روم کدھر ہے۔ یعنی شو سے پہلے جو تم نروس ہوتے ہو اس کے علاج کا انتظام۔

Scanned with CamScanner

سکھ تے: مس بینارے، تم کچھ بھی کہو، واقعہ یہ ہے کہ شو کے دوران پنا پونکشے بہت اعتماد کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ایک سائنس داں، گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا۔ منہ میں پائپ۔ بہت امپریس کرتا ہے۔ اُس وقت اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ حضرت انٹر سائنس میں ایک دفعہ فیل ہو چکے ہیں۔ دوسری دفعہ میں پاس کیا ہے۔ یا یہ کہ شریمان جی سنٹرل ٹیلیگراف آفس میں کلرکی کرتے ہیں۔

(بالو بہت ضبط کرتا ہے، مگر ہنسی نکل جاتی ہے۔)

پونکشے: (چڑ کر) بالو جی، ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کسی کی خیرات پر نہیں پڑھا ہوں۔ انٹر سائنس میں اگر ایک دفعہ فیل ہو گیا تو کیا ہوا۔ میرے باپ کی کمائی تھی۔ اس سے پڑھا ہوں۔

بینارے: کیا فضول بات ہے! (یہ کہہ کر فوراً اپنے رنگ پر آ جاتی ہے۔ ہنس کر) آپ لوگوں کو ایک دلچسپ بات بتاؤں۔ جب میں بچی تھی تو بہت خاموش رہتی تھی۔ بس چپ چاپ بیٹھ جاتی اور دل ہی دل میں منصوبے بناتی رہتی۔ کسی کو نہیں بتاتی تھی۔ مگر ذرا کوئی بات ہوئی اور میں نے رونا شروع کر دیا۔ دہاڑیں مار مار کر روتی تھی۔

پونکشے: یعنی اب جو تم ہو اُس وقت اس کے بالکل اُلٹ تھیں؟

بینارے: ہاں بالکل، بالکل۔ سامنت، تمہیں پتا ہے۔۔۔

سامنت: (مستعدی سے) ہاں بالکل۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ شاید ایسا ہے۔۔۔

بینارے: اسکول کے پہلے دن پتا ہے میں کیا کرتی تھی۔ جو کتابیں میرے پاس ہوتی تھیں ان میں سے ہر کتاب پر کور چڑھاتی تھی۔ کتاب کے پہلے صفحے پر ننھے ننھے حرفوں میں بنا بنا کر لکھتی۔ ساتھ میں پھول پتیاں بھی بناتی جاتی۔ ور لکھتی کیا تھی؟

گھاس ہری اور لال گلاب
میری کتیبا رہے گی میری
مرتے دم تک

مرتے دم تک! اور پتا ہے کیا ہوا؟

سامنت: کیا ہوا؟

بینارے: ایک ایک کر کے سب کتابیں پھٹ گئیں اور گم گئیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئیں۔ لیکن میں ابھی تک موجود ہوں۔ میں نہیں مری۔ نہیں مری۔ گھاس ابھی تک ہری ہے۔ گلاب آج بھی سرخ ہے۔ لیکن میں نہیں مری ہوں۔ (پھر ہنسنے لگتی ہے۔)

بالو: (تھیلے میں سے نوٹ بک نکال کر لکھنے لگتا ہے۔) خوب۔ گھاس ہری ہے، لال۔۔۔ گلاب۔۔۔ ہے۔ آگے کیا ہے؟

بونارے: بانو میاں، یہ بُری عادت ہے۔ میں کلاس میں بچوں کو ہمیشہ ہی سمجھاتی ہوں کہ یہ مت کیا کرو کہ بات پوری سنی نہیں، کچھ سنی کچھ نہیں سنی، اور لکھنے بیٹھ گئیں۔ پہلے سنو، جو سنا ہے وہ دُہراؤ۔ آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سناؤ، اپنے اندر اتارو۔ اس طرح اتارو کہ وہ تمھارے خون میں گھل مل جائے۔ پھر وہ بات تمھارے حافظے سے نہیں اترے گی۔ کوئی دوسرا اسے چھین نہیں پائے گا۔

سامنت: ہمارے ماسٹر جی بھی یہی بات کہتے تھے۔ وہ ہمیں شعر اسی طرح پڑھاتے تھے۔ ہاں یہ جو خون میں گھلنے ملنے والی بات ہے، یہ نہیں کہتے تھے۔

سکھانے: مس بونارے، بیان جاری رہے۔

بونارے: بچو، بیٹھ جاؤ۔ کہانی سنو گے؟ اگلے زمانے کی بات ہے کہ ایک بھیڑیا تھا۔۔۔

بانو: (جلدی سے دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے) ہاں مس، کہانی سنائیے۔ سکھانے جی، بیٹھ جائیے۔ پونکشے، بیٹھ جاؤ۔

(پونکشے چڑچڑا نظر آتا ہے۔ باہر نکل جاتا ہے۔)

بونارے: نہیں، کہانی نہیں۔ نظم سناؤں گی۔

مسافر ہیں انجانی راہوں کے ہم
وہ راہیں جو جو کھم بھری ہیں
وہ ساحل سے ٹکراتی پُرشور موجیں
اندھیرا اُجالے میں گھل مل رہا ہے
جلی انگلیوں سے نکلتی شعاعیں
شعاعوں سے روشن ہیں تاریک راہیں
ہر اک شے منور نظر آ رہی ہے
مگر زخم یہ انگلیوں کے
خون میں تر بتر انگلیاں
عجب معرکہ ہے
ہم تو پہلے ہی ہارے ہوئے ہیں
جنگ ایسی بھی ہوتی ہے
کہ لڑتے ہیں ہم ہارنے کے لیے

(چپ ہو جاتی ہے۔ سب واہ واہ کرتے اور تالیاں بجاتے ہیں۔)

سامنت: کہ لڑتے ہیں ہم ہارنے کے لیے (جھومتا ہے جیسے کیفیت میں ہو) مسافر ہیں انجانی راہوں کے ہم۔ واہ!

(تجرباتی تھیٹر کا ایک ایکٹر جو کارنک کہلاتا ہے، داخل ہوتا ہے۔ منہ میں اس کے پان ہے۔)

کارنک: (پان چباتے ہوئے) چلو ٹھکانے پہ آن پہنچے۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ رستا بھول گیا ہوں۔ (یہاں موجود لوگوں کو دیکھ کر) یہ کیا ہو رہا ہے؟

بالو: اُف۔ ستیاناس کر دیا۔

سکھاتمے: بینارے گا رہی تھی۔ واہ وا، بیچارے بی بی، تم نے کمال کر دیا۔

(بینارے زبان نکال کر، یہ دکھاتی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ سمجھتی ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ہنسنا شروع کر دیتی ہے۔ کارنک ہال کا غور سے جائزہ لے رہا ہے۔ بالو کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سکھاتمے: (وکیلوں والے بند آہنگ بیچ میں) کارنک جی، توجہ چاہتا ہوں۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں کہ اس وقت آپ کے دل و دماغ میں کون سا خیال چکر رہا ہے۔ آپ سوچ رہے ہیں کہ یہ ہال انٹی میٹ تھیٹر کے لیے بہت موزوں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں آپ کے اُن ڈراموں کے لیے جنہیں دیکھنے والے اتنے ہوتے ہیں کہ انگلیوں پہ گن لو۔ اور وہ ایسے ہوتے ہیں کہ ڈراما اِن کے سر پر سے گزر جاتا ہے۔ بتائیے، ایسا ہی سوچ رہے تھے نا؟

کارنک: (اطمینان سے پان چباتا رہتا ہے) نہیں۔ میں دل میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ ہال تو ایسا ہے کہ یہاں سچ مچ کی عدالت بھی لگے تو عدالت والے بیچارے شرمندہ ہی ہوں گے۔

بینارے: خوب، خوب۔ آج رات یہاں عدالت کا نٹک لگے گا۔ بس آپ سمجھ لیں کہ نقل اصل بن جائے گی۔ اصلی عدالت نظر آئے گی۔

بالو: مگر مسز کاشیکر کہاں ہیں؟

کارنک: (پان چباتے ہوئے) فکر نہ کیجیے۔ آ رہی ہیں۔ وہ لوگ رستے میں رک گئے تھے۔ کاشیکر جی شریمتی جی کے لیے پھولوں کا گجرا خریدنا چاہتے تھے۔ میں تو پان لے کر وہاں سے چھوٹ لیا۔ بالو میاں، مائیک کی بیٹریاں تو ٹھیک ہیں نا؟ چاہو تو ذرا ٹیسٹنگ کر لو۔ یہ نہ ہو کہ اس وقت کوئی گڑبڑ ہو جائے۔ عین وقت پہ گڑبڑ ہو جائے تو پھر بہت خرابی ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر آخری وقت میں کمبخت کچھ نہ کچھ ہو ہی جاتا ہے۔ پچھلے مہینے یہ ہوا کہ شو چل رہا تھا کہ فیوز اڑ گیا۔ بتی غائب۔ اُس وقت میں سٹیج پہ تھا۔ چھوٹا سا رول تھا۔ بہرحال، کھیل تو چل رہا تھا۔ خیر، میں جیسے تیسے رول کو نبھا لے گیا۔

بالو: خیر وہ کون سا ایسا بھاری کھیل تھا۔

کارنک: جیسا بھی تھا، آخر کھیل تھا۔ موڈ جو بنا ہوا تھا وہ ختم ہو گیا۔

Scanned with CamScanner

بینارے: (جماہی لیتی ہے۔ ہر شرت کے لہجے میں) روز صبح ہی صبح اٹھنا پڑتا ہے۔ صبح کا سیشن، پھر شام کا سیشن۔ پھر شام کو ٹیوشن کے لیے بھی جانا پڑتا ہے۔ (رک کر۔ معنی خیز انداز میں) یہ جو کاشیکر جی اور مسز کاشیکر ہیں، ان کے بارے میں آپ لوگوں نے ایک بات نوٹ کی؟

بالو: (نادانستہ) کیا؟

پونکشے: (داخل ہوتے ہوئے) اچھا؟ کیا؟

سکھاتمے: میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں۔ لیکن نہیں، نہیں بتاؤں گا۔ بینارے، پہلے تم خود بتاؤ۔ ہیں نا؟ بتاؤ۔

بینارے: سکھاتمے جی، آپ کو خاک پتا نہیں ہے۔ یہ وکیلوں والے طریقے مت جھاڑیے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ویسے تو اپنے کاشیکر جی بڑے سوشل ورکر بنتے ہیں، اور شریمتی جی کا معاملہ یہ ہے کہ پڑھی لکھی تو ہیں نہیں۔ مگر خیر، ذہانت الگ چیز ہے، پڑھنے لکھنے سے اس کا ایسا تعلق نہیں ہے۔ تو مسز کاشیکر یوں پڑھی لکھی بی بی ہیں ہیں، لیکن پکی بات ہے، دونوں ہیں زندہ دل۔ کاشیکر جی شریمتی جی کے لیے کس شوق سے گجرے خریدتے ہیں۔ اور شریمتی جی کاشیکر جی کے لیے ریڈی میڈ شرٹیں خریدتی نظر آتی ہیں۔ کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہیں نا؟

(کارنک عقب کی کھڑکی کے پاس جا کر اُدھر پان کی پیک تھوکتا ہے۔ پھر واپس آ کر۔)

کارنک: میاں بیوی جب دوسروں کے سامنے آپس میں اس طرح الفت کا مظاہرہ کر رہے ہوں تو میرا ماتھا ٹھنکتا ہے۔ شک سا ہوتا ہے کہ یہ دکھاوا ہے۔ معاملہ کچھ اور ہے۔

بالو: (غصے سے آپ لوگوں نے یہاں بھی تھیٹر کرنا شروع کر دیا!

کارنک: بالو میاں، جو بات تمھاری سمجھ سے باہر ہو اس میں دخل دینا کیا ضرور ہے۔ میاں، تم ابھی بچے ہو۔ بس اپنے کالج کے کام سے لگے رہو۔ مجھے دیکھو، میں تو کبھی اپنی پتنی کے لیے گجرے وجرے نہیں خریدتا۔ اگر کبھی خیال آ بھی جائے تو فوراً ہی اس خیال کو رفع دفع کر دیتا ہوں۔

(بینارے کھنکارتی ہے۔ بینارے کی طرف دیکھ کر۔)

کیا بات ہے؟

بینارے: اگر میں تمھاری جگہ ہوتی تو روز بی بی کے لیے گجرے خریدا کرتی۔

سکھاتمے: اچھا اگر یہ بات ہے تو پھر اپنے شوہرِ نامدار کے لیے شرٹیں خریدنا شروع کر دو۔ جانے وہ کون خوش نصیب ہوگا۔ لیکن جتنی تم چلتی پرزہ ہو، اگر وہ اس سے آدھا بھی ایسا ہوا تو سمجھ لو دونوں ہی کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔

بینارے: جناب آپ کیوں شہر کے اندیشے میں دبلے ہو رہے ہیں؟ (اچانک اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے

Scanned with CamScanner

سامنت پر نظر ڈالتی ہے) ارے یہاں کچھ کرسیاں ہونی چاہییں۔ اے مسٹر، کیا نام ہے تمھارا؟

سامنت: کرسیاں --- اچھا، میرا نام۔ سامنت۔ جی میرا نام سامنت ہے۔ (اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے) دیکھتا ہوں۔

(نکل جاتا ہے۔)

پونکشے: اندر ہیں۔ فولڈنگ چیئرز۔ اس وقت اگر چائے مل جاتی۔

سکھاتمے: اسٹیشن پر چائے مل رہی تھی۔ اُس وقت تم نے انکار کر دیا۔

پونکشے: اُس وقت جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اصل میں آپ لوگ جس طرح پہلے سے ہر بات کی منصوبہ بندی کرتے ہیں میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ اب آپ جو کچھ بھی کہیں۔ مجھ لیجیے کہ آج کی زندگی کا طور یہی ہے۔ اس سائنٹفک زمانے میں ہر چیز تنت وقت پر، یوں (چٹکی بجا کر) چٹکیوں میں ملنی چاہیے۔ اسی میں تو لطف ہے۔

(اسی آن سامنت پچھلے کمرے سے برآمد ہوتا ہے اور دروازے میں آن کھڑا ہوتا ہے۔ دونوں بغلوں میں فولڈنگ چیئرز ہیں۔)

سامنت: (کرسیاں بچھاتے ہوئے) اگر ضرورت ہو تو اور بھی ہیں۔ اندر پڑی ہیں۔

(سب کے سب کرسیاں کھول کر بیٹھنے لگتے ہیں۔ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ پونکشے اسی طرح منہ میں پائپ دبائے کھڑا ہے۔ سامنت پونکشے کے صاحبوں والے موڈ سے مرعوب نظر آرہا ہے۔)

سامنت: صاحب، تشریف رکھیے۔

پونکشے: (صاحب کے خطاب پر خوش ہوتا ہے) شکریہ۔ ٹرین میں اتنا بیٹھ کر آرہا ہوں۔ مسٹر، تمھارا نام کیا ہے؟

سامنت: سامنت۔ سر، میں اسی بستی کا رہنے والا ہوں۔

پونکشے: گڈ! اچھا یہ بتاؤ، چائے مل سکتی ہے؟

سامنت: چائے؟ سر، بالکل مل سکتی ہے۔ لیکن ذرا چینی کی پرابلم ہوگی۔ آج کل چینی مل نہیں رہی۔ گڑ سے کام چل سکتا ہے؟

پونکشے: گڑ؟ نہیں مسٹر سامنت، شاید تم نہیں جانتے کہ چائے میں گڑ پڑ کر زہر بن جاتا ہے۔

سامنت: لیکن ہمارے گھر میں بڑے تو گڑ ہی استعمال کرتے ہیں۔ چینی تو راشن میں، اتنی تھوڑی ملتی ہے کہ ہمارے بھائی صاحب کے بچوں کے لیے بھی پوری نہیں پڑتی۔ وہ چینی کے بغیر چائے نہیں پیتے۔ پھر ایسے میں کیا ہو سکتا ہے؟

پونکشے: (منہ میں پائپ) ہوں!

Scanned with CamScanner

بینارے: (اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے) ابھی! ڈرگ کی ایک جون صاحب تھے۔ ان کی جاننے والی ایک لڑکی تھی ابھی۔

پونکشے: مس بینارے جی، بس کیجیے۔ یہ بچکانہ حرکت بند کریں۔

(سامنت ابھی اسی طرح کھڑا ہے۔ کاشیکر اور مسز کاشیکر داخل ہوتے ہیں۔)

مسز کاشیکر: (اپنے جوڑے میں پنے ہوئے گجرے کو تھوڑا سا سونگھتے ہوئے) دیکھو سب لوگ یہاں آئے بیٹھے ہیں۔

سکھاتمے: کاشیکر جی، تشریف لائیے۔ گجروں کی خریداری کیسی رہی؟

(بینارے سامنت کو اشارے سے بتا رہی ہے کہ یہ ہیں وہ لوگ۔)

بالو: (قریب آتے ہوئے) جی، کیسی رہی؟

مسز کاشیکر: بالو، تم سب سامان لے آئے ہو؟

بالو: جی بالکل۔

مسز کاشیکر: ہر دفعہ تم یہی کہتے ہو کہ سب سامان آ گیا ہے، اور ہر دفعہ یہی ہوتا ہے کہ تم کچھ نہ کچھ بھول آتے ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ حاجب کا عصا بھی آیا ہے؟ صرف سر ہلانے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے دکھاؤ کہاں ہے۔

بالو: (عصا لا کر دکھاتا ہے) یہ رہا۔ ساتھ میں وردی بھی آ گئی ہے۔ بس کبھی کبھی کوئی چیز آنے سے رہ جاتی ہے۔ ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا۔

کاشیکر: ہمیشہ ہی ایسا ہو تو کوئی ایسی بات نہیں ہے، لیکن کم از کم آج ہر چیز اپنی جگہ پر ہونی چاہیے۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ جج کی وگ؟ لائے ہو؟

بالو: اسے تو میں نے سب سے پہلے سنبھلوایا تھا۔

(بالو چپ ہو کر آتا ہے۔)

کاشیکر: اور آپ سکھاتمے جی، آپ وکیلوں والا گاؤن لے کر آئے ہیں؟

سکھاتمے: (جھک کر جیسے عدالت میں ہو) جی ہاں، جناب والا۔ گاؤن کو تو خواب میں بھی ہوں تو یاد رکھتا ہوں۔ پونکشے، تم گاؤن لائے ہو؟

پونکشے: جی، میں تو پوری طرح تیار ہو کر آتا ہوں۔ میں تو کوئی چیز بھولتا ہی نہیں۔ ویسے آپ جانتے ہی ہیں کہ میں تھوڑا نروس ہو جاتا ہوں۔ اگر میرا پائپ میرے پاس نہ ہو تو پھر گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر مجھے کوئی بات یاد نہیں آئے گی۔

مسز کاشیکر: آج جو تمہیں بولنا ہے اس کی میں تمہیں تھوڑی سی ریہرسل کراؤں گی۔

پونکشے: کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یاد ہے۔

مسز کاشیکر: (اپنے جوڑے میں گجرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) بینارے، میں نے سوچا تھا کہ تمھارے لیے بھی ایک گجرا خریدتی لے چلوں۔

بینارے: (چونکنے کے لیے میں) اونہوں!

(چونکنے سے واقف ہوتا ہے۔)

مسز کاشیکر: (کاشیکر سے) کیوں کاشیکر جی، میں کہہ رہی تھی نا؟ لیکن پھر ہم خریدتے خریدتے رہ ہی گئے۔ کیا بات ہوئی تھی؟

بینارے: (قہقہہ لگا کر) ہوا یہ کہ گجرا اڑ گیا۔ اڑنچھو ہو گیا۔ (لہجہ بدل کر) جی دیکھیے، مجھے بالوں گجروں کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر شوق ہوتا تو میں خود خرید لیتی۔ اتنی تو مجھ میں استطاعت ہے۔ خرید سکتی ہوں۔ آپ جانتی ہی ہیں کہ میں کچھ کماؤ دھما لیتی ہوں۔ اسی لیے تو کبھی گجرے وجرے خریدنے کا خیال نہیں آتا۔

(مسز کاشیکر کچھ کھانے پینے کی چیزیں لے کر آتی ہے۔ بینارے ان کو سب لوگوں میں بانٹتی ہے۔)

مسز کاشیکر: بی بی، تمھارا اسکول کیا کہتا ہے؟ میرا مطلب ہے اپنے بارے میں؟

بینارے: (خاموش ہو کر) میرا اسکول کچھ نہیں کہتا۔ خاموش ہے۔

کاشیکر: جج والی کرسی سمجھ میں نہیں آرہا کہ کہاں رکھیں۔ اس طرف یا اُس طرف۔

کارنک: یہاں رکھیے۔ انٹرنس اُدھر سے ہے نا۔ برابر والا کمرہ جج کے لیے ٹھیک رہے گا۔ آپ وہاں سے داخل ہو سکتے ہیں۔ صدر جانس یہاں کھڑا ہو گا۔ (خود کھڑے ہو کر) اس طرح۔

سامنت: (حیرت سے) صدر جانس؟

کاشیکر: نہیں نہیں۔ جانس کے کھڑے ہونے کے لیے جگہ وہاں ہونی چاہیے۔ تو جب میں جج کی حیثیت سے بولوں گا۔۔۔

کارنک: میری رائے مختلف ہے۔ اگر آڈینس کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو جگہ یہ ہونی چاہیے۔ بالکل اس جگہ۔

سکھاتمے: کارنک جی، مجھے تو آپ کے خلاف فردِ جرم لگانی پڑے گی۔ آپ آڈینس کے نقطۂ نظر سے چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ حد ہو گئی! آپ تو ماڈرن تھیٹر کے آدمی ہیں۔ (وکیلوں والی ہنسی۔)

کارنک: پھر وہی ماڈرن تھیٹر کی بات آ گئی۔ کوئی صاحب مہربانی کر کے بتائیں گے کہ ماڈرن تھیٹر کو سخر سمجھا کیا جا رہا ہے؟ مجھے تو جو بات صحیح نظر آتی ہے وہ کرتا ہوں۔ میری بلا سے وہ ماڈرن ہے یا ماڈرن نہیں ہے۔

(بحث شروع ہو جاتی ہے۔)

Scanned with CamScanner

سامنت: (بالو کو روک کر) یہ صدر جانسن کا کیا چکر ہے؟

بالو: (جو اپنے خیالوں میں کھویا ہو ہے) کون؟

سامنت: یہ لوگ ابھی صدر جانسن کی یا کوئی ایسی ہی بات کر رہے تھے۔

بالو: اچھا!

سامنت: آپ کا کیا مطلب ہے؟ صدر جانسن یہاں آئے گا؟ واقعی؟ یقین تو نہیں آتا۔ پھر یہ کیا چکر ہے؟

بالو: اصلی صدر جانسن نہیں۔ یہ جو کارنک جی ہیں نا، یہ صدر جانسن بن کر تشریف فرما ہوں گے۔

(بالو کی روش اس وقت ستائی سے جیسے بدلا لینے پر تلا ہو۔)

سامنت: صدر جانسن!

بالو: (اچانک اسے یک خیال آتا ہے۔ مسز کاشیکر سے) پروفیسر داملے ابھی تک نہیں آئے؟

(بینارے، جو ابھی تک مسز کاشیکر سے باتیں کر رہی تھی، اچانک خاموش ہو جاتی ہے۔
پھر نادانستہ پونکشے کے قریب ہوتی ہے اور ایسے باتیں کرتی ہے جیسے کوشش کرکے
بات کر رہی ہو۔ پونکشے خاموش رہتا ہے۔)

مسز کاشیکر: وہ حضرت حسب عادت دیر سے آئیں گے۔ مجھ سے فون پر کہا تھا کہ آپ کی گاڑی تو میں نہیں پکڑ پاؤں گا۔ پروفیسر کو اصل میں یونیورسٹی میں کوئی مصروفیت ہے۔ شاید کوئی سمپوزیم ہے۔ میں نے دو مرتبہ اسے یاددہانی کرائی تھی۔ بینارے، تمھاری اس سے ملاقات ہوئی تھی؟

بینارے: (پونکشے سے باتیں کرتے کرتے) کس سے؟

مسز کاشیکر: پروفیسر داملے سے۔

بینارے: نہیں۔ میری ملاقات نہیں ہوئی۔

(پھر پونکشے سے باتیں کرنے لگتی ہے۔ پونکشے کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں
ہو رہا۔)

بالو: (سامنت سے بات کرنے کے بعد مسز کاشیکر سے مخاطب ہوتا ہے) لیکن بیگم صاحب، سامنت جی بتا رہے ہیں کہ اس کے بعد نو بجے رات تک کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔ پھر کیسے ہوگا؟ اس وقت تک تو بہت دیر ہو جائے گی۔

پونکشے: ہاں مس بینارے، آپ کیا کہہ رہی تھیں؟ اس کے بعد آپ کے دوست کا کیا بنا؟ اور وہ لڑکی جو بیچاری مشکل میں پھنس گئی تھی اور جس سے آپ میری شادی کرانا چاہتی تھیں؟

(بینارے شپٹاتی ہوئی سامنت کے پاس جاتی ہے۔)

مسز کاشیکر: اس درمیان میں بھی کوئی گاڑی آتی تھی۔ (کاشیکر سے) جان، بالو کہہ رہا ہے کہ اس

Scanned with CamScanner

درمیان میں کوئی گاڑی نہیں آتی۔

کاشیکر: (جو کارنک سے بحث میں مصروف تھا) کس درمیان میں؟

بالو: سامنت جی کہہ رہے ہیں کہ شو سے پہلے کوئی گاڑی نہیں آ رہی۔

سکھاتمے: اس کے بعد شاید ایک گاڑی کو آنا ہے۔ بس ٹھیک ہے۔

کاشیکر: لیکن سکھاتمے جی، پروفیسر والے یہاں وقت پہ تو نہیں پہنچ سکتے۔ آنے بھی تو لیٹ آئیں گے۔ اس درمیان میں کوئی گاڑی نہیں آئے گی۔

کارنک: میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ پروفیسر آنے گا نہیں۔ وہ تو بہت حساب کتاب کا آدمی ہے۔ اس سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تم لیٹ ہو جاؤ گے تو وہ پروگرام منسوخ کر کے اطمینان سے گھر بیٹھ جائے گا۔

بالو: (پریشان نظر آ رہے) بیگم صاحب، میں نے تو قاعدے کے مطابق ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر انھیں اطلاع دے دی تھی۔ جس طرح دوسروں کو پوسٹ کارڈ ڈالا انھیں بھی ایک ڈال دیا۔ تو اس میں میری کوئی خطا نہیں ہے۔ میں نے یہاں کا پتا بھی لکھ دیا تھا۔

سکھاتمے: اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ ایسا کون سا سنگین مسئلہ ہے یہ۔

کاشیکر: پریشان کیسے نہ ہوں۔ ہمیں لوگوں کو جواب دینا ہوتا ہے۔ کھیل کرنا کوئی ہنسی ٹھٹھا تو نہیں ہے۔

پونکشے: (قریب آ کر) ہوا کیا؟

مسز کاشیکر: (سکھاتمے سے) اب ملزم کی طرف سے وکیل کا رول کون کرے گا؟

سکھاتمے: آپ مطلق فکر نہ کریں۔ کم از کم آج تو میں ہی یہ رول کر دوں گا۔ وکیل استغاثہ کے ساتھ ساتھ یہ رول بھی کر ڈالوں گا۔ بھلا یہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ ہے۔ جناب والا، میری تو گھٹی میں وکالت پڑی ہوئی ہے۔ تو کاشیکر جی، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیں۔

کارنک: ٹھیک ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس میں زیادہ ڈرامائیت ہے۔

پونکشے: یقیناً۔

بینارے: (نقل اتارتے ہوئے) یقیناً۔

(پونکشے اسے غصے سے دیکھتا ہے۔)

بالو: (ہاتھ میں جو مسودہ ہے اسے دیکھتے ہوئے) اور چوتھے گواہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بھی نہیں آیا ہے۔ ہم نے طے کیا تھا کہ کسی مقامی آدمی سے یہ رول کرائیں گے۔ (مسز کاشیکر پر نظر پڑتی ہے۔ بات بدل کر) میرا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ۔۔۔

سکھاتمے: صحیح ہے۔ کوئی مقامی آدمی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ۔۔۔

Scanned with CamScanner

بالو: (سنت کر کے بولتا ہے) اگر آپ لوگ اجازت دیں تو آج کے شو میں یہ پارٹ میں ادا کر دوں۔ میرا رول تو چھوٹا ہی سا ہے۔ اسے تو کوئی بھی کر دے گا۔ چوتھے گواہ کا پورا بیان مجھے حفظ ہے۔ تو یہ پارٹ میں ادا کر سکتا ہوں۔

کارنک: مجھے اختلاف ہے۔ اگرچہ تمہارا کردار صرف ایک حاجب کا ہے مگر اس کردار کی ادائیگی بھی کوئی آسان بات نہیں ہے۔ حاجب کوئی مکالمہ نہیں بولتا تو کیا ہوا۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ آخری لمحوں میں جسے چاہو اسے لا کر اس جگہ کھڑا کر دو۔ بالو، جو تمہارا پارٹ ہے اس پر قائم رہو۔

بالو: لیکن اگر ایک دن، صرف ایک دن، کوئی دوسرا رول کر لوں تو اس سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

کاشیکر: نہیں۔

مسز کاشیکر: بالو، اگر کاشیکر جی نے نہیں کہہ دیا ہے تو پھر مت کرو تم یہ رول۔ (بالو جیسے پسپا ہو گیا ہو۔) لیکن سوال یہ ہے کہ چوتھا گواہ کون بنے گا؟

سکھاتے: (سامنت کی طرف دیکھتے ہوئے) میں بتاؤں؟ (سامنت کی طرف اشارہ کر کے) یہ رہا تمہارا چوتھا گواہ!

سامنت: (چونک کر) کیا؟ کیا؟ بات کیا ہے؟

پونکشے: (ہانپتے ہوئے) مناسب!

کاشیکر: (سامنت سے) بھئی، تم نے کبھی کسی ناٹک میں کام کیا ہے؟

سامنت: توبہ توبہ۔ میں نے کبھی ناٹک میں کام نہیں کیا۔ کیوں، بات کیا ہے؟

مسز کاشیکر: اچھا تو تم چوتھے گواہ کا پارٹ کرو گے۔ بینارے، ذرا ادھر آؤ۔ (بینارے قریب آتی ہے) تمہارا کیا خیال ہے، اگر ان صاحب کو چوتھے گواہ کا رول دے دیا جائے تو کیسا رہے گا؟

بینارے: اچھا یہ صاحب۔ برا انتخاب نہیں ہے۔ میرے خیال میں تو اچھا ہی ہے۔

(سامنت شپٹایا ہوا ہے۔ بینارے مسکرا رہی ہے۔)

سکھاتے: مسز کاشیکر اور کارنک جی اور پونکشے جی، آپ مطلق فکر نہ کریں۔ میں ذمہ داری لیتا ہوں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ میں تیاری کرا دوں گا۔ مسٹر، آپ کا نام کیا ہے؟

سامنت: جی، سامنت۔

سکھاتے: تو سامنت جی، آج عدالت کے ناٹک میں آپ چوتھے گواہ کا پارٹ کریں گے۔

سامنت: (پریشان اور بد حواس) مگر میں واقعی اس کام میں بالکل کورا ہوں۔

مسز کاشیکر: مگر تم نے زندگی میں کبھی عدالت تو دیکھی ہوگی۔ یا نہیں دیکھی؟

سامنت: زندگی میں کبھی عدالت کا منہ نہیں دیکھا۔

کارنک: کسی ڈرامے میں تو دیکھا ہوگا۔

سامنت: نہیں۔ بالکل نہیں۔ ایسا کوئی ڈراما یہاں کبھی ہوا ہی نہیں۔

سکھاتمے: (مڑ کر کارنک سے) یہ اچھی ہی بات ہے کہ ان صاحب نے کبھی کسی ڈرامے میں عدالت کا سین نہیں دیکھا۔ تو وہ جو عدالت کو ڈراموں میں دیکھ دیکھ کر عدالت کا غلط سلط تصور قائم ہو جاتا ہے، اس سے سامنت جی بچے ہوئے ہیں۔

کارنک: سب ڈراموں کی بات نہ کریں۔ چند ڈراموں کی حد تک یہ بات صحیح ہے۔

سکھاتمے: سامنت جی، شو سے پہلے پہلے میں آپ کو مکالموں کی ادائیگی کے معاملے میں پرفیکٹ کر دوں گا۔ اب وکیل کو کوئی کیا سکھائے گا کہ گواہ کو کیسے سکھایا پڑھایا جاتا ہے؟ (وکیلوں والی ہنسی۔)

سامنت: لیکن مجھے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ عدالت کے خیال ہی سے مجھے تو کپکپی آتی ہے۔

مسز کاشیکر: میری رائے یہ ہے کہ انھیں ریہرسل کرا لی جائے۔ جان، کیا خیال ہے؟ (کاشیکر چپ رہتا ہے تو وہ بینارے سے مخاطب ہوتی ہے) بینارے، تمھارا کیا خیال ہے؟

بینارے: ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ بلکہ میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ شو کے وقت تک میں کیا کروں گی۔ کوئی کتاب لے آتی تو اسے پڑھ کر وقت گزار دیتی۔ مگر کتاب لانا ہی بھول گئی۔

سامنت: آپ سوریہ کانت کا نیا ناول پڑھنا پسند کریں گی؟ ابھی دنوں مجھے ملا ہے۔ (اپنے تھیلے سے ٹٹول کر نکالتا ہے اور اسے پیش کرتا ہے) غضب کا ناول ہے۔ سوریہ کانت کا ایک سو پانچواں ناول ہے۔

بینارے: ایک سو پانچواں ناول؟ اُف۔ معاف کیجیے، مجھے نہیں چاہیے یہ ناول۔

سکھاتمے: میرے پاس بائبل ہے، بھگوت گیتا ہے، حلف اٹھوانے کے لیے۔ تمھیں پڑھنے کی حاجت ہے تو یہ کتابیں بھی پڑھ سکتی ہو۔ ارے ہاں، بالو، تم بائبل اور گیتا لے کر آئے ہو نا۔ یا بھول گئے؟

بالو: (دکھ بھرے لہجے میں) جی لایا ہوں۔ آپ کہیں تو لا کر دکھاؤں۔

(اپنے تھیلے میں ٹٹولتا ہے مگر دکھاتا نہیں۔)

بینارے: وکیل صاحب، میری ابھی اتنی عمر نہیں ہوئی ہے کہ مذہبی صحیفے پڑھنے بیٹھ جاؤں۔

کاشیکر: تو پھر بی بی، تم بھی کہانیاں یا اس ڈھنگ کے جو میگزین نکلتے ہیں وہ پڑھتی ہو گی۔ ہماری شریمتی جی تو یہی کچھ پڑھتی ہیں۔ ویسے تو یہ کہانیاں قصے بہت دلچسپ ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے اپنے سوشل ورک سے فرصت ملے تو پڑھوں۔ بس تصویریں دیکھ چھوڑتا ہوں۔

مسز کاشیکر: اچھا تو میں اس قسم کا لٹریچر پڑھتی ہوں؟

کاشیکر: تو کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟

(مسز کاشیکر کو کچھ بن نہیں پڑتا۔ چپ ہو جاتی ہے۔)

کارنک: میرا خیال یہ ہے کہ ریہرسل کا آئیڈیا اچھا ہے۔ مس سگریٹ کے چار پانچ پیکٹ آ جائیں۔ پھر ہمیں بیچ میں سے ڈھونڈھ کر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

پونکشے: (پائپ سے دھواں اڑاتے ہوئے) مناسب!

سامنت: (بالو سے) پھر فکر کی بات نہیں ہے۔ اس ڈرامے میں جو کچھ ہے سارا دیکھ لوں تو اس سے مجھ میں حوصلہ پیدا ہو جائے گا۔

(بالو کوئی جواب نہیں دیتا۔)

بینارے: میں ایک بات کہوں؟ یہ ایٹمی ہتھیاروں والا مقدمہ جس کا شو آج ہونا ہے، ہم پچھلے تین مہینوں میں سات مرتبہ کر چکے ہیں۔ ایک دفعہ اور سہی۔ تو ویسے تو مجھے ریہرسل پر کوئی اعتراض نہیں ہے، لیکن اس کے بعد کہیں شو فلیٹ نہ ہو جائے۔

سکھاتمے: مجھے مس بینارے سے اتفاق ہے۔ مجھے ایک آئیڈیا سوجھا ہے۔ دیکھ لو اگر آپ لوگوں کو پسند آ جائے۔ ہم وکیلوں کا طریقہ ہے کہ بیرسٹرز روم میں جب کبھی ہمیں سستانے کا وقت ملتا ہے تو ہم ری سے شغل کرتے ہیں، یا پیشنس، یا اور کوئی اسی قسم کا کھیل۔ بس ذرا وقت گزاری کا مشغلہ ہوتا ہے۔ کچھ اسی قسم کا کہ کوئی فرضی مقدمہ کھڑا کر دیا۔ کسی کو ملزم ٹھہرایا اور اس پر جرح شروع کر دی۔ کچھ اسی قسم کا شغل ہو جائے۔ کوئی فرضی مقدمہ پیش کرتے ہیں۔ سامنت جی کو بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ عدالت میں کیا کچھ ہوتا ہے۔ کاشیکر جی کیا خیال ہے آپ کا۔ اجازت ہے؟

کاشیکر: ٹھیک ہے۔ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہوں تو زیادہ چوں و چرا نہیں کرنی چاہیے۔ اصول یہ ہونا چاہیے کہ جو سب کی رائے وہ اپنی رائے۔

کارنک: (گرم جوشی سے) اچھا آئیڈیا ہے۔ بالکل نیا۔ تھری چیئرز! ڈرامے کی تھیوری میں اسے وژول اینیکٹ منٹ (visual enactment) کہتے ہیں۔ پچھلے سال گورنمنٹ ڈراما کیمپ میں اس پر گفتگو ہوئی تھی۔

سکھاتمے: یار سیدھے سادے خیال کے لیے تم نے کیا بھاری بھرکم اصطلاح استعمال کی ہے! بس ایک تفریح ہے، کیوں مس بینارے؟

بینارے: جی مجھ سے کیا پوچھتے ہیں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ وہ جو بچے باپوٹ پو کھیلتے ہیں اور ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر کودتے ہیں وہ کھیل بھی کھیلنے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ میں اکثر پڑوسیوں کے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتی ہوں۔ بہت لطف آتا ہے۔ تو کھیل کھیلیے۔ اچھا مشغلہ ہے۔

پونکشے: جی تو پھر ہو جائے۔ سامنت جی، ایک مہربانی کیجیے۔ سگریٹ کے کچھ پیکٹ ہمیں لا دیجیے۔

یہیں کسی نکڑ پہ دکان ہوگی۔ میں کیپسٹن پیتا ہوں۔

(کچھ رقم دیتا ہے۔)

مسز کاشیکر: پونکشے جی، آپ کیوں دے رہے ہیں؟ سامنت، واپس کر دو۔ پرفارمنس کے اخراجات کے ذیل میں یہ رقم آجائے گی۔

(اپنا پرس کھول کر کچھ نوٹ نکالتی ہے۔)

سامنت: یہ لو۔ آدھا درجن پیکٹ لے آؤ۔ جو برانڈ جسے پسند ہو وہ لے لینا۔ اور کچھ پان بھی۔ یہی کوئی تین چار۔ میٹھے پان۔

سامنت: جی۔ (رقم لے کر جانے لگتا ہے۔) گھبرائیے مت۔ بس گیا اور آیا۔ (چلا جاتا ہے۔)

بینارے: بیچارہ۔ کہتا ہے گیا اور آیا۔

(تولیا اور صابن لے کر گنگناتی ہوئی اندر والے کمرے میں جاتی ہے۔)

مسز کاشیکر: بالو، عدالت کا نقشہ جمانا شروع کرو نا۔

(بالو کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔)

کارنک: پونکشے، ذرا ادھر آؤ۔ (سکھاتمے اور دوسروں سے) کاسٹ وہی ہوگی نا جو آج رات کے شو میں کام کرے گی؟ یعنی وہی جج، وہی وکیل وغیرہ وغیرہ۔

سکھاتمے: ہاں ہاں وہی بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں وکیل بنوں گا۔

مسز کاشیکر: مگر میرا خیال ہے کہ ملزم مختلف ہونا چاہیے۔ کارنک، کیا خیال ہے تمہارا؟

کارنک: کوئی ضروری تو نہیں ہے۔ (پونکشے سے جو قریب آگیا ہے) کچھ پتا ہے؟

پونکشے: کیا؟

کارنک: (پچھلے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) اس کے بارے میں۔ وہ تو مجھے بالو نے بتایا۔

پونکشے: کیا؟

کارنک: اس وقت نہیں۔ شو کے بعد مجھے یاد دلانا۔ پھر بتاؤں گا۔

پونکشے: مجھے بھی آپ کو ایک بات بتانی ہے۔ بینارے کے بارے میں۔ (دوسروں سے مخاطب ہو کر) اگر آپ میری تجویز مانیں تو ایک آئیڈیا دوں۔ قیدی اور کوئی ہونا چاہیے۔

کاشیکر: ہاں، اس سے ذرا ورائٹی پیدا ہو جائے گی۔

مسز کاشیکر: بالکل ٹھیک ہے۔

کاشیکر: (نقل اتار کر) بالکل ٹھیک ہے! کیا مطلب ہے اس کا؟ ذرا زبان تالو کے اندر ہی رکھو۔

(مسز کاشیکر چپ ہو جاتی ہے۔)

سکھاتمے: ہاں کوئی حرج نہیں۔ بالو کو قیدی کا رول کیوں نہ دے دیں؟

Scanned with CamScanner

بانو: بالکل ٹھیک ہے۔ میں تیار ہوں۔
پونکشے: نہیں (کارنک سے) اس بی بی کے بارے میں مجھے بھی آپ سے کچھ کہنا ہے۔
کارنک: ملزم میں بن جاؤں گا۔
کاشیکر: میری تجویز یہ ہے کہ اگر یہ ڈراما رچانا ہی ہے تو پھر خالی دل لگی بازی نہیں ہونی چاہیے۔ ملزم میں بنوں گا۔ سکھاتے جی، ملزم کا رول مجھے دیجیے۔
کارنک: کمال ہے، ایک ہی آدمی جج بھی اور ملزم بھی۔
پونکشے: (پائپ سے دھواں اڑاتے ہوئے) میرے نام پر بھی غور کیا جائے۔ مجھے کچھ ایسا شوق تو نہیں، پھر بھی۔
بانو: مگر بیگم صاحب، میں کیوں نہیں؟ کیا کمی ہے مجھ میں؟
مسز کاشیکر: میں یہ رول کیوں نہ کروں؟ اگر آپ پسند کریں تو میں حاضر ہوں۔
کاشیکر: نہیں۔

(مسز کاشیکر خاموش ہو جاتی ہے۔)

خیر سے ہماری شریمتی جی میں نمائش پسندی بہت ہے۔ ہر وقت نمائش۔ اس کے بغیر تو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔
مسز کاشیکر: بہت ہو گئی۔ بس کریں اب۔ میں یہ رول نہیں کر رہی۔ اب تو خوش ہیں نا آپ؟
سکھاتمے: ہم آپ میں سے کسی کو نہیں لیں گے۔ کاشیکر جی، یوں کرتے ہیں کہ ایک بالکل مختلف قسم کے آدمی کو ملزم کا رول دیتے ہیں۔ ہیں نا؟ بینارے کو یہ رول دیتے ہیں۔ کیوں پونکشے جی، کیا خیال ہے؟ کیسا انتخاب ہے میرا؟
پونکشے: خوب ہے۔
سکھاتمے: سو اب بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیوں بیگم صاحب؟
مسز کاشیکر: اگر تم کہتے ہو تو ٹھیک ہے۔ کم از کم اتنا تو پتا چلے گا کہ نادی پر فرد جرم لگے تو کیا ہوتا ہے (کاشیکر سے) کیوں جان، ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ یہ تجربہ بھی ہونا چاہیے۔
کاشیکر: (طنزاً) بجا فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ اب یہ لوگ تمھیں سپریم کورٹ کا جج بنائیں گے۔
مسز کاشیکر: میرا مطلب یہ نہیں تھا۔
سکھاتمے: مرد ہو یا عورت ہو، جرح تو ایک ہی طرح ہوتی ہے۔ ویسے یہ ٹھیک ہے کہ عورت کٹہرے میں کھڑی ہو تو پھر مقدمے کا رنگ اور ہو جاتا ہے۔ میرا تجربہ تو یہی ہے۔ کیوں کارنک جی؟
کارنک: بالکل ٹھیک ہے۔ تو آپ میں بھی الگ ہو کر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ یہ تو ٹیم اسپرٹ کے

Scanned with CamScanner

علاقت بات ہو گی۔

مسز کاشیکر: اچھا تو پھر یہ طے ہے۔ اب ہماری ملزمہ مس بینارے ہو گی۔ اچھا فردِ جرم کیا لگے گی؟

کاشیکر: الزام ایسا ہونا چاہیے جس کی کوئی سماجی معنویت ہو۔

پونکشے: درست۔ (کھڑا ہو جاتا ہے) تو اب تھوڑی سی تیاری کر لی جائے۔ آپ سب لوگ میری بات سنیں۔ ہاں ذرا آئیے میرے پاس۔

(چپکے چپکے ان سے کچھ کہتا ہے جیسے اپنا منصوبہ بتا رہا ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کمرے کی طرف اشارہ کرتا ہے جہاں بینارے ابھی گئی تھی۔)

کاشیکر: بالو، تم نے کورٹ کا سیٹ تیار کر لیا، یا ابھی کوئی کسر ہے؟

بالو: کوئی کسر نہیں ہے۔ میں نے کام پورا کر لیا ہے۔

(ادھر اُدھر سٹر پٹر کرتا نظر آتا ہے۔ کچھ عجلت دکھا رہا ہے۔)

کارنک: بالو، یہی سوچ کر تو میں نے پوری گراؤنڈ پلان تیار کر دی تھی تاکہ پتا چل جائے کہ کون سی چیز کہاں آنی ہے۔

بالو: (غصے سے) آپ کے تھیئٹر کے معاملات میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں اس کام سے زیادہ مانوس نہیں ہوں۔

(سب مل کر فرنیچر کو اس طرح سلیقے سے لانے لگتے ہیں جیسے یہ عدالت ہو۔ پونکشے پیش پیش ہے۔ کاشیکر نگرانی کر رہا ہے۔ پونکشے کی ہدایت پر بالو بینارے کا پرس سامان میں سے نکال کر بائیں ہاتھ رکھے ہوئے اسٹول پر رکھ دیتا ہے۔ فرنیچر کے قرینے سے رکھے جانے کے بعد پونکشے اور کاشیکر یہاں سے جاتے ہیں اور پچھلے کمرے کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ باقی دوسرے بائیں ہاتھ والے ونگ میں چلے جاتے ہیں۔ کاشیکر ونگ میں جاتے لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے۔)

کاشیکر: میں آپ لوگوں کو اشارہ دوں گا۔

(بینارے تولیے سے منہ پونچھتی گنگناتی داخل ہوتی ہے۔ تازہ دم نظر آ رہی ہے۔)

بینارے: (گنگنا رہی ہے)

توتے نے کہا گوریا سے
کیوں آنکھیں تیری لال ہوئیں
گوریا نے توتے سے کہا
اے میتر مرے کیا تجھ سے کہوں
اک گھونسلا تھا پیارا سا مرا
اک ظالم اس کو لے بھاگا

Scanned with CamScanner

تب توتا رویا اور بولا
افسوس، بچاری گوریا!
کوّے بھائی، اک بات سنو
جو تم نے دیکھا ہم سے کہو
کوا بولا میں نہیں دیکھا
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں
جس کا دکھ ہو وہ ہی جانے
تب توتا رویا اور بولا
افسوس، بچاری گوریا!
دکھ درد کی ماری گوریا!

(پونکشے بینارے کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

پونکشے: (بلند آواز سے) مس بینارے، تمہیں ایک سنگین جرم کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ اب تم ایک قیدی کی حیثیت سے عدالت میں پیش کی جاؤ گی۔

(بینارے جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہے۔ ساکت ہو جاتی ہے۔ چہرے پر تناؤ آ جاتا ہے۔ بے حس و حرکت کھڑی ارد گرد دیکھتی ہے۔ پونکشے اسے تک رہا ہے۔ پھر وہ اپنے پرس کو ڈھونڈتی ہوئی ونگ میں جاتی ہے۔ اسٹول پر سے پرس اٹھا کر اس میں کنگھی رکھتی ہے۔ اتنے میں کاشیکر برآمد ہوتا ہے اور ڈائس پر جا کر جج کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دائیں بائیں ونگ میں کھڑے لوگوں کو اشارہ کرتا ہے۔ کارنک اور بالو خاموشی کے ساتھ ایک کٹہرا لیے آتے ہیں اور اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ اب بینارے کٹہرے میں کھڑی نظر آتی ہے۔ سکھاتمے وکیلوں والے سیاہ گاؤن میں ملبوس برآمد ہوتا ہے اور وکیلوں کی جو ایک ٹوٹی پھوٹی میز ہے اس کے قریب کی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ دوسرے اپنی اپنی جگہ پر جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سامنت داخل ہوتا ہے اور دروازے کے بیچ میں کھڑا ہو جاتا ہے۔)

کاشیکر: (گلا صاف کرتے ہوئے) قیدی مس بینارے کو اس جرم میں کہ وہ ایک بچے کے قتل کی مرتکب ہوئی ہے ماخوذ کیا جاتا ہے۔ مس بینارے، کیا تم نے متذکرہ جرم کا ارتکاب کیا ہے؟

(بینارے جیسے سن ہو گئی ہو۔ گم سم کھڑی ہے۔ سب خاموش ہیں۔ فضا میں غیر معمولی تناؤ ہے۔)

دوسرا ایکٹ

(وہی ہال۔ نقشہ وہی ہے جو پہلے ایکٹ کے خاتمے پر تھا۔)

کاشیکر: (جج والے وقار کے ساتھ) قیدی مس بینارے! تم پر الزام ہے کہ تم ایک بچے کے قتل کی مرتکب ہوئی ہو۔ کیا تم نے متذکرہ جرم کیا ہے یا نہیں کیا؟

(فضا میں ایک تناؤ ہے۔ بینارے گم سم ایک کرسی کا سہارا لیے کھڑی ہے۔ سامنت جو ابھی تک دروازے میں کھڑا ہے سبھوں سے کارنک سے مخاطب ہوتا ہے۔)

سامنت: یہ رہے پان اور سگریٹ۔

(فضا کا تناؤ یکدم ختم ہو جاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: ایک میٹھا پان مجھے دینا

کارنک: ولز کا ایک پیکٹ مجھے۔

پونکشے: سامنت جی، ایک سپیشل پان ادھر۔

سکھاتمے: ایک پان اور بیڑی کا بنڈل ادھر۔ کاشیکر جی، آپ کو کیا چاہیے؟

کاشیکر: ایک مسالے والا پان۔

(بالو سامنت سے پان لے کر کاشیکر کو پیش کرتا ہے۔)

بالو: (بہت ادب سے) میں نے اس میں سے چونا نکال دیا ہے۔

سکھاتمے: (ایک پان بینارے کو پیش کرتے ہوئے) بینارے، پان لو۔

بینارے: (جو اب کرسی پر بیٹھی ہے) کیا؟ ہوں۔ نہیں۔ شکریہ۔

سکھاتمے: ارے تم اچانک اتنی سنجیدہ کیوں ہو گئیں۔ بھئی یہ تو جھوٹ موٹ کا کھیل ہے۔ ناٹک۔

Scanned with CamScanner

اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

بینارے: (ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) سنجیدہ کون ہو رہا ہے۔ میں کوئی سنجیدہ وجیدہ نہیں ہوں۔ بس ذرا فضا پیدا کرنے کی غرض سے ایسا موڈ بنا لیا تھا۔ آخر عدالت والی فضا بھی تو ہونی چاہیے۔ اس قسم کی پیشیوں سے میں ڈرنے والی تھوڑا ہی ہوں۔

سامنت: (کارنک کے لیے سگریٹ سلگاتے ہوئے) شاید اسی کسی نے کوئی مذاق کیا ہے۔

کارنک: کیسا مذاق؟

سامنت: نہیں نہیں۔ کاشیکر جی نے کسی الزام کی بات کی تھی۔ مگر میں کچھ سمجھا نہیں۔

کارنک: الزام؟ بچہ کشی کا الزام ہے۔

سامنت: وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کیا ہے؟ میری سمجھ میں بات نہیں آ رہی۔ اسی لیے پوچھ رہا ہوں۔ میں بالکل بے خبر آدمی ہوں۔

سکھاتمے: ایک نوزائیدہ بچے کو ہلاک کرنے کا الزام۔

سامنت: توبہ توبہ! یہ تو بڑا لرزہ خیز الزام ہے۔ ہماری بستی میں بالکل یہی ہوا تھا۔ اس بات کو ڈیڑھ دو سال ہو گئے۔ وہ بیچاری بیوہ تھی۔

سکھاتمے: اچھا؟ پھر اس مقدمے میں وکیل کون تھا؟ کاشیکر جی، آپ نے الزام بہت چھانٹ کے لگایا ہے۔ اگر الزام زبردست نہ ہو تو پھر مقدمے میں جان کہاں سے پیدا ہوگی۔

کاشیکر: ذرا غور کریں کہ سماجی نقطۂ نگاہ سے اس الزام کی کتنی اہمیت ہے۔ بچہ کشی کا سوال سماجی اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے سوچ سمجھ کر اس الزام کا انتخاب کیا ہے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں سوسائٹی کے فائدے کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ہاں بینارے بی بی، پھر آ جاؤ۔ بالو، میری ہتھوڑی دینا۔

(بالو جلدی سے ہتھوڑی لے کر آتا ہے۔)

ویسے تو بغیر ہتھوڑی کے بھی کام چل ہی جاتا۔ مگر میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم لاتے بھی ہو یا نہیں۔ (ہتھوڑی میز پر بجا کر) اب کارروائی شروع ہوتی ہے۔ میری کان کی تیلی؟ (جیب میں ٹٹولتا ہے اور تیلی نکال کر [illegible] رکھ دیتا ہے۔) سکھاتمے جی، تشریف لائیے اور شروع کیجیے۔

سکھاتمے: (ایک شان کے ساتھ گاؤن ٹھیک کرتے اور پان چباتے ہوئے) جنابِ والا، اس مقصد کے پیشِ نظر کہ مقدمے کی کارروائی سکون و اطمینان سے ہو، میں فاضل عدالت سے درخواست کروں گا کہ پانچ منٹ کے لیے کارروائی ملتوی کر دی جائے تاکہ پان کھانے والے پیک تھوک کر فراغت حاصل کر لیں۔

کاشیکر: (جج والے وقار کے ساتھ پیک تھوکتا ہے) ملزمہ کے وکیل کو چاہیے کہ وہ اس ضمن میں اپنے دلائل پیش کرے۔

سکھاتے: (خود ہی ملزمہ کا وکیل بن کر کھڑا ہو جاتا ہے) جناب والا، میں وکیلِ استغاثہ کی تجویز سے اختلاف کی اجازت چاہتا ہوں۔ پان کی پیک تھوکنے کے لیے دس سیکنڈ بہت کافی ہیں۔ میرے فاضل دوست پاؤ منٹ کا التوا کس خوشی میں چاہتے ہیں؟ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ میرے فاضل دوست چاہتے ہیں کہ اس طرح وقت ضائع کیا جائے اور مقدمے کو طول دیا جائے۔ یہ التوا میری موکلہ کے لیے پریشان کن ہے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ التوا صرف دس سیکنڈ کے لیے ہونا چاہیے۔

بینارے: (اب ضبط نہیں کر سکتی) بالکل درست۔ بلکہ اسے اور کم کر کے ساڑھے نو سیکنڈ کر دیا جائے۔

کاشیکر: ملزمہ مس بینارے سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ عدالت کی کارروائی میں مداخلت نہیں کرے گی۔ شاید عدالت کے آداب کی طرف ایک مرتبہ پھر توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ (کارنک کو طلب کر کے) منشی جی، جو مسئلہ ہمارے سامنے پیش کیا گیا ہے اس کے سلسلے میں نظیر پیش کی جائے۔

کارنک: (منہ سے سگریٹ نکال کر الگ رکھتا ہے اور منہ سے ست سا دھواں چھوڑتا ہے۔) چوں کہ عام طور پر مقدمے کی کارروائی کے دوران پان نہیں کھایا جاتا اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ عدالت کے پچھلے فیصلوں میں ایسی کوئی نظیر نہیں ملے گی۔ علاوہ ازیں، یہ پہلی مثال ہے کہ ایک جج نے کرسیِ عدالت پر بیٹھے ہوئے پان کھایا ہے اس لیے جناب والا، یہ اپنی نظیر آپ ہے۔

کاشیکر: مسٹر وکیلِ صفائی، کیا آپ اس عدالت پر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ پان کھا کر اور پان کی پیک تھوک کر دس سیکنڈ میں فارغ ہوا جا سکتا ہے؟

سکھاتے: جناب والا، یہ بالکل ثابت کیا جا سکتا ہے (باہر جا کر پیک تھوکتا ہے۔ واپس آ کر) جناب والا، یہ کام میں نے ٹھیک دس سیکنڈ میں انجام دیا ہے۔

کاشیکر: عدالت بچشمِ خود دیکھنا چاہتی ہے۔

(اٹھ کر موقعے پر جاتا ہے۔)

بینارے: (ٹھنڈا سانس بھر کر) کارنک جی، یہ عدالت ہے یا تھوکنے کا مقابلہ ہو رہا ہے؟

(کارنک اس کی بات کو سنی ان سنی کر دیتا ہے۔)

سامنت: (کارنک سے) سر، کیا عدالتوں میں یہی کچھ ہوتا ہے؟ یہ تو بہت دلچسپ معاملہ ہے۔

کارنک: (دھواں اڑاتے ہوئے) اس سے توہینِ عدالت کا پہلو نکلتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ خاموشی سے سنتے رہیں۔

کاشیکر: (واپس آ کر بیٹھتے ہوئے) منشیِ عدالت، اس میں کتنا وقت لگا؟

Scanned with CamScanner

کارنک: (گھڑی دیکھتے ہوئے) ایشور جانے!

مسز کاشیکر: میں بتاتی ہوں۔ پندرہ سیکنڈ لگے۔

سکھاتمے: (وکیل استغاثہ کی حیثیت سے باقاعدہ انداز میں) ٹھیک۔ گویا دس نہیں بلکہ پورے پندرہ سیکنڈ صرف ہوئے۔ یعنی پوائنٹ۔ جناب والا میں نے یہی عرض کیا تھا۔

مسز کاشیکر: سامنت جی، یہاں پر جو بحث ہو رہی ہے، یہ سب دل لگی ہے۔ بس اس سے اندازہ لگا لو کہ عدالت کی کارروائی کیسے چلتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تم کو جو بات بھی کہنی ہے عدالت کی اجازت سے کہنی ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھو۔ یہ نکتہ یاد نہ رہا تو آج کے شو میں تم گڑبڑ کر دو گے۔

سامنت: (گرمجوشی سے) ابھی یہی دیکھ رہا تھا۔ لیکن---

کاشیکر: (موگری بجاتے ہوئے) عدالت کی کارروائی کے دوران خاموش رہنا ضروری ہے۔ اور تمہارا تو یہ حال ہے کہ گھر ہو یا عدالت زبان قینچی کی طرح چلتی ہی رہتی ہے۔

مسز کاشیکر: میں سامنت جی سے یہ کہہ رہی تھی---

سکھاتمے: بیگم صاحب، جانے بھی دیجیے۔ انھوں نے دل لگی میں یہ بات کی ہے۔

مسز کاشیکر: دل لگی میں ہو یا کیسے ہی ہو۔ جھڑکنے کا موقع ملنا چاہیے۔ یہ کوئی بات ہوئی کہ قدم قدم پر ٹوکتے ہیں۔

بینارے: (سوامی کلرسدی سے بالو صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے) بالو، میں کہتی ہوں---

بالو: (غصے سے، لیکن تیور چڑھاتے ہوئے) مجھے بالو مت کہیے۔

کاشیکر: (کھنکار کر موگری میز پر مارتے ہوئے) ہاں، اب ہم بچہ کشی کے مسئلے کی طرف آتے ہیں۔ قیدی مس بینارے، تم پر جو الزام لگایا گیا ہے اس جرم کا تم نے ارتکاب کیا ہے یا نہیں؟

بینارے: کیا آپ خود اس جرم کے ارتکاب کا اعتراف کریں گے؟

کاشیکر: (موگری بجاتے ہوئے) آرڈر آرڈر! عدالت کے احترام کو ہر صورت میں ملحوظ رکھا جائے، ورنہ سامنت جی کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ عدالت کیسے کام کرتی ہے۔

بینارے: یا یہ کہ بچے کے قتل کا ارتکاب کیسے ہوتا ہے۔ بچہ کشی، بچہ کشی۔ آپ جو اصطلاح استعمال کر رہے ہیں بالکل جچتی نہیں لگتی۔ مجھ پر کوئی اور الزام کیوں نہیں لگاتے؟ مثلاً اس خاتون نے پبلک پراپرٹی پر ناجائز قبضہ کیا ہے۔

کاشیکر: جو الزام لگایا گیا ہے اس میں ہمیں کوئی قباحت معلوم نہیں ہوتی۔

بینارے: (کرسی پر ہاتھ مارتے ہوئے) آرڈر! آرڈر! عدالت کے وقار کو ہر صورت میں ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ گھر ہو یا عدالت، زبان قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے۔ (وکیل کی نقل کرتے ہوئے) جناب والا، عدالت کی گھروالی کی سرزنش ہونی چاہیے۔ اس نے نہ کبھی بچہ کشی کا ارتکاب کیا نہ پبلک

پراپرٹی پر قبضہ کیا۔ قبضہ کیا بھی ہے تو بس جنابِ والا پر ہی کیا ہے۔

مسز کاشیکر: بینارے، بس کرو!

بینارے: (حاجب سے، پیار کے لہجے میں) بالو، میرے بالو، ذرا سنو۔

(بالو دانت پیس کر رہ جاتا ہے۔)

سامنت: (مسز کاشیکر سے) مس بینارے نے تو کمال کر دیا۔

پونکشے: (سنجیدگی سے) ہاں، کسی طرح سے۔

کاشیکر: قیدی مس بینارے نے وکیل کے اختیار پر ڈاکا ڈالا ہے اور عدالت کی کارروائی میں مداخلت کی ہے۔ اس ضمن میں اسے تنبیہ کی جاتی ہے۔

(بینارے اپنی کرسی سے اٹھ کر کاشیکر کے قریب آتی ہے اور قریب رکھے ہوئے پان کو اٹھا کر اسے پیش کرتی ہے۔)

بینارے: شکریہ۔ اس ضمن میں آپ کو پان پیش کیا جاتا ہے۔

کارنک: دیکھیے اگر یہاں کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا تو پھر یہ کھیل ختم ہے۔ مس بینارے، کم از کم یہی سوچ کر کہ سامنت جی کو کچھ سیکھنا ہے سنجیدہ ہو جائیے اور عدالت کے آداب کا تھوڑا لحاظ کر لیجیے۔

سکھاتمے: ورنہ یہ کھیل بچوں کا کھیل بن کر رہ جائے گا۔ ہمیں سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

بینارے: (واپس اپنی جگہ آ کر) ہاں، تو بچہ کشی کی بات ہو رہی تھی۔ جنابِ والا، وہ میری غلطی تھی۔ لیکن کوئی قیدی جج کا احترام کیوں کرے؟ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔ ارے میں تو ایک مچھر کو بھی نہیں مار سکتی۔ مجھے اتنا ڈر لگتا ہے۔ ایک نوزائیدہ بچے کو کیسے ہلاک کر سکتی ہوں؟ یہ ٹھیک ہے کہ آج صبح کلاس میں مجھے غصہ آ گیا تھا۔ ایک شرارتی بچے کی پٹائی کر ڈالی۔ مگر کیا کرتی؟ سن ہی نہیں رہا تھا۔

کاشیکر: بالو، حلف اٹھوانے کے لیے کتاب؟

(بالو ایک موٹی سی کتاب نکال کر سٹول پر رکھ دیتا ہے۔)

اور گواہوں کا کٹہرا کہاں ہے؟

(بالو گواہوں کا کٹہرا لانے چلا جاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: (سامنت سے) اس کے بعد وکیلِ استغاثہ کی تقریر ہو گی۔

(سکھاتمے ایک کرسی پر آرام سے بیٹھا ہے۔ ٹانگیں دوسری کرسی پر پھیلی ہوئی ہیں اور ہاتھ سر کے پیچھے باندھ رکھے ہیں۔ کاہلی سے اٹھ کر کھڑا ہوتا ہے اور سنجیدگی سے انداز میں بولنا شروع کرتا ہے۔)

سکھاتمے: جناب والا جو الزام عائد کیا گیا ہے (کاؤنٹر کے سگریٹ سے زیادہ بیڑی جلتا ہے) اس کی نوعیت بہت سنگین ہے۔

بینارے: اے مسٹر، آپ کو یہ کیسے پتا ہے؟ (سب کو سنجیدہ دیکھ کر) آرڈر، آرڈر!

(پونکشے بیزار ہو کر اندر کے کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

کاشیکر: قیدی مس بینارے، عدالت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے پر ایک مرتبہ پھر تمھیں تنبیہ کی جاتی ہے۔ وکیل استغاثہ بیان جاری رہے۔

سکھاتمے: مادری جذبہ ایک پاک جذبہ ہے۔ ماں تا پاک ہوتی ہے۔ ماں تا کے بارے میں ہم بہت اعلیٰ تصور رکھتے ہیں۔ ہم نے عورت کو انسانیت کی ماں کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ہماری ثقافت ہم سے ماں کے احترام کا تقاضا کرتی ہے۔ ہم اپنے بچوں کو یہی سبق دیتے ہیں کہ ماں کو دیوی سمجھو۔ ماں پر بہت بڑی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ ماں اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کے لیے اس کے گرد جادو کا حصار کھینچ دیتی ہے۔۔۔

کاشیکر: آپ ایک بات بھولے جا رہے ہیں۔ سنسکرت کی ضرب المثل ہے۔ ماں اور دھرتی ماتا، دونوں کا مقام آسمان سے اونچا ہے۔

مسز کاشیکر: (جوش میں آکر) اور ہاں، یہ بھی تو بہت مشہور ہے کہ اے ماں، تیرے کتنے احسان!

بینارے: سنو بھئی سنو! اسکول کی کمپوزیشن کی کتاب سے رٹا ہوا سبق سنایا جا رہا ہے! (طنزو تمسخر سے زبان چباتی ہے) قیدی مس بینارے، عدالت کے اختیار میں مخل ہونے کے باعث ایک مرتبہ پھر تمھیں تنبیہ کی جاتی ہے۔

(یوں ظاہر کرتی ہے جیسے موگری میز پر بجا رہی ہو۔)

سکھاتمے: جناب والا آپ نے جو اضافہ فرمایا ہے اس کے لیے میں آپ کا ممنون ہوں۔ مختصر یہ کہ عورت بیوی تو گھڑی دو گھڑی کے لیے ہوتی ہے، لیکن اس کی مادرانہ حیثیت دائمی ہوتی ہے۔

(سامنت تالی بجاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: اس وقت تو تم نے تالی بجا کر اچھا کیا۔ مگر رات کے شو میں ایسی حرکت مت کرنا۔

سامنت: بجا فرمایا۔ بس مجھ سے رہا نہیں گیا۔ کیا خوب صورت فقرہ ہے۔

سکھاتمے: یہ صحیح بات ہے۔ اور اگر یہ بات صحیح ہے تو ذرا سوچیے کہ اگر ایک عورت اس ننھی سی جان کے ساتھ جسے اس نے جنا ہے یہ حرکت کرے تو معزز شہری کیا کہیں گے۔ ہم یہی کہیں گے کہ روئے ارض پر اس سے زیادہ پست، اس سے زیادہ شیطانی حرکت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میں شواہد سے یہ ثابت کروں گا کہ قیدی نے اس گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

(پہلا گواہوں کا کٹہرا لے کر آتا ہے۔)

بینارے: (نرم لیکن شرارت آمیز لہجے میں) میں کھتی ہوں بالو میاں ــــ

(بالو چڑ جاتا ہے۔ پونکشے شتینی کمرے سے برآمد ہوتا ہے۔)

سکھاتے: میرا پہلا گواہ ہے عالمی شہرت کے سائنس داں شری گوپال پونکشے۔ ہاں تو پونکشے جی، آپ خوش ہیں نا؟ دیکھیے ہم نے دم کے دم میں آپ کو عالمی شہرت کا مالک بنادیا۔

کاشیکر: (کان کھجاتے ہوئے) گواہ کو پیش کیا جائے۔

(پونکشے گواہوں والے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ بالو ایک موٹی سی کتاب اس کے سامنے لے کر آتا ہے۔ پونکشے کتاب کے پہلے صفحے پر نظر ڈال کر اس پر ہاتھ رکھتا ہے۔)

پونکشے: میں، جی این پونکشے، آکسفورڈ انگلش ڈکشنری پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا، بالکل سچ اور صرف سچ۔

(بینارے بے تحاشا ہنسنا شروع کرتی ہے۔)

مسز کاشیکر: (غصے سے) بالو، تم سے ڈکشنری لانے کو کس نے کہا تھا؟

بالو: (بے چارگی سے) چوک ہو گئی۔ (بڑبڑاتا ہے) کس کس چیز کو یاد رکھتا۔

بینارے: بےچارہ بالو!

بالو: (غصے سے) مجھ پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں ہے، سمجھیں۔

کاشیکر: (سوگری جاگ کر) جرح شروع کی جائے۔

مسز کاشیکر: (سامنت سے، سازشی لہجے میں) جرح کو غور سے سننا، کیا سمجھے۔

سامنت: (سر ہلاتا ہے) سمجھ گیا۔

سکھاتے: (قریب آ کر) آپ کا نام؟

پونکشے: جی این پونکشے۔ آگے چلیے۔ باقی تفصیلات رات والے شو میں۔

سکھاتے: مسٹر پونکشے، کیا آپ ملزمہ کو جانتے ہیں؟

بینارے: (پونکشے کے لہجے میں) ہوں!

پونکشے: (بینارے کو غور سے دیکھتے ہوئے) خوب جانتا ہوں۔

سکھاتے: ملزمہ کے سوشل اسٹیٹس کے بارے میں کچھ بتائیے۔

پونکشے: ٹیچر ہیں۔ کہہ لیجیے استانیوں کی بڑی بی۔

بینارے: (پونکشے کو ہنس کر دکھاتے ہوئے) خیر سے میں ابھی جوان ہوں۔

سکھاتے: مسٹر پونکشے، یہ بتائیے کہ ملزمہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔

پونکشے: آپ یہ بات ملزمہ سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟

سکھاتے: لیکن اگر آپ سے پوچھا جائے تو آپ کا کیا جواب ہو گا؟
پونکشے: بظاہر تو وہ غیر شادی شدہ ہی ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ پبلک کی نظروں میں۔
بینارے: (حل ہوتے ہوئے) اور تمہاری نظروں میں؟
کاشیکر: آرڈر! مس بینارے، تھوڑے سے ضبط سے کام لو۔ (سکھاتے سے) بیان جاری رہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔

(اٹھ کر حسی کمرے میں جاتا ہے۔ واضح ہو کہ باتھ روم حسی کمرے میں ہے۔)

مسز کاشیکر: خیر، اس وقت تو جو ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ لیکن رات کے شو میں یہ طریقہ نہیں چلے گا۔ وہاں تو ہر صورت قاعدے قرینے کو ملحوظ رکھا جائے گا۔
سکھاتے: (بڑبڑاتے ہوئے) اس شخص کو ہمیشہ غلط کام غلط وقت پہ یاد آتے ہیں۔ شکار کے وقت۔۔۔ (کہتے کہتے رکتا ہے) خیر۔ (اونچی آواز سے) پونکشے جی، ملزمہ کے چال چلن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ایک غیر شادی شدہ خاتون کا جیسا چال چلن ہونا چاہیے، اس کے حساب سے کیسا چال چلن ہے ملزمہ کا؟
بینارے: ایک غیر شادی شدہ خاتون کا چال چلن۔ اس کو ناپنے کا پیمانہ آپ کے پاس کیا ہے؟
پونکشے: (بینارے کے بیان کو نظر انداز کرتے ہوئے) ہاں اس حساب سے تو موصوفہ کا چال چلن ذرا ایسا ویسا ہی ہے۔
سکھاتے: ایسا ویسا؟ یعنی کیا؟
پونکشے: موصوفہ ذرا کھلی ڈلی ہیں۔
سکھاتے: کھلی ڈلی؟ اس سے آپ کی کیا مراد ہے؟
پونکشے: اس سے میری کیا مراد ہے؟ یعنی کہ میری کیا مراد ہے؟ بس یوں سمجھیے کہ کوئی مرد ہو، موصوفہ بہت جلدی ریجھ جاتی ہیں۔
بینارے: یا، بیچارہ مرد!
سکھاتے: دیکھیے، آپ توہینِ عدالت کی مرتکب ہو رہی ہیں۔
بینارے: عدالت تو باتھ روم میں براجماں ہے۔ یہاں ہوتی تو اس کی توہین ہوتی۔ تو سکھاتے جی، آپ بے تکی بات تو نہ کریں۔

(سامنت قہقہہ لگاتا ہے۔)

سکھاتے: تمہارے مسد کون لگے۔ ہاں تو پونکشے جی۔

(مسٹر پونکشے گواہوں کے کٹہرے سے نکل کر ان سے باتیں کر رہا ہے)

یہاں تو کوئی سنجیدہ ہی نظر نہیں آ رہا۔

(پونکشے پھر کٹہرے میں آن کھڑا ہوتا ہے۔)

ہاں تو مسٹر پونکشے، یہ بتائیے کہ کیا ملزمہ کا کسی شادی شدہ یا غیر شادی شدہ مرد سے تعلق ہے؟ شادی شدہ یا غیر شادی شدہ؟

بینارے: (پھر بیچ میں بول پڑتی ہے) جی ہاں، ہے۔ ایک تو وکیلِ استغاثہ جی کے ساتھ ہے۔ اور فاضل جج کے ساتھ بھی ہے۔ پونکشے جی کے بارے میں کیا کہوں۔ اور یہ بالو میاں، خیر جانے دیں۔

بالو: مس بینارے، میں کہے دیتا ہوں کہ اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔

پونکشے: سکھاتے جی، یہ جو آپ نے پیشی کا ناٹک رچا رکھا ہے وہ ان حالات میں کیسے جاری رہ سکتا ہے؟ کوئی سنجیدہ نظر ہی نہیں آرہا۔ کاشیکر جی اُدھر اندر جا گھسے ہیں۔ بینارے کا حال آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔

کارنک: ہمارے کھیلوں کی جو ریہرسلیں ہوتی ہیں ان میں بھی کم از کم یہاں سے زیادہ سنجیدگی ہوتی ہے۔

مسز کاشیکر: بینارے بی بی، یہ تم کیا کر رہی ہو؟ کہیں یہ نہ ہو کہ تمہاری وجہ سے ہمارا شو فلاپ ہو جائے۔

بینارے: میں تو ان لوگوں کو سہارا دے رہی ہوں۔

کاشیکر: (واپس آکر) بھئی کیا ہوا؟ ہاں سکھاتے جی، بیان جاری رہے۔ (بیوی سے) میرے کان کی تیلی کہاں ہے؟

بینارے: میرا خیال ہے میں باہر جا کر تھوڑی ہواخوری کر آؤں۔ آپ بے شک پیشی جاری رکھیں۔ بچ گئی، ہا! --- باہر کچھ تازہ ہوا تو کھانے کو ملے گی۔

کارنک: گر یہ بات ہے تو کیوں نہ بساط لپیٹ دی جائے۔

مسز کاشیکر: نہیں۔ کم از کم پیشی پوری ہو جانی چاہیے۔ جو کام ہاتھ میں ہے سے تو نپٹایا جائے۔

سامنت: (مسز کاشیکر سے مؤدبانہ) کیا اس کا مطلب ہے کہ کام یہیں پورا ہو جائے گا؟

کاشیکر: (کان کی تیلی مل جاتی ہے) مل گئی۔ ہاں اب بات کیجیے۔ سماعت جاری رہے گی۔ (بینارے کی طرف دیکھ کر) ذرا تحمل سے کام لو۔ ہاں سکھاتے جی، آپ کو اب کس بات کا انتظار ہے۔

سکھاتے: کان کا میل نکالنے والی تیلی کا انتظار تھا۔ شکر ہے کہ وہ مل گئی۔ ہاں جناب والا، (اس تھ ہی مثل پھر پوری لپیٹا ہے اور مستعد ہو جاتا ہے) پونکشے جی۔

(پونکشے جو کٹہرے سے باہر آگیا تھا پھر کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

آپ یہ بتائیے کہ ملزمہ کے یہاں آپ نے کبھی کوئی ایسی بات دیکھی جس نے آپ کو چونکایا ہو؟

Scanned with CamScanner

پوکنگے: کوئی ایک نہیں، بہت سی باتیں۔
سکاٹے: (دھواں اڑاتے ہوئے) مثلاً؟
پوکنگے: مثلاً کبھی کبھی ایسی بات کرتی ہے جیسے اپنے ہوش ہی میں نہ ہو۔
سکاٹے: مثلاً؟
پوکنگے: مثلاً یہ کہ ایک مرتبہ اس بی بی نے میری شادی کے لیے بندوبست شروع کر دیا۔ دور کیوں جائیے۔ ذرا اسی وقت اس بی بی کا رویہ دیکھ لیجیے۔ مجھے زبان نکال کر دکھا رہی ہے جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

(بیمارسے فوراً زبان اندر کر لیتی ہے۔)

سکاٹے: (جیسے کوئی اہم ثبوت مل گیا ہو) خوب! اچھا اب آپ جا سکتے ہیں۔ معزز ساکھس وال مسٹر پوکنگے، آپ اب تشریف رکھیے۔ ہمارا دوسرا گواہ ہے مسٹر کارنک، اپنے وقت کے بڑے اداکار مسٹر کارنک۔

(پوکنگے کٹہرے سے نکل کر بیمارسے کو دیکھتے ہوئے جاتا ہے اور ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ کارنک ڈرامائی انداز میں گواہوں کے کٹہرے میں قدم رکھتا ہے۔)

کارنک: جی، پوچھیے۔
سکاٹے: صفت، نام، پیشہ۔ چھوڑیے ان بکھیڑوں کو۔ سیدھی بات کرتے ہیں۔ مسٹر کارنک، آپ ایک اداکار ہیں نا؟
کارنک: بالکل ہوں۔ اور اس پر مجھے فخر ہے۔
سکاٹے: ہاں ہاں ضرور فخر کیجیے۔ مگر یہ بتائیے کہ (بیمارسے کی طرف اشارہ کر کے) آپ اس خاتون کو جانتے ہیں؟
کارنک: (بیمارسے کو غور سے دیکھتے ہوئے، ٹھہر ٹھہر کر) جی جناب۔ میرا خیال ہے کہ میں اس خاتون کو جانتا ہوں۔
سکاٹے: میرا خیال ہے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟
کارنک: اس کا مطلب ہے کہ میں سمجھتا ہوں یا میں محسوس کرتا ہوں۔ ویسے ڈکشنری یہاں موجود ہے۔ اس میں اس لفظ کے معنی دیکھ لیں۔

(سکاٹے غیرارادی طور پر میز پر رکھی ڈکشنری کی طرف بڑھتا ہے۔ اسے شانے شانے رکھ دیتا ہے۔)

سکاٹے: مسٹر، مجھے ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مہربانی فرما کر قطعی انداز میں

بتائیں کہ آپ اس خاتون کو جانتے ہیں یا نہیں جانتے۔
کارنک: (کندھے بچکاتے ہوئے) یہ ذرا عجیب سی بات ہے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم فلاں آدمی کو جانتے ہیں، مگر اصل میں ہم اسے نہیں جانتے۔ حقیقت افسانے سے زیادہ حیران کن ہوتی ہے۔
سکھاتمے: آپ کی ایک دوسرے سے شناسائی کیسے ہوئی؟
کارنک: اسی گروپ کے واسطے سے شناسائی ہوئی ہے۔ عدالت کا جو ناٹک ہو رہا ہے اس میں ہم دونوں کام کر رہے ہیں۔
سکھاتمے: مسٹر کارنک، آپ دونوں کیسا کام کر رہے ہیں؟
کارنک: کمال کا کام۔ بہٹ پرفارمنس۔
سکھاتمے: (وکیلوں والے لہجے میں) جنابِ والا، میری درخواست ہے کہ اس اہم بیان کو آفیشل ریکارڈ میں قلم بند کیا جائے۔
کاشیکر: اس کا بندوبست کیا جائے گا۔ آگے چلیے۔
سکھاتمے: مسٹر کارنک، ایک بات ایمان داری سے بتائیے۔ جن ڈراموں میں آپ کام کرتے ہیں ان میں ماں کا کیا تصور پیش ہوا ہے؟
کارنک: نئے ڈراموں میں تو ماں کا سرے سے کوئی حوالہ ہی نہیں آتا۔ زندگی کی بے مقصدیت ان ڈراموں کا موضوع ہوتی ہے۔ ویسے آدمی کی زندگی ہے بھی کچھ اسی رنگ کی۔
کاشیکر: مجھے اس سے اختلاف ہے۔ آدمی کی زندگی میں کوئی مقصد ہونا چاہیے۔
سکھاتمے: اچھا یہ بتائیے کہ اگر آپ سے پوچھا جائے کہ ماں کی تعریف کیا ہے تو آپ کیسے تعریف کریں گے؟
کارنک: ماں وہ ہوتی ہے جو بچہ جنتی ہے۔
سکھاتمے: مسٹر کارنک، آپ کے خیال میں کون سی عورت ماں ہے، وہ عورت جو اپنے جنے ہوئے بچے کو پالتی پوستی ہے یا وہ عورت جو اس کا گلا گھونٹ دیتی ہے؟
کارنک: یہ دونوں ہی عورتیں ماں ہیں کیوں کہ بچہ تو دونوں نے جنا ہے۔
سکھاتمے: ممتا کس چیز کا نام ہے؟
کارنک: بچے کو جننے ہی میں ممتا پوشیدہ ہے۔
سکھاتمے: مگر بچے تو کتیا بھی جنتی ہے۔
کارنک: پھر وہ بھی ماں ہے۔ یہ کس نے کہہ دیا کہ انسانی مخلوق ہی کو ماں بننے کا حق ہے؟ یہ کہ کتیا کو ماں بننے کا حق نہیں ہے؟

بوبنارسے: (کابلی سے انگڑائی سی لے کر) شاباش کارنک!

(کارنک اسے نظرانداز کردیتا ہے۔)

سکھاتمے: کارنک آج بہت فارم میں ہے۔

کاشیکر: کارنک، یہ جلوہ رات کے شو میں دکھانا۔ اس وقت تم ہمارے سوالوں کے بس سیدھے سیدھے جواب دو۔

سکھاتمے: مسٹر کارنک، میرے اگلے سوال کا جواب ذرا سوچ کر دینا۔ ہاں تو مسٹر کارنک، ملزمہ کے چال چلن کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

کارنک: یہ جو ناٹک ہو رہا ہے اس کے حساب سے بتاؤں یا زندگی میں جیسا دیکھا ہے اس کے حساب سے؟

سکھاتمے: زندگی میں جیسا دیکھا ہے اس کے حساب سے۔

کاشیکر: (کان کریدتے ہوئے) سکھاتمے جی، میرا خیال ہے کہ سوال اس پیشی کے حوالے ہی سے ہونے چاہییں۔

کارنک: پھر ٹھیک ہے۔ پھر میں ملزمہ کے چال چلن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

سکھاتمے: کچھ نہیں جانتے؟ واقعی؟

کارنک: ہاں۔ اس پیشی کی حد تک کچھ نہیں جانتا۔

(بوبنارسے کے چہرے پر تناؤ آجاتا ہے۔)

سکھاتمے: (پھرتی لے کر) اچھا مسٹر کارنک، یہ بتائیے کہ کیا آپ نے ملزمہ کو، میرا مطلب ہے کسی خاص وقت میں ملزمہ کو ایسی حالت میں دیکھا ہے، میرا مطلب ہے وہ جو انگریزی میں کہتے ہیں compromising حالت میں؟ ہاں یا نہیں میں جواب دیجیے۔

کارنک: میں نے تو نہیں، ہاں بالو نے ضرور اس عورت کو اس کیفیت میں دیکھا ہے۔

بالو: (سٹپٹا جاتا ہے) میں نے؟ نہیں نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔

سکھاتمے: (وکیلوں والے انداز میں) مسٹر کارنک، آپ کا بہت بہت شکریہ۔ اب آپ اپنی نشست پر جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔

(کارنک گواہی کے کٹہرے سے نکل آتا ہے۔)

مسٹر بالو روکڑے، آپ تشریف لائیں۔

مسز کاشیکر: (سامنت سے) تمھیں سمجھ آرہی ہے نا؟

سامنت: جی بالکل۔

بالو: (سٹپٹا یا ہوا اسی جگہ پر کھڑا ہے) میں، میں نہیں۔

سکھاتے: جناب والا، مسٹر الوہ کاٹے کی گواہی بہت ضروری ہے۔ انھیں گواہی کے لیے طلب کیا

Scanned with CamScanner

سکھاتے: جناب والا، میں آپ کی توجہ اس طرف دلانا چاہتا ہوں کہ میرے گواہ نے کیا دیکھا۔ اور یہ تو وہی جانتا ہے کہ وہ یہ بیان کرتے ہوئے ٹھٹھک کیوں گیا۔ میری گزارش ہے کہ اس نے جو دیکھا ہے اسے ریکارڈ میں لایا جائے۔ ایک غیر جانبدار سننے والا بھی اس بیان سے یہ جان سکتا ہے کہ مس بینارے کا طرزِ عمل اس موقعے پر بہت مشتبہ تھا۔

بینارے: اس سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کل کو میں اپنے پرنسپل کے کمرے میں بھی دیکھی جا سکتی ہوں۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میرا طرزِ عمل مشتبہ ہے؟ پتا ہے آپ کو ہمارے پرنسپل صاحب کی عمر اس وقت کیا ہے؟ پینسٹھ کے پیٹے میں ہیں۔

سکھاتے: جناب والا، میری درخواست ہے کہ ملزمہ کے اس بیان کو بھی نوٹ کیا جائے کیوں کہ ہم اسے شہادت کے طور پر پیش کریں گے۔

بینارے: اگر آپ چاہیں تو پچیس ایسے آدمیوں کے نام اور پتے آپ کو فراہم کر سکتی ہوں جن سے میں تنہائی میں مل چکی ہوں۔ مشتبہ طرزِ عمل، ہُنہ! آپ لوگ تو سیدھے سیدھے لفظوں کے معنی بھی نہیں جانتے۔

(کارنک پونکشے کو دیکھ کر اشارہ کرتا ہے۔)

سکھاتے: جناب والا، میں اس بیان کو بھی ایک قیمتی شہادت تصور کرتا ہوں۔ میری درخواست ہے کہ اسے بھی نوٹ کیا جائے۔

کاشیکر: (دانت کریدتے ہوئے) کون سا بیان؟ یہ بیان کہ آپ کو لفظوں کے معنی بھی نہیں آتے؟

سکھاتے: نہیں۔ یہ بیان کہ پچیس مردوں کے نام اور پتے جن سے موصوفہ کسی بھلے وقت میں ـــ

بینارے: ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اور مسٹر سامنت، ہم دونوں اکیلے میں مل رہے تھے۔ تو ان کا نام بھی لکھ لیں۔ لکھیں نا۔ کیوں نہیں لکھتے؟

سامنت: (اچانک سٹپٹا کر کھڑا ہو جاتا ہے) نہیں نہیں، یہ خاتون مجھ سے بہت شریفانہ طریقے سے ملی تھیں۔ کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی۔ بس ہم میجک شو اور مسمریزم کی باتیں کرتے رہے تھے۔ اور بھی بس اسی قسم کی باتیں ہم نے کی تھیں۔

سکھاتے: جناب والا، میری گزارش ہے کہ مسمریزم کا حوالہ بہت معنی خیز ہے۔ نوٹ کیا جائے۔

کاشیکر: لیکن سکھاتے جی، یہ باتیں کس حد تک عدالت کے دائرۂ اختیار میں آتی ہیں؟

کارنک: جناب، یہ تو ریہرسل ہے، صرف ریہرسل۔

پونکشے: صرف دل لگی۔ اسے کھیل کے طور پر لیجیے۔ اس کے بارے میں کسی کو بہت سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس دل لگی ہے۔ ہاں تو سکھاتے جی، آپ جاری رہیے۔ (کارنک سے) یار،

یہ نوجوان تو اچھا خاصا وکیل ہے۔ پھر اس کی وکالت چلتی کیوں نہیں ہے؟

سامنت: (مسز کاشیکر سے) مسمریزم سے میرا مطلب صرف اتنا تھا۔۔۔ کوئی خاص مطلب نہیں تھا۔۔۔ بس یہی کہ مسمریزم۔۔۔

پونکشے: (سامنت کو بٹھاتے ہوئے) بیٹھ جائیں۔ بس دل لگی ہے۔

کارنک: سکھاتے جی رکیے مت۔ سماعت جاری رہنی چاہیے۔ کیوں میڈم، آپ کا کیا خیال ہے؟

مسز کاشیکر: ارے بہت لطف آرہا ہے۔ سکھاتے جی رکیے مت۔ بس جاری رہیے۔

سکھاتے: (اس داد سے خوش نظر آتا ہے) مسٹر روکڑے، اب آپ جاسکتے ہیں۔

(بالو اطمینان کا سانس لیتا ہے اور گواہوں کے کٹہرے سے نکل کر سیدھا عقبی کمرے میں چلا جاتا ہے۔)

سامنت جی، اب آپ تشریف لائیں۔

سامنت: (گھبرا کر کھڑا ہو جاتا ہے) میں؟ میرا نام لیا آپ نے؟

سکھاتے: ہاں۔ تشریف لائیے۔

(سامنت جھجکتا جھجکتا گواہوں کے کٹہرے میں پہنچتا ہے۔)

ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ بس آپ کو چند سوالوں کا جواب دینا ہے۔

سامنت: یعنی جو سوال مجھ سے کیے جائیں ان کے جواب؟

سکھاتے: آپ تو واقعی بہت سمجھدار آدمی ہیں۔

مسز کاشیکر: گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ یہ ریہرسل ہے۔ شو تو رات کو ہوگا۔

سامنت: ہاں ٹھیک ہے۔ شو تو رات کو ہوگا۔ تو میں گھبرایا ہوا تو نہیں ہوں۔ ہاں بس ذرا عجیب سا لگ رہا ہے۔ (سکھاتے سے) میں حلف اٹھا دوں گا تاکہ ذرا مشق ہو جائے۔

سکھاتے: ٹھیک ہے۔ (بہ آوازِ بلند) حاجب مسٹر بالو۔

(بالو نہیں ہے۔)

سامنت: شاید وہ کہیں اندر ہیں۔ خیر، میں یہ فرض خود انجام دوں گا۔

(بڑھ کر ڈکشنری کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس پر ہاتھ رکھ کر)

میں، رگھوناتھ بھیکاجی سامنت، حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ جو کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔ یعنی جو مقدمے کے حساب سے سچ ہو۔ ویسے تو یہ سب ناٹک ہے۔ میں تو صرف مشق کرنے کے خیال سے حلف اٹھا رہا ہوں۔

(اس کا ہاتھ ابھی تک ڈکشنری پر ہے۔)

آپ جانتے ہیں، میں جھوٹ بولنے کا پاپ نہیں کرنا چاہتا۔ (معذرت خواہانہ لہجے میں) اصل میں میں

Scanned with CamScanner

کافی مذہبی آدمی ہوں ــــ حلف پورا ہو گیا۔

(دوبارہ گواہوں کے کٹہرے میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

(سکھاتمے سے) جی، شروع کیجیے۔ (مسز کاشیکر سے) دیکھا آپ نے؟ میں ڈر تو نہیں رہا ہوں۔ بس کچھ عجیب سا لگ رہا ہے، کیوں کہ میرے لیے یہ سب نیا ہے۔ (سکھاتمے سے) شروع کیجیے۔

سکھاتمے: نام، پیشہ۔ ٹھیک، آگے چلیے۔

سامنت: نہیں نہیں۔ آپ یہ سب پوچھنا چاہتے ہیں؟ تو پوچھیے۔

سکھاتمے: نہیں۔ ہاں تو مسٹر۔۔۔

سامنت: سامنت۔ پتا نہیں لوگ میرا نام کیوں بھول جاتے ہیں۔ مجھے بار بار یاد دلانا پڑتا ہے۔

سکھاتمے: ٹھیک ہے۔ ہاں تو مسٹر سامنت، کیا آپ ملزمہ مس بینارے کو جانتے ہیں؟

سامنت: (فخر سے) جانتا ہوں۔ لیکن زیادہ نہیں۔ آخر آپ ڈیڑھ دو گھنٹے کی ملاقات میں کسی کو کتنا جان سکتے ہیں۔ بہرحال میری ان سے شناسائی ہے۔ بہت اچھی خاتون ہیں۔

سکھاتمے: لیکن آپ نے ملزمہ کے بارے میں جو بھی رائے قائم کی ہے اسے عدالت میں قابلِ اعتبار نہیں مانا جائے گا۔

سامنت: ہاں ٹھیک ہے۔ مگر میں۔ نہیں۔ آخر کیوں اسے قابلِ اعتبار نہیں مانا جائے گا؟ میری ماں تو ایک منٹ میں آدمی کو پہچان لیتی تھی۔ بس چہرہ دیکھا اور جان لیا کہ وہ کیسا ہے۔ لیکن اب تو اس بیچاری کو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔

(بالو عقبی کمرے سے واپس آ کر اپنی نشست پہ بیٹھ جاتا ہے۔ بینارے نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔)

بیچاری، سو گئی ہے۔ (لہجہ بدل کر) میرا مطلب ہے مس بینارے۔

بینارے: میں جاگ رہی ہوں۔ میں تو اس طرح سو ہی نہیں سکتی۔ گر میں یہ چاہوں کہ سو جاؤں تو پھر میں نہیں سو سکتی۔

سامنت: میرے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ میں جب چاہوں سو سکتا ہوں۔ (سکھاتمے سے) آپ اپنے بارے میں ذرا بتائیں۔

سکھاتمے: سونے کے معاملے میں میری عادات بالکل مختلف ہیں۔ جب سونے پہ آتا ہوں تو پلک جھپکتے سو جاتا ہوں۔ ورنہ یہ ہوتا ہے کہ گھنٹوں کروٹیں بدلتا ہوں اور نیند نہیں آتی۔

کاشیکر: (اکتا کر دیتے ہوئے) سکھاتمے جی، یوں کریں کہ تھوڑا سرسوں کا تیل ہتھیلی پہ لے کر سر پہ ملیں۔ خوب رگڑیں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ سماجی مسائل کتنے ہی پریشان کن ہوں، سرسوں کا تیل مل لو، آرام سے نیند آ جائے گی۔ سکون سے سوؤ گے۔ گر آپ کے دماغ ہی کو سکون نہیں

ہے تو پھر سماجی سمسیائیں کیسے حل ہوں گی؟ سب سے اہم چیزیں دو ہیں۔ آپ کا دماغ اور آپ کا باطن۔ دونوں کو برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ دماغ کو اور باطن کو۔

سامنت: جی ہاں۔ (سکھاتمے سے) اچھا تو اب سوالوں کی طرف آتے ہیں۔

سکھاتمے: (چھڑی لے کر) ہاں تو مسٹر۔۔۔

سامنت: سامنت۔

سکھاتمے: دیکھیے مسٹر بالو روکڑے نے ملزمہ کو یعنی مس بینارے کو پروفیسر داملے کے کمرے میں دیکھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔

سامنت: ٹھیک۔

سکھاتمے: اس وقت کوئی تیسرا وہاں نہیں تھا۔ پروفیسر داملے تھے اور مس بینارے تھیں، یعنی ملزمہ۔

سامنت: ٹھیک ہے۔ مگر مجھ سے بھی تو کچھ پوچھیے۔

سکھاتمے: آپ ہی سے تو اب میں پوچھنے والا ہوں۔ اس کے آدھ گھنٹے بعد آپ وہاں پہنچے۔

سامنت: کہاں پہنچا؟ وہاں؟ نہیں نہیں۔ بالکل نہیں۔ وہ کمرہ تو بمبئی میں تھا۔ اور میں یہاں اس بستی میں رہتا ہوں۔ بالکل احمقانہ بات ہے۔ میں ان کے کمرے میں کہاں سے کیسے چلا جاتا؟ آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟

سکھاتمے: آپ وہاں پہنچے۔

سامنت: وکیل صاحب، یہ آپ کیا کھچڑی پکا رہے ہیں؟

سکھاتمے: سامنت جی، اس عدالت کے ناٹک کی خاطر ہم کچھ باتیں فرض کیے لیتے ہیں۔

کارنک: جرم کو تو پہلے ہی فرض کر لیا ہے۔ اب اور کیا کیا آپ فرض کریں گے؟ سارا قصہ ہی فرضی ہے۔

پونکشے: بس ملزمہ اصلی ہے۔

سامنت: (سر کھجاتے ہوئے) میری تو مت ماری گئی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ (سکھاتمے سے) اچھا صاحب۔ مان لیا۔ آدھ گھنٹے بعد میں پروفیسر داملے کے کمرے پر پہنچا۔ پھر کیا ہوا؟

سکھاتمے: یہ تو آپ ہمیں بتائیں گے۔

سامنت: آپ کو میں کیا بتاؤں؟

سکھاتمے: آپ نہیں بتائیں گے تو پھر کون بتائے گا؟

سامنت: یہ بھی ٹھیک ہے۔ گویا مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ لیکن بہت مشکل ہے بتانا۔ ملزمہ، پروفیسر داملے۔۔۔ پروفیسر داملے کا کمرہ۔ شام کا وقت۔

Scanned with CamScanner

پونکشے: اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔

کارنک: اس کے آدھ گھنٹے بعد۔ دوسرے لفظوں میں اس وقت جب بالکل اندھیرا ہو گیا تھا۔ کالج کی ساری گراؤنڈ میں بالکل خاموشی تھی۔ یہاں سے وہاں تک سناٹا۔

سامنت: (اچانک مستعد ہو کر) ہاں آگے چلیے۔ پوچھیے کیا پوچھتے ہیں۔ تو میں وہاں پہنچا۔ پہنچ گیا۔ پھر کیا ہوا — دروازہ بند تھا۔

سکھاتمے: تو دروازہ بند تھا!

سامنت: ہاں، دروازہ بند تھا۔ باہر سے نہیں۔ اندر سے بند تھا۔ میں دروازہ پیٹنے لگا۔ نہیں۔ یہ غلط ہے۔ میں نے گھنٹی بجائی — دروازہ کھلا۔ ایک اجنبی شخص میرے سامنے کھڑا تھا۔ اندازہ لگایئے وہ کون تھا۔ پروفیسر داملے! میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ تو میرے لیے تو وہ اجنبی ہی ہوئے۔

پونکشے: شاباش سامنت جی!

مسز کاشیکر: (کارنک سے) سامنت جی تو بڑے کمال کے ساتھ گواہی دے رہے ہیں۔

سامنت: (اعتماد سے) داملے جی میرے سامنے کھڑے تھے۔ جب انھوں نے مجھے دیکھا تو چڑ کر کہا، "فرمایئے، آپ کو کس سے ملنا ہے؟"

پونکشے: (کارنک سے) یار میرے نے داملے جی کا کیسا سچا نقشہ پیش کیا ہے۔

سامنت: میں نے جواب دیا، "پروفیسر داملے سے ملنا ہے۔" انھوں نے مجھے دیکھا۔ کہا، "پروفیسر داملے یہاں نہیں ہیں"، اور دھڑ سے دروازہ بند کر لیا۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیدھے سیدھے واپس چلا جاؤں یا ایک دفعہ پھر گھنٹی بجاؤں۔ آخر میں ایک اہم پیغام لے کر آیا تھا۔

سکھاتمے: کیا پیغام تھا؟

سامنت: کیا پیغام؟ ارے صاحب کچھ ہی سمجھ لیجیے۔ فرض کر لیجیے کہ میں پروفیسر داملے سے ایک لیکچر کی درخواست کرنے آیا تھا۔ آخر وہ پروفیسر ہیں، لیکچر دیتے ہیں۔ میں بھی تو یہی سوچ کر لیکچر کی درخواست لے کر آیا تھا کہ یہ پروفیسر آدمی ہیں۔ اسی گھڑی مجھے کمرے سے مدھم سی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی رو رہا ہے۔

مسز کاشیکر: کوئی رو رہا ہے؟

سامنت: ہاں۔ صاف تو سنائی نہیں دے رہا تھا۔ مگر تھی رونے کی آواز۔ کسی عورت کے رونے کی آواز۔

سکھاتمے: (تجسس سے) اچھا؟

سامنت: گھڑی بھر کے لیے تو وہ کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ بھی نہیں۔ اس کی، یعنی میری سمجھ میں نہیں

Scanned with CamScanner

آرہا تھا کہ یہ کون عورت رو رہی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ واسطے جی کے گھر کوئی عورت رو رہی ہو گی۔ مگر جس طرح وہ رو رہی تھی وہ کوئی گھر کی عورت نہیں ہو سکتی تھی۔ بہت دھیمی آواز سے رو رہی تھی، جیسے ڈر رہی ہو کہ کوئی سن نہ لے۔ بھلا گھر کی عورت ایسے کیوں رونے گی؟ اسے کس کا ڈر ہو گا؟ اپنے گھر میں کوئی عورت کیوں ڈر ڈر کے روئے گی؟ تو یہی سوچ کر میں جہاں کا تہاں کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں مجھے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔

مسز کاشیکر: کس کے بولنے کی؟

کارنک اور پونکشے: کس کی آواز تھی؟

سامنت: دیکھیے آپ لوگوں کو مجھ سے کچھ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔ جو بھی پوچھنا ہے وکیل صاحب مجھ سے پوچھیں۔

سکھاتمے: کون بول رہا تھا؟

سامنت: آواز تو عورت کی تھی۔

مسز کاشیکر: ہائے رام! عورت کی آواز؟ کون تھی؟ کیا کہہ رہی تھی؟

(نادانستہ بینارے کی طرف نظر ڈالتی ہے۔)

سامنت: جی نہیں۔ آپ مجھ سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔ وکیل صاحب پوچھیں۔

سکھاتمے: میں پوچھ رہا ہوں۔ بتائیے۔ وقت مت ضائع کیجیے۔ جلدی بتائیے۔ آپ نے کیا سنا؟ ہاں بتائیے۔

سامنت: الفاظ کچھ اس طرح کے تھے۔۔۔۔ بتا دوں؟ ساری بات بتا دوں؟

سکھاتمے: ہاں ہاں بتائیے۔ جو کچھ بھی آپ نے سنا ہے وہ بتائیے۔

سامنت: (ہاتھ میں جو کتاب ہے اس پر اڑتی سی نظر ڈالتے ہوئے) "گر تم نے مجھے اس حال میں چھوڑ دیا تو بتاؤ میں کہاں جاؤں گی۔ میرا کہاں ٹھکانا ہے؟

(بینارے کے چہرے پر تناؤ آجاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: اچھا؟ یہ کہہ رہی تھی؟

سامنت: "میں کیا بتا سکتا ہوں؟"

سکھاتمے: پھر کون ہمیں بتائے گا؟

سامنت: نہیں نہیں۔ یہ تو وہ جواب ہے جو پروفیسر داملے نے اس عورت کو دیا تھا۔ میں تو ان کا جواب آپ کو سنا رہا ہوں۔ پروفیسر داملے کا جواب۔

سکھاتمے: اچھا اچھا۔

سامنت: "تم کہاں جاؤ گی، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ مگر میں کیا کر سکتا ہوں۔

لے اپنی موت کا ہی تو خیال رکھا ہے۔ اس پر وہ بولی، "بڑے آئے عزت والے۔ عزت کے سوا بھی کوئی خیال نہیں آتا ہے؟ تمہارا پتھر کا دل ہے۔ پتا ہے اس کا کیا جواب آیا؟ "فطرت بہت پتھر دل ہوئی ہے۔

کاشیکر: (تیزی سے کان کریدتے ہوئے) ہوں۔ ہوں۔

سکھاتمے: حیرت ہے۔ بہت حیرت ہے۔

سامنت: اگر تم نے مجھے چھوڑا تو میں خودکشی کر لوں گی۔ ادھر سے جواب آیا، اچھا تو کر لو خودکشی۔ میں مجبور ہوں۔ اگر تم نے خودکشی کر لی تو مجھے دکھ بہت ہوگا۔'

سکھاتمے: یہ تو پورا ڈراما ہے ڈراما۔

سامنت: لیکن تمہاری اس دھمکی کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ میں نے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ وہ فیصلہ قائم رہے گا۔ یہ سن کر وہ بولی، ایک بات یاد رکھو کہ احساسِ جرم تمہیں بہت ستائے گا۔ تم پر دو جانوں کا خون ہوگا۔ دو جانوں کا۔ میں غلط کہہ رہی ہوں؟ نہیں، بالکل صحیح کہہ رہی ہوں۔ دو جانوں کا خون۔ اور اس کے بعد ایک سنگ دلانہ قہقہہ سنائی دیا۔

بینارے: (اچانک شدت سے) بس ہو گیا!

کاشیکر: (ہوش میں آ کر) آرڈر! آرڈر!

بینارے: یہ من گھڑت ہے۔ جھوٹ، سفید جھوٹ!

پونکشے: ہاں جی، پھر؟

کارنک: اگر یہ جھوٹ ہی ہے تو بہت زوردار جھوٹ ہے۔

مسز کاشیکر: سامنت، تم اپنا بیان جاری رکھو۔

بینارے: (چلا کر) نہیں۔ بند کرو یہ بکواس!

سامنت: (سہم کر) مگر بات کیا ہے؟

بینارے: یہ بکواس بند کرنی ہوگی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ اس میں کوئی ایک بات بھی صحیح نہیں ہے۔

سامنت: بالکل۔ اس میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں ہے۔

بینارے: یہ سب من گھڑت ہے۔

سامنت: ہاں، من گھڑت تو ہے۔

بینارے: تم سفید جھوٹ بول رہے ہو۔

سامنت: دیکھیے (کتاب جو چھپا رکھی تھی دکھاتے ہوئے) میں تو جو اس کتاب میں لکھا ہے وہ بول رہا ہوں۔

سکھاتے: ہاں مسٹر سامنت۔ ایک سنگ دلانہ قہقہہ۔ اس کے بعد کیا ہو؟

بینارے: اگر اب کسی نے ایک بات بھی کہی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔

سکھاتے: ہاں مسٹر سامنت۔

بینارے: میں اس سب کے پرخچے اڑا دوں گی۔ ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔

مسز کاشیکر: لیکن میری بی بی، اگر تمہارا ضمیر صاف ہے تو پھر تمہیں غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

بینارے: آپ لوگوں نے جان بوجھ کر میرے خلاف یہ جال بچھایا ہے۔ یہ میرے خلاف سازش کی گئی ہے۔

سامنت: نہیں مس صاحب، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔

سکھاتے: مسٹر سامنت، جواب دیجیے۔ پروفیسر داسلے نے ایک ظالمانہ قہقہہ لگایا۔ پھر اس عورت نے، اس نامعلوم عورت نے جو کمرے کے اندر تھی، کیا کہا؟

سامنت: (جلدی جلدی کتاب کے ورق پلٹتا ہے) آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ صفحہ مل نہیں رہا۔ ابھی وہ صفحہ ڈھونڈ کر جواب دیتا ہوں۔

بینارے: سامنت، اگر اب تم نے ایک لفظ بھی منھ سے نکالا تو سمجھ لو۔۔۔ بس سمجھ لو کہ کیا کروں گی۔

سکھاتے: (نرم مگر دھمکی آمیز لہجے میں) مسٹر سامنت!

سامنت: یہ تو بڑا مسئلہ بن گیا۔ کمبخت وہ صفحہ ہی نہیں مل رہا۔

سکھاتے: (کاشیکر سے) جناب والا، واقعہ جس طرح بیان کیا گیا ہے وہ تو واضح ہے کہ اس میں مزید اضافے کی مطلق حاجت نہیں۔ اس پورے واقعے کو نوٹ کیا جائے اور اسے ملزمہ کے خلاف شہادت کا جز سمجھا جائے۔

کاشیکر: درخواست منظور کی جاتی ہے۔

بینارے: نوٹ کیجیے۔ ہاں ہاں، ضرور نوٹ کیجیے۔ نوٹ کرتے چلے جائیے۔ (یکایک آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ آواز رندھ جاتی ہے۔ پھر جیسے راحت پر آمادہ ہو۔) آپ لوگ میرا کیا کریں گے؟ کوشش کر دیکھیں۔

(آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ وِنگ میں نکل جاتی ہے۔ خاموشی چھا جاتی ہے۔ ہر چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت کی کیفیت ہے۔ حرارت کی ایک لہر دوڑتی نظر آتی ہے۔ سوائے سامنت کے جو ہونق بنا کھڑا ہے۔)

سامنت: ہے رام! اس خاتون کو یکایک یہ کیا ہو گیا؟

کاشیکر: (اعلان کرتے ہوئے) غیر متوقع طور پر یہ سب کچھ ہوا ہے۔ سکھاتمے جی، عجب زمانہ آیا ہے۔ ہماری سوسائٹی کا کیا حال ہو گیا ہے۔ آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ گندگی۔ سرتاسر گندگی۔ کوئی گوشہ ایسا بچا ہے جو پاک صاف ہو۔

سکھاتمے: اس لیے کاشیکر جی، سوچنے والوں کا، ہم جیسے لوگوں کا، فرض ہے کہ ان معاملات پر سنجیدگی اور ذمہ داری سے غوروفکر کریں۔

مسز کاشیکر: بھائی آپ ٹھیک کہتے ہیں۔

سکھاتمے: لیکن صرف غوروفکر کافی نہیں ہے۔ ہمیں کچھ کرنا چاہیے۔ اس وقت عمل کی ضرورت ہے۔ کیوں کارنک جی؟

کارنک: صحیح کہا۔ عمل وقت کا تقاضا ہے۔ عمل۔

پونکشے: درست کہا۔

سکھاتمے: خالی افسوس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہمیں مل کر کچھ کرنا چاہیے۔

مسز کاشیکر: لیکن کیا یہ سب کچھ، یعنی جو کچھ بھی ہوا واقعی ہوا ہے؟

کاشیکر: خاموش! سکھاتمے جی، آپ کا کیا خیال ہے؟ واقعہ کیا ہوا؟ آپ کا قیاس کیا کہتا ہے؟

(سامنت حق دق کھڑا ہوا ہے۔ سہما سہما سا۔)

سکھاتمے: (جیسے سب کچھ جانتا ہو) یہ تو راز کی بات ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ اس راز کا جواب ہمارے پاس ہے۔

کارنک، پونکشے، بالو، کاشیکر، مسز کاشیکر: کیا؟

(بینارے غسل خانے سے واپس آتی ہے اور دروازے میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ مگر سکھاتمے اس کی موجودگی سے بے خبر ہے۔)

سکھاتمے: بھئی، اس سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ واضح ہے۔ سامنت جی نے جو کچھ کہا ہے اس میں کچھ وزن ضرور ہے۔ اگرچہ سارا مضمون کتاب سے آیا ہے مگر اس میں وزن ہے ضرور۔

مسز کاشیکر: اے بھیا، کیا تمہارا مطلب ہے بینارے اور پروفیسر دام---

سکھاتمے: ہاں ہاں بالکل۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں ہونا چاہیے۔

مسز کاشیکر: ہائے رام!

بالو: (ڈرتے ڈرتے ہوئے) مجھے تو پہلے سے ساری بات کا پتا تھا۔

سکھاتمے: (بینارے کو دیکھ کر منہ پر انگلی رکھتے ہوئے) خاموش!

(بینارے کو دروازے میں کھڑے دیکھ کر سب خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ آ کر پہلا بیگ اٹھاتی ہے۔ دوسرے دروازے کی طرف جاتی ہے اور گھنٹی گھماتی ہے۔

(دروازہ نہیں کھلتا۔ سب کی نظریں اس پہ جمی ہوئی ہیں۔ چٹخنی پھر گھماتی ہے۔ کھینچتی ہے۔ دروازہ نہیں کھلتا۔ زور سے دروازہ پیٹتی ہے۔ لیکن دروازہ مقفل ہے۔ سوائے سامنت کے ہر ایک کے چہرے پہ خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔)

سامنت: دروازہ باہر سے بند ہو گیا ہے۔ (اٹھ کر جاتا ہے اور دروازے کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔) اس دروازے کے ساتھ یہی تو مشکل ہے کہ اگر اندر آتے ہوئے چٹخنی ٹھیک طرح نہ گھمائی جائے تو دروازہ باہر سے بند ہو جاتا ہے۔ کتنی ہی کوشش کرو کھلتا نہیں۔ اور چونکہ ان اوقات میں دفتر بھی بند ہو جاتے ہیں اس لیے اس وقت کوئی نہیں ہوگا جو باہر سے کھولے۔

(بار بار دروازے کو کھینچتا ہے۔ دروازہ نہیں کھلتا۔ آ کر ایک طرف کھڑا ہو جاتا ہے۔)

تالا بند ہو گیا۔

(بینارے ابھی تک اسی طرح کھڑی ہے۔ اس کی پشت دوسروں کی طرف ہے۔)

کاشیکر: (کان کو بکوئی سے کریدتے ہوئے) سکھاتمے جی، ان حالات میں میرا خیال ہے کہ مقدمے کی کارروائی جاری رہنی چاہیے۔

سکھاتمے: (وکیلوں کے انداز میں جھکتے ہوئے جبکہ چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہے) بجا ارشاد فرمایا جناب والا! (آنکھوں میں چمک آ جاتی ہے) جناب والا ملزمہ کو گواہوں کے کٹہرے میں آنے کا حکم صادر کیا جائے۔

تیسرا ایکٹ

(اسٹیج کا وقت۔ سارا منظر وہی ہے اور کردار اسی حالت میں ہیں جس حالت میں پہلے
ایکٹ کے ختم پر تھے۔)

سکاٹے: (وکیلوں والے انداز میں جھک کر جبکہ فاتحانہ خوشی چہرے سے ظاہر ہے) جناب والا،
پہلے خود ملزمہ کو گواہوں کے کٹہرے میں طلب کیا جائے۔

کاشیگر: (کاغذ کریدتے ہوئے) قیدی مس بیتنارے کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ گواہوں کے
کٹہرے میں آ کر کھڑی ہو۔ آؤ مس بیتنارے!

(بیتنارے اپنی جگہ سے مطلق نہیں ہلتی۔)

یہ گستاخی ہے۔ عدالت میں ایسی گستاخی! حاجب بالو کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ ملزمہ کو گواہوں کے
کٹہرے میں لا کر کھڑا کرے۔

مسز کاشیگر: ٹھہریے۔ میں اسے لے کر آتی ہوں۔

(وہ بیتنارے کو زبردستی گھسیٹتی ہوئی گواہوں کے کٹہرے کی طرف لاتی ہے۔)

بیتنارے: چلو جی۔ چلو۔

(مسز کاشیگر بیتنارے کو کٹہرے میں کھڑا کر دیتی ہے۔ بیتنارے کی ایسی کیفیت ہے
جیسے کوئی جانور ہو اور جال میں پھنس گیا ہو۔)

سکاٹے: (وکیلوں والا گاؤن پہنتے ہوئے) جناب والا، مقدمے نے جو سنگین صورت اختیار کر لی
ہے، اس کے پیش نظر میری یہ گزارش ہے کہ اگر جناب والا بھی گاؤن پہن لیں تو مناسب ہو۔

کاشیگر: بجا کہا۔ بالو مجھے میرا گاؤن دو۔

(بالو گاؤن پیش کرتا ہے۔ کاشیگر گاؤن زیب تن کرتا ہے۔ اس میں جج والا وقار پیدا ہو

جاتا ہے۔)

سکھاتمے: مسٹر سامنت، مسٹر پونکشے، مسٹر کارنک، مسز کاشیکر۔ مہربانی فرما کر آپ اپنی اپنی جگہ تشریف رکھیں۔

(سیدھا کھڑا ہو کر آنکھیں موند لیتا ہے۔ پھر آنکھیں کھول کر توبہ کا انداز اختیار کرتا ہے۔)

میرے پتاجی نے مجھے سکھایا تھا کہ کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے ایشور سے دعا مانگو۔ اس سے دل مضبوط ہوتا ہے۔

(دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ پھر آگے بڑھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ بینارے بُت بنی کھڑی ہے۔)

کاشیکر: (اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے) قیدی مس بینارے کو حلف اٹھانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔

(بینارے خاموش رہتی ہے۔)

سکھاتمے: (آہستہ سے) مس بینارے، حلف اٹھالو۔ یہ تو کھیل ہے۔

(بینارے خاموش رہتی ہے۔)

مسز کاشیکر: (آگے بڑھ کر) مجھے دیں۔ میں اس بی بی سے حلف اٹھواؤں گی۔ ذرا دیکھتے رہیے۔ (بالو سے ڈکشنری لے کر) بینارے کہو، "میں حلف اٹھا کر کہتی ہوں کہ جو کہوں گی سچ کہوں گی، بالکل سچ، صرف اور محض سچ۔"

(بینارے خاموش رہتی ہے۔)

کاشیکر: حد ہو گئی۔

مسز کاشیکر: (ڈکشنری بالو کو واپس دیتے ہوئے) سمجھ لیجیے کہ اس نے حلف اٹھا لیا۔ آخر اس کا ہاتھ تو ڈکشنری پر ہی تھا۔ سکھاتمے جی، جرح شروع کیجیے۔ پوچھیے جو پوچھنا ہو۔

کاشیکر: قیدی مس بینارے، عدالت تمھیں متنبہ کرتی ہے، اب تمھاری طرف سے ایسی کسی حرکت کا ارتکاب نہیں ہونا چاہیے جس سے توہینِ عدالت کا پہلو نکلے۔ ہاں مسٹر سکھاتمے، آغاز کیجیے۔

کارنک: چلائیے گولی!

سکھاتمے: (کچھ دیر بینارے کے سامنے ٹہلتا ہے۔ پھر انگلی سے اشارہ کر کے) آپ کا نام کیا ہے؟ لیلا واسلے؟

سامنت: (جلدی سے) نہیں نہیں۔ واسلے جی تو پروفیسر ہیں۔ یہ مس بینارے ہیں۔

مسز کاشیکر: سامنت! تم تحمل سے سنو۔ اسے خود جواب دینے دو۔

(بینارے کا انداز ایسا ہے جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔)

سکھاتمے: مہربانی فرما کر آپ عدالت کو یہ بتائیں کہ آپ کی عمر کیا ہے؟

(بینارے پھر خاموش رہتی ہے۔)

کاشیکر: قیدی بینارے، تم اس وقت گواہوں کے کٹہرے میں ہو۔ جو سوال تم سے کیا جائے اس کا جواب تم پر واجب آتا ہے۔ (وقفہ) قیدی بینارے، تمھیں کس بات کا انتظار ہے؟ جواب دو۔

مسز کاشیکر: اسے اپنی عمر بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں بتائے دیتی ہوں۔ بس بتیس تینتیس کے بیچ میں ہوگی۔ یا شاید ایک ڈیڑھ سال زیادہ ہو۔ کم نہیں ہے۔ صورت دیکھ لو۔ بس اتنی ہی عمر ہوگی۔

سکھاتمے: مسز کاشیکر، آپ کا بہت بہت شکریہ۔

کاشیکر: ٹھہریے۔ آپ نے یہ جو کہا ہے کہ "مسز کاشیکر، آپ کا بہت بہت شکریہ"، اس سے آپ کی مراد کیا ہے؟ ملزمہ نے تو ابھی تک اپنی عمر نہیں بتائی ہے۔ میں بغور سن رہا ہوں۔ ہاں تو قیدی بینارے، تمھاری عمر کیا ہے؟

مسز کاشیکر: لیکن میں۔۔۔۔

کاشیکر: (بات کاٹتے ہوئے) ملزم سے جب سوال کیا جاتا ہے تو ملزم ہی کو جواب دینا ہوتا ہے۔ کوئی عدالت کسی دوسرے کے جواب کو تسلیم نہیں کرتی۔ عدالت کسی کو مداخلت کی اجازت نہیں دیتی۔ قیدی، تم عدالت میں حاضر ہو۔ تم پر جواب دینا لازم آتا ہے۔ عدالت جواب مانگتی ہے۔

(بینارے خاموش رہتی ہے۔)

سامنت: کسی خاتون سے اس کی عمر پوچھنا آداب کے خلاف بات ہے۔

کاشیکر: یہ گستاخی ناقابلِ برداشت ہے۔ ملزمہ کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی۔ آخر یہ عدالت ہے۔ (میز پر ہتھوڑا مارتا ہے۔)

پونکشے: یہ توہینِ عدالت ہے۔

کاشیکر: ملزمہ کو جواب دینے سے انکار ہے۔ اس کے بارے میں عدالت کو کوئی نہ کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ یہ عدالت کے وقار کا مسئلہ ہے۔ ملزمہ کو دس سیکنڈ کی مہلت دی جاتی ہے۔

(اپنی گھڑی سامنے کرکے دیکھنے لگتا ہے۔)

سکھاتمے: (میلوڈراماتی انداز میں) جنابِ والا میں سوال واپس لیتا ہوں۔ ملزمہ کی خاموشی ہی اصل میں سوال کا جواب ہے۔

کاشیکر: ٹھیک ہے۔ ملزمہ کی عمر چونتیس برس سے کم نہیں ہونی چاہیے۔ میں آپ کو لکھ کر دے سکتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمارے سماج کو اس پرانی رسم کو زندہ کرنا چاہیے جب کم سنی میں

لڑکی کی شادی کر دی جاتی تھی۔ اگر اس رسم کی تجدید ہو جائے تو پھر یہ آزادہ روی اور بے راہ روی ختم ہو جائے گی۔

سکھاتمے: (جھک کر) بجا فرمایا جناب والا نے!

(بالو جلدی جلدی اپنی نوٹ بک میں کاشیکر کے فقرے قلمبند کرتا ہے۔ بینارے خاموش ہے۔)

سکھاتمے: (بینارے کے پیچھے جا کر) مس بینارے!

(بینارے اچھل کر اس سے پرے ہو جاتی ہے۔)

مس بینارے، کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کہ اتنی عمر تک تم بے شادی شدہ کیسے رہیں؟ (رک کر) اچھا میں اپنا سوال دوسری شکل میں پیش کرتا ہوں۔ تمہاری زندگی میں شادی کے کتنے موقعے آئے؟ یہ موقعے تم نے کیوں اور کیسے ضائع کیے؟ عدالت کو بتاؤ۔

کاشیکر: اس سوال کا جواب دیا جائے۔ (جیب سے پھر گھڑی نکال کر سامنے رکھ لیتا ہے) یہ تو واقعی بہت زیادتی ہے۔

مسز کاشیکر: شاید اس نے طے کر لیا ہے کہ ہر سوال پر اَن سنی کر دی جائے۔

سکھاتمے: جناب والا میں فی الحال جرح کا باب بند کرتا ہوں۔ مناسب وقت پر اسے پھر شروع کیا جا سکتا ہے۔

(بینارے گواہوں کے کٹہرے سے نکل کر دروازے کی طرف جاتی ہے۔ دروازہ بند ہے۔ پونکشے رستا روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہ ایک طرف ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں مسز کاشیکر اسے پکڑ دھکڑ کے کٹہرے کی طرف لے جاتی ہے۔)

کاشیکر: اگلا گواہ۔

سکھاتمے: مسز کاشیکر۔

(مسز کاشیکر جھٹ پٹ کٹہرے میں آ کھڑی ہوتی ہے اور بہت اِترا کر اپنی ساڑھی درست کرنے لگتی ہے۔)

کاشیکر: (سکھاتمے سے) ذرا بیگم کا ذوق و شوق ملاحظہ فرمائیے۔ نام منہ سے نکلا نہیں کہ کٹہرے میں آن کھڑی ہوئیں۔

مسز کاشیکر: آپ کو ایسی بات کرنا زیب نہیں دیتا۔ (اعلان کرتی ہے۔ گواہوں والے لہجے میں) میں حلف پہلے ہی اٹھا چکی ہوں۔ بینارے اور میں۔ یوں سمجھیے کہ ہم دونوں نے اکٹھا حلف اٹھایا تھا۔ میں جو کہوں گی سچ کہوں گی۔ میں کوئی ڈرتی ہوں۔

سکھاتمے: خوب مسز کاشیکر، کیا آپ تھوڑی سی معلومات فراہم کرنا پسند کریں گی؟ یہ بتائیے کہ مس

بینارے اتنی عمر تک غیر شادی شدہ کیسے رہیں؟

مسز کاشیکر: ارے یہ بتانا کون سی مشکل بات ہے۔ اس نے شادی نہیں کی اس لیے شادی نہیں ہوئی۔

سکھاتمے: ٹھیک، مگر سیدھے چونتیس برس تک۔۔۔

کاشیکر: ارے کانے ہوئے، چونتیس۔ چونتیس برس کہیے نا۔

سکھاتمے: آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ چونتیس برس تک ایک، بھلی سی تعلیم یافتہ لڑکی۔۔۔

مسز کاشیکر: لڑکی؟ عورت کہیے۔ اگر آپ اسے لڑکی کہتے ہیں تو پھر مجھے نوجوان خاتون کہنے میں آپ کو کیا مضائقہ نظر آتا ہے؟

سکھاتمے: اچھا خیر ہم انھیں عورت کہہ لیتے ہیں۔ مگر اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی؟ آپ اس کی کچھ وضاحت کر سکتی ہیں؟

مسز کاشیکر: ہی وضاحت پہ خاک ڈالو۔ جسے شادی کرنی ہوتی ہے وہ پلک جھپکتے شادی کر لیتی ہے۔

سکھاتمے: آپ کا مطلب ہے کہ مس بینارے چاہتی ہی نہیں تھیں کہ۔۔۔

مسز کاشیکر: اور کیا؟ اس زمانے میں یہی تو قیامت ٹوٹی ہوئی ہے کہ شادی کے بغیر ہی سب کچھ ہو جاتا ہے تو پھر شادی کا جھنجھٹ کیوں مول لیں۔ انھیں تو آرام چاہیے آرام۔ ذمہ داری کی بلا اپنے سر کیوں لیں۔ ارے بھیا، ہمارے وقتوں میں تو یہ تھا کہ لڑکی کیسی ہی ہو، چپٹی ناک والی ہو، کبڑی ہو، فاقوں ماری ہو، جیسی بھی ہو، اس کا بیاہ ہو جاتا تھا۔ یہ تو ملازم پیشہ عورتوں نے آفت ڈھائی ہے کہ جو کام سے اٹھا۔ کسی تو اتنی بے حیائی پھیلی ہوئی ہے۔ (ہار کو لکھتے دیکھ کر) لکھ چکے نا؟

(سکھاتمے سے) اچھا، اور پوچھو۔

سکھاتمے: آپ نے فرمایا کہ جب شادی کے بغیر ہی سب کچھ ہو جاتا ہے تو۔۔۔

مسز کاشیکر: ہاں ہاں میں نے کہا تھا۔ ارے کوئی جھوٹ کہا تھا۔

سکھاتمے: سب کچھ سے آپ کی کیا مراد ہے؟ آپ کوئی مثال دے سکتی ہیں؟

مسز کاشیکر: ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ (اسٹینڈ ہوتی ہے)

کاشیکر: ہاں ہاں کہو۔ بہت شرمیلی بننے کا ڈھونگ نہ رچاؤ۔ سوال کا جواب دو۔ اتنی عمر ہو گئی مگر عقل نہ آئی۔

مسز کاشیکر: اسے سنو، دولہا میری عمر کا اس سے کیا واسطہ ہے؟

کاشیکر: وکیل کے سوال کا جواب دو۔

مسز کاشیکر: سب کچھ سے مراد یہی ہے کہ زندگی میں سب کچھ۔

سکھاتمے: مگر ملزم کے بارے میں یہ کہنا تو بڑی ناانصافی ہے۔

مسز کاشیکر: مجھے تو اس میں کوئی ناانصافی نظر نہیں آتی۔ ایسی بہت سی مثالیں آپ کو مل جائیں گی۔

سکھاتمے: دوسروں کی مثالوں سے ہمیں کیا لینا۔ یہ بتائیے کہ مس بینارے کے بارے میں آپ کے پاس کوئی ایسا ثبوت ہے۔ اگر ہے تو بتائیے۔

مسز کاشیکر: ں کے طور اطوار کو دیکھ لو۔ اس سے بڑھ کے اور کیا ثبوت ہوگا۔ میں کوئی ایسی بات کہنا تو نہیں چاہتی۔ آخر وہ ہم میں سے ہے۔ لیکن عورت کا مرد سے ملنے کا کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے۔ اور کوئی حد ہونی چاہیے۔ اور پھر اگر عورت غیر شادی شدہ ہو۔ بے شک مرد، جنبی نہ ہو، جاننے والا ہی ہو۔ دیکھ نہیں کیسے کھل کھل کر کے ہنستی ہے۔ کیا ناچتی کودتی ہے اور کیسے مذاق کرتی ہے۔ کوئی حیا شرم ہی نہیں۔ مردوں کے ساتھ وقت بے وقت رات گئے دن دہاڑے اکیلی گھومتی پھرتی ہے۔

سکھاتمے: مسز کاشیکر، اس سے آخر کیا ثابت ہوتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ ہم اسے آزاد روی کہہ سکتے ہیں۔۔یہی کہ آزاد خاتون ہے۔

مسز کاشیکر: آزاد ہی آزاد! چلو ہوگی آزاد۔ مگر۔۔۔ خیر، مجھے کہنا تو نہیں چاہیے۔ لیکن اب عدالت میں یہ بات آہی گئی ہے تو کہنا پڑے گا۔ ذرا یہ تھامو۔ (اون کا گولہ اور کروشیا سکھاتمے کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے) بھیا مجھے یہ بتاؤ کہ جب شو ختم ہو جاتا ہے تو پروفیسر داملے ہی کیوں ہمیشہ سے گھر پہنچانے جاتے ہیں۔ آخر پروفیسر داملے ہی کیوں؟ بتائیں نا۔

(بینارے چپ رہتی ہے۔)

سکھاتمے: (پھریری لے کر) اچھا یہ بات ہے۔ تو گویا شو کے بعد پروفیسر داملے گھر چھوڑنے جاتے ہیں۔

(پونکشے اور کارنک ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں۔)

مسز کاشیکر: اور کیا؟ ایک دفعہ ہم، میں اور میرے میاں، یہ پچھلے ستمبر کی بات ہے۔ کیوں جی ستمبر ہی کے تو دن تھے نا؟

کاشیکر: (جج کے لہجے میں) گواہ کو خود جو کہنا ہے وہ کہے۔

مسز کاشیکر: ہاں ہاں، ستمبر ہی کی تو بات ہے۔ ہم دونوں نے اس سے کہا کہ چلو ہم تمہیں چھوڑتے آتے ہیں۔ سوچا کہ کہاں بیچاری اکیلی جائے گی۔ لیکن کس چالاکی کے ساتھ وہ پروفیسر داملے کو لے کر وہاں سے کھسک گئی۔ ہم اسے ڈھونڈتے رہ گئے۔ وہاں ہوتی تو ملتی۔ وہ تو رفو چکر ہو چکی تھی۔

سکھاتمے: (وکیلوں والے لہجے میں جس میں خوشی جھلک رہی ہے) عجیب بات ہے۔

مسز کاشیکر: ابھی تھوڑی دیر پہلے کیسی دہائی دے رہی تھی کہ یہ جھوٹ ہے، یہ سب زیادتی ہے۔ لیکن اب جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہے۔ بس اسی سے پتا چل جاتا ہے کہ سچی بات کو ڈھکا چھپا کے

Scanned with CamScanner

نہیں رکھا جا سکتا۔ اؤ میرا اُون۔

سکھاتمے: (اوں اور کو شہ دیتے ہوئے) مسز کاشیکر، پروفیسر داسے تو شادی شدہ آدمی ہیں۔

مسز کاشیکر: ہاں اور کیا۔ کنبے والا ہے۔ خیر سے پانچ بچے ہیں اس کے۔

سکھاتمے: تو میڈم، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مس بینارے نے یہ سوچ کر پروفیسر داسے کا سہارا لیا ہو کہ ذمے دار آدمی ہے، بزرگ ہے۔

مسز کاشیکر: اے ہے، تو کیا ہم میاں بیوی کوئی آوارہ بدمعاش ہیں؟ اچھا، پروفیسر داسے تو عمر والا آدمی ہے، مگر بالو کے بارے میں کیا خیال ہے؟

(بالو بڑبڑا جاتا ہے۔)

سکھاتمے: (پھریری لیتا ہے) بالو، اس کا کیا ذکر ہے؟ میڈم، بالو کا کیا واقعہ ہے؟

(بینارے کے چہرے پر تناو آجاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: وہی تو میں آپ کو بتانے لگی ہوں۔ ایک شو کے بعد اس بی بی نے اس کے ساتھ نخرے شروع کر دیے۔ اب سوچو کہ رات کا وقت، اندھیرا اور۔۔۔ بالو نے مجھے خود یہ بات بتائی تھی۔ کیوں بالو، تم نے کیا بتایا تھا؟

(کارنک کو چھوڑ کر باقی سب میں ایک کھلبلی سی پڑ جاتی ہے۔ سکھاتمے کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا ہے۔)

بالو: (مری ہوئی آواز میں) ہاں آں نہیں

سامنت: (کارنک سے) نہیں نہیں، غلط بات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے وہ میرے ساتھ تھیں اور۔۔۔

(کارنک اشارے سے اسے چپ رہنے کو کہتا ہے۔)

سکھاتمے: مسز کاشیکر، آپ اب اپنی نشست پر آجائیں آپ کی شہادت مکمل ہو گئی۔ جناب والا، میری گزارش یہ ہے کہ مسٹر بالو روکڑے کو ایک مرتبہ پھر شہادت کے لیے طلب کیا جائے۔

(بالو جہاں بیٹھا ہے وہیں ڈیسک کے پیچھے جاتا ہے۔ سکھاتمے ٹہلتا ہوا بینارے کے قریب جا کر۔)

(بناوٹ کے لہجے میں) مس بینارے، اب ذرا کھیل میں گرمی آئی ہے۔ ہیں، ؟

(بالو جھجکتا ہے۔ پھر بینارے سے آنکھیں چراتے ہوئے جاتا ہے اور گواہوں کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوتا ہے۔)

مسز کاشیکر: (اس وقت جب بالو قریب سے گزر رہا ہے) بالو سچ سچ بتا دینا۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سکھاتمے: (قریب جاکر) مسٹر روکڑے، حلف تو آپ نے پہلے ہی اٹھا لیا تھا۔ اچھا دیکھیے مسٹر روکڑے، بات یہ ہے کہ مسز کاشیکر نے آپ کے اور ملزمہ کے بارے میں ایک بہت ہیجان انگیز بیان دیا ہے۔

(بالو سر ہلاتا ہے۔)

مسز کاشیکر: تم نے مجھ سے کہا نہیں تھا۔

سکھاتمے: مسٹر روکڑے، اُس رات شو کے بعد جو کچھ بھی واقعہ ہوا، اچھا یا بُرا، خوشگوار یا ناخوشگوار، وہ پورا واقعہ آپ عدالت کے سامنے بیان کریں۔ یہ آپ کا فرض ہے۔ ہاں تو جب شو ختم ہو گیا تو پھر کیا ہوا؟

بالو: (گھبرا جاتا ہے) میں۔۔۔ میں۔۔۔

سکھاتمے: شو کے بعد ہم سب تو وہاں سے نکل گئے تھے۔ پھر کیا ہوا؟

کارنک: بس یہ دونوں وہاں رہ گئے تھے۔

مسز کاشیکر: پھر شاید اُس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، میرا مطلب ہے بالو کا۔

پونکشے: اُف!

سکھاتمے: ہاں پھر؟ مسٹر روکڑے، کیا کیا س نے پھر؟ س سے آگے کیا ہوا؟

مسز کاشیکر: میں بتاتی ہوں۔

کاشیکر: نہیں تم نہیں بتاؤ گی۔ بتانا بالو کو ہے۔ تم بار بار بیچ میں مداخلت نہ کرو۔

سکھاتمے: ہاں مسٹر روکڑے، آپ جرأت سے کہہ ڈالیں۔ خوف زدہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔

کاشیکر: خوف زدہ؟ خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر یہ عدالت ہے۔ یہاں ایک ضابطہ، ایک قانون ہے۔

(بالو صورت حال کا جائزہ لیتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے وہ بالکل محفوظ ہے۔ اس میں حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔)

بالو: (جرأت مندی سے) اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

سکھاتمے: ہاں، پھر؟

بالو: پھر میں نے۔۔۔ تو پھر میں نے کہا کہ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ بُری بات ہے۔ میں۔۔۔ میں۔۔۔ میں نہیں پسند کرتا یہ۔ ایسا تمہیں زیب نہیں دیتا۔ بس میں نے یہی کہا تھا۔

سکھاتمے: پھر اس کے بعد؟

بالو: پھر میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ وہ پرے ہٹ گئی۔ کہنے لگی کہ کمنامت کسی سے کہ کیا ہوا تھا۔

پونارے: یہ جھوٹ ہے۔
کاشیکر: (مو کر ی ہو کر) آرڈر! ملزمہ کو سختی سے متنبہ کیا جاتا ہے کہ عدالت کی کارروائی میں مداخلت بے جا نہ کرے۔ ہاں بالو، بیان جاری رہے۔
بالو: اگر تم نے کسی سے کہا تو سمجھ لو کہ تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ وہ کروں گی کہ۔۔۔ بس یہی کہا تھا اس نے مجھ سے، اناجی!
سکھاتمے: مسٹر روکڑے، یہ کس روز کا واقعہ ہے؟
بالو: آٹھ دن پہلے کی بات ہے، جب ہم نے دو جیول میں شو کیا تھا۔
سکھاتمے: جناب والا، اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزمہ نے بالو جیسے لڑکے کے ساتھ، جو اس سے بہت چھوٹا ہے، چھوٹے بھائی کے برابر ہے، اکیلے میں ایسی نازیبا حرکت کی۔ صرف یہی نہیں، بلکہ اسے دھمکی دی کہ اگر یہ بات پھیلی تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ اس نے اپنے پاپ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔
مسز کاشیکر: مگر بھانڈا پھوٹ گیا۔
سکھاتمے: تو مسٹر روکڑے، ملزمہ نے تمہیں گزند پہنچانے کی دھمکی دی۔ اس کے آگے؟ پھر کیا ہوا؟
بالو: (بے ساختہ ہاتھ اپنے رخسار پر لے جاتا ہے) میں نے۔۔۔ میں نے اسے تھپڑ مارا۔
پونکشے: کیا؟
کارنک: بھئی بہت ڈرامائی واقعہ ہے۔
بالو: ہاں۔ میں نے کہا، تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ جو جی ہو میرا کر لو۔ میں چپ نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے تو میں نے بیگم صاحب سے آ کر کچا چٹھا سنا دیا۔ ہاں سچ لیے۔
کاشیکر: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سب کچھ اسی کو بتایا کرو۔ مجھے کچھ مت بتانا۔
بالو: (گڑبڑا سا ہو کر) میں سمجھ رہا تھا۔۔۔ شاید غلط۔۔۔ میں سمجھ رہا تھا کہ آپ کو پتا چل جائے گا۔۔۔ بیگم صاحب سے۔۔۔
سکھاتمے: مسٹر روکڑے، اس کے بعد کیا ہوا؟
بالو: اس کے بعد؟ اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ بس اتنا ہی کچھ ہوا تھا۔۔۔ میں جاؤں؟
سکھاتمے: ٹھیک ہے مسٹر روکڑے۔

(بالو جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالتا ہے، اس پر لکھتا ہے اور ساتھ میں پڑھتا جاتا ہے، "آٹھ دن پہلے کی بات ہے جب ہم نے دو جیول میں شو کیا تھا۔" پھر جلدی سے گواہوں کے کٹہرے سے نکلتا ہے اور وہاں سے فاصلے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ پسینا پونچھتا

ہے۔ اب اس کا ورادم میں دم آیا ہے۔)

مسز کاشیکر: لیکن بالو، یہ جو تم نے بعد میں بات کہی، تھپڑ مارنے والی بات، یہ تم نے مجھے نہیں بتائی تھی۔

سامنت: (پونکشے سے) ناممکن۔ میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

(فضا میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑی ہوئی ہے۔)

پونکشے: (پائپ کا لمبا کش لیتا ہے) سکھاتے جی، اب میری گواہی ہونی چاہیے۔ مجھے گواہ کے طور پر بلوائیے۔ ہاں، مجھے بلائیے اب۔ (اس کی نظریں بینارے پر ہیں۔ بے تابی سے) مجھے بلائیے۔

کاشیکر: سکھاتے جی، ان کا بیان بھی سن لیا جائے۔ انھیں بلائیے۔ ایک دفعہ ان کی بات پوری ہو ہی جائے۔

سکھاتے: مسٹر پونکشے کو گواہ کے طور پر طلب کیا جائے۔

بالو: اگلا گواہ مسٹر پونکشے۔

(پونکشے گواہوں کے کٹہرے میں جا کھڑا ہوتا ہے۔)

پونکشے: کیا مجھے پھر حلف اٹھانا ہوگا؟ میں آکسفورڈ انگلش ڈکشنری پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ میں ۔۔۔

کاشیکر: ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ سکھاتے جی، جرح شروع کیجیے۔

سکھاتے: مسٹر پونکشے، ملزمہ مس بینارے ۔۔۔

پونکشے: (بینارے کی طرف دیکھتے ہوئے) جی جناب، اصل میں مس بینارے ہی کے بارے میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔

(بینارے کے چہرے پر مزید تناؤ آجاتا ہے۔)

جناب، ملزمہ سے یہ پوچھا جائے کہ اس کے پرس میں ہمیشہ ٹِک ٹوئنٹی (TIK 20) کی ایک شیشی کیوں رکھی رہتی ہے۔

(بینارے کو جھرجھری آجاتی ہے۔)

مسز کاشیکر: اب اور کیا کسر رہ گئی ہے!

پونکشے: یہ ایک بہت طاقتور قسم کا زہر ہے جو کھٹملوں کو مارنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مشہور چیز ہے۔

سامنت: (کارنک سے) شاید وہ اسے خرید کے گھر لے جا رہی تھیں۔

سکھاتے: مسٹر پونکشے، کیا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں کہ آپ کو پہلے پہل کب اور کیسے پتا چلا کہ ملزمہ نے اپنے پرس میں مذکورہ زہر کی شیشی رکھی ہوئی ہے؟

(اب ہیمنارے سخت تناؤ کی کیفیت میں ہے۔)

پونگشے: جی ہاں۔ اصل میں مزمہ کی ایک کمسن شاگردہ ہمارے مکان کے ایک حصے میں کرائے پر رہتی ہے۔ دس روز پہلے کا ذکر ہے کہ وہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہماری مس نے آپ کے لیے یہ چیز بھیجی ہے۔

کاشیکر: ٹنک ٹونٹی؟

پونگشے: نہیں جناب، سربمہر لفافہ تھا۔ میں نے اسے کھولا۔ اس کے اندر ایک اور لفافہ تھا۔ وہ بھی سربمہر تھا۔ اسے کھولا تو ایک پرچہ اس میں سے نکلا جس میں لکھا تھا کہ "کیا آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ سو بجے آئیے۔ اسکول کے پرلی طرف جو ریستوراں ہے وہاں میرا انتظار کیجیے۔" مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی۔ لیکن میں نے دل میں کہا کہ دیکھیں تو سہی کہ چکر کیا ہے۔ سو میں وہاں جا پہنچا۔ کوئی پانچ منٹ ہوئے ہوں گے کہ مس ہیمنارے لپک جھپک آئی۔ چہرے سے صاف پتا چلتا تھا کہ کوئی احساسِ جرم اسے ستا رہا ہے۔

(ہیمنا کے یہاں مزید تناؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔)

سکھاتمے: اچھا!

کاشیکر: اچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟

پونگشے۔ کہنے لگی، "یہاں نہیں۔ کوئی ہمیں دیکھ لے گا۔ یہ تو پبلک پلیس ہے۔ فیملی روم میں چلیں۔"

مسز کاشیکر: (طنزیہ) شاباش!

پونگشے: تو ہم فیملی روم میں جا بیٹھے۔ چائے کا آرڈر دیا۔ جب مس ہیمنارے اپنی بات کر چکی تو اس نے رومال نکالنے کے لیے پرس کھولا۔ اس میں سے ایک چھوٹی شیشی نکل پڑی۔

(تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا جاتا ہے۔)

سکھاتمے: ٹنک ٹونٹی کی شیشی۔ خوب۔ لیکن مسٹر پونگشے، اس سے پہلے آپ کے اور مس ہیمنارے کے درمیان کیا بات ہوئی؟ میرا مطلب ہے کہ آخر کس مسئلے پر وہ آپ سے بات کرنا چاہتی تھی؟ آپ نے یہ بات ہمیں نہیں بتائی۔

(ہیمنارے زور زور سے سر ہلا رہی ہے جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ مت کہو۔)

پونگشے: اس نے مجھ سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

کارنک: کیا؟

کاشیکر: کیا؟

(بالو اور دوسرے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔)

Scanned with CamScanner

کاشیکر: سکھاتمے جی، یہ معاملہ تو بہت دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

سکھاتمے: صحیح فرمایا جنابِ والا نے۔ معاملہ دلچسپ ہے۔ اور ابھی تو کچھ دلچسپ باتیں منظرِ عام پر آئیں گی۔ (بینارے کو گھورتے ہوئے) مسٹر پونکشے، کیا اس نے آپ سے اظہارِ محبت وغیرہ بھی کیا تھا؟

پونکشے: نہیں، البتہ اس نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ وہ حمل سے ہے۔

(بینارے جیسے بالکل پتھر کی سی ہو گئی ہے۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ دوسرے لوگ یہ بات سن کر سناٹے میں آ جاتے ہیں۔)

کارنک: پونکشے، کیا تم صحیح کہہ رہے ہو؟

پونکشے: جناب کا کیا خیال ہے؟ یعنی کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں؟

کاشیکر: تھا کون وہ؟ بیان جاری رہے۔ مسٹر پونکشے، آپ رکیے مت۔ بیان جاری رکھیے۔

سکھاتمے: مسٹر پونکشے۔

پونکشے: مس بینارے نے مجھ سے قسم لی ہے کہ میں اس شخص کا نام کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ ابھی تک میں اپنے قول پر قائم ہوں۔

مسز کاشیکر: ارے وہ تھا کون کمبخت؟

کاشیکر: تمھاری زبان کیا بند نہیں رہ سکتی؟ اتنی بے صبری کی آخر ضرورت کیا ہے؟ بلی تو تھیلے سے جلدی ہی باہر آ جائے گی۔ لیکن مسٹر پونکشے، میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی کہ حمل کسی سے ٹھہرا اور شادی کی خواہش کسی اور سے کی جا رہی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ سے۔

پونکشے: ہاں، اصل بات تو یہ ہے۔

سکھاتمے: مسٹر پونکشے، آپ نے جواب کیا دیا؟ کیا آپ اس عالی ظرفی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تیار تھے کہ اس کے ساتھ بچے کو بھی اپنا لیا جائے؟

پونکشے: جواب تو واضح تھا۔

سکھاتمے: گویا آپ اس کام کے لیے تیار نہیں تھے؟

پونکشے: نہیں۔

سکھاتمے: اور یہ اس کے بعد ہوا کہ مس بینارے کے پرس سے ٹک ٹوینٹی کی شیشی ڈھلک پڑی؟

پونکشے: ہاں بالکل۔ میں نے خود شیشی اٹھائی اور اسے پکڑا دی۔ کیا میں پوری گفتگو دہراؤں؟ اگر آپ چاہیں تو میں یہ بھی کر سکتا ہوں۔

بینارے: (اکڑی ہوئی ہے) نہیں۔ نہیں۔

کاشیکر: (موگری بجا کر) خاموش! مسٹر پونکشے، عدالت وہ گفتگو سننا چاہے گی۔ (سکھاتمے سے) ہم بھی

Scanned with CamScanner

شخص کا نام جاننا چاہیں گے۔

بینارے: نہیں پونکشے، تم نے قول دیا ہوا ہے!

سکھاتے: مسٹر پونکشے، آخر وہ ایسی کیا گفتگو تھی کہ مس بینارے اتنی تلملائی ہوئی ہے؟

کاشیکر: مسٹر پونکشے، بتایا جائے کہ کیا گفتگو ہوئی تھی۔ تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ جلدی بیان کیا جائے کہ کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس مسئلے کا تعلق سماج سے ہے۔

پونکشے: مگر وہ نہیں چاہتی۔

کاشیکر: (سوکری بھاؤ کا) جج یہاں کون ہے؟ ملزم کی پسند اور ناپسند کو عدالت میں کب سے مقدم حیثیت حاصل ہو گئی ہے؟ کب سے؟

بینارے: (پونکشے کے سامنے آکر) پونکشے!

کاشیکر: (سوکری بھاؤ) آرڈر! ملزمہ کٹہرے میں جائیے! کٹہرے میں! مسٹر بالو ملزمہ کو کٹہرے میں کھڑا کرو۔

(بالو آگے بڑھتا ہے اور پھر ٹھٹھک جاتا ہے۔)

بینارے: پونکشے، تم ذرا ادھر سے دیکھو!

کاشیکر: قیدی! کٹہرے میں واپس جاؤ۔ بالو اسے کٹہرے میں لے جا کر کھڑا کرو۔

مسز کاشیکر: (بڑھ کر بینارے کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے) پہلے وہاں جا کر کھڑی ہو۔ بالو ادھر آؤ اس کا ہاتھ پکڑے آؤ!

(بالو ان دونوں کے پیچھے آ کھڑا ہوتا ہے۔)

چلو آؤ۔ ذلیل بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

(کھینچ کر کٹہرے میں لے جاتی ہے۔ مسز کاشیکر اور بالو دونوں پہرے دار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔)

کاشیکر: مسٹر پونکشے، بولو۔ گفتگو کس بارے میں تھی؟ میرے کان کی تیلی کہاں ہے؟ (ڈھونڈتا ہے۔ اشارہ) مسٹر پونکشے، بیان جاری رہے۔ گفتگو کس بارے میں تھی؟

پونکشے: پہلے تو ہم ادھر ادھر کی ہانکتے رہے۔ پھر اس قسم کی باتیں کہ "سکھاتے اچھا آدمی ہے مگر بیچارہ قسمت کا ہیٹا ہے۔ بیرسٹر روم میں بیٹھا پیشنس کھیلتا رہتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس کا مقدمہ اس کے پاس جائے گا وہ جیل جائے ہی جائے۔ جج کے سامنے جا کر تو اس کی زبان کو تالا لگ جاتا ہے۔"

سکھاتے: (غصے کو ضبط کرتے ہوئے) اچھا، آگے۔ بیان جاری رہے۔

پونکشے: پھر اس نے اس قسم کی ہانکنی شروع کر دی کہ "کاشیکر جی بیچارے بالو کو بہت ستاتے ہیں۔ انہیں مستقل یہ شک ستاتا رہتا ہے کہ بالو اور ان کی پتنی کے درمیان کچھ اٹ سٹ ہے۔ قصہ یہ

Scanned with CamScanner

ہے کہ ان کے اولاد تو ہوتی نہیں ہے——"

مسز کاشیکر: (بات کاٹتے ہوئے، غصے سے) اچھا اس کلموئی نے یہ کہا تھا؟

(لال پیلی نظروں سے بینارے کو دیکھتی ہے۔)

کاشیکر: (تیزی سے کان کریدتے ہوئے) پونکشے جی، بیان جاری رہے۔

پونکشے: اس قسم کی گپ بازی کے بعد ہم معاملے کی بات پر آگئے۔

کارنک: ٹھہریے۔ یہ بتائیے کہ اس نے میرے بارے میں کیا کہا تھا۔

پونکشے: کچھ بھی نہیں۔ تمہارے بارے میں سرے سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔

کارنک: کچھ تو ضرور کہا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ فضول اداکار ہے، یا ایسی ہی کوئی اور بات۔ مجھے پتا ہے، خوب پتا ہے کہ میرے بارے میں وہ کیا رائے رکھتی ہے۔

پونکشے: ہنسی ہنسی میں پوچھنے لگی، "اچھا یہ بتاؤ کسی کے ساتھ سٹ اڑا رکھی ہے؟" میں نے کہا کہ "جب تک مجھے اپنی پسند کی لڑکی نہیں ملے گی میں شادی نہیں کروں گا۔" اس پر اس نے پوچھا، "پسند کی لڑکی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کون سی صفت چاہتے ہو؟" میں نے کہا، "عام طور پر لڑکیاں بہت لغو ہوتی ہیں۔ عقل سے بالکل پیدل۔ مجھے سمجھدار بیوی کی تلاش ہے۔" کہنے لگی، "لڑکی دو دن میں تو سمجھدار نہیں بن جاتی ہے۔ سمجھ بوجھ تجربے سے آتی ہے۔" میں نے کہا کہ "پتا نہیں۔" پھر کہنے لگی، "اور تجربے کا تعلق عمر سے ہے۔ کچھ اس بات سے کہ آپ نے عمر کیسے گزاری ہے، یعنی کیا عام روش سے ہٹ کر گزاری ہے۔ اس طرح کا تجربہ ایسا خوشگوار نہیں ہوتا۔ اس کے پیچھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ لوگوں کو تو عام طور پر ایسا تجربہ بھاتا نہیں۔ ایسے تجربے والی عورت کے ساتھ تم گزارا کر سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ کوئی عورت واقعی ایسی ہو جو تجربہ کار بھی ہو، تم سے عمر میں بڑی ہو اور تم سے زیادہ پڑھی لکھی ہو۔" میں نے کہا کہ "میں نے ابھی اس بارے میں سنجیدگی سے سوچا نہیں ہے۔" بولی، "تمہیں سوچنا چاہیے۔" میں نے پوچھا کہ "تمہاری نظر میں ہے کوئی ایسی جو اچھی بیوی بن سکے؟" بولی کہ "ہاں ہے۔ ایسی ہی جیسی تم چاہتے ہو۔ ہاں روش سے ذرا ہٹا ہوا اس کا ڈھب ہے۔ اس سے مخاطبت کرنی ہوگی۔" میں سمجھ نہیں سکا کہ وہ کیوں میری شادی کے لیے اتنا تردد کر رہی ہے۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا کہ "روش سے ہٹے ہوئے ڈھب سے تمہاری کیا مراد ہے؟" بولی، "لڑکی بہت دل شکستہ ہے۔ انہیں دنوں ایک تباہ کن تجربے سے گزری ہے۔ کیسے حالوں میں، تمہیں! بس یہ سمجھ لو کہ——" اور یہ کہتے کہتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ بس اتنا کہا کہ "اس محبت کا پھل اس کی کوکھ میں ہے۔ اس میں اس کی اپنی کوئی خطا نہیں تھی۔ لیکن اس کا معاملہ بہت سنگین ہے۔ بچہ وہ ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ اس بچے ہی کی خاطر اب وہ زندہ بھی رہنا چاہتی ہے اور شادی بھی کرنا چاہتی ہے۔" بس اسی طرح کی اس نے کچھ اور باتیں بھی کیں۔ اب مجھے کچھ شک پڑا۔

Scanned with CamScanner

میں نے اصل بات اگلوانے کے لیے اس سے کہا: "بتانے بیچاری۔ بہت بدقسمت لڑکی ہے۔ وہ نکما آدمی تھا کون؟"

سکاٹ: اس نے جواب دیا کہ پروفیسر والا!

پوگنٹے: نہیں۔ پہلے تو اس نے یہی کہا کہ اسے نکما آدمی مت کہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اچھا آدمی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بہت حلیم اور بہت دلکش ہو۔ کوتاہی اس لڑکی سے ہوئی ہو۔ ممکن ہے وہ اسے جیون ساتھی نہ بنا سکی ہو کہ وہ اسے کتنا چاہتی ہے۔ اس قصے میں اصل مسئلہ جو ہے وہ اس عورت کا نہیں، بچے کا ہے۔"

سکاٹ: پھر؟

پوگنٹے: پھر وہ کہنے لگی، "وہ لڑکی اس شخص کی عقل و دانش کی پرستار تھی۔ مگر اس شخص کے لیے اس لڑکی کا جسم ہی سب کچھ تھا۔" اس طرح کی اس نے کچھ اور باتیں بھی کیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ پروفیسر والے کی جیون ساتھی کیوں نہیں بن سکی ۔۔۔۔

سکاٹ: کیا نکمے سے مراد یہ پروفیسر والا؟

کاشیگ: میرے خدا! بلی تھیلے سے باہر آ گئی! ہو گیا نا راز فاش!

پوگنٹے: یہی بات ہے نا؟ میں نے قسم کھائی تھی کہ نام نہیں ظاہر کروں گا مگر ۔۔۔۔

سکاٹ: کوئی مضائقہ نہیں۔ مسٹر پوگنٹے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آدمی عدالت میں قسم توڑ دے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ مگر عدالت کی حد تک تو یہ کوئی گناہ کی بات ہے نہیں۔ اچھا، تو مطلب یہ ہوا کہ اس بی بی کے پیٹ میں جو بچہ ہے وہ اصل میں پروفیسر والے کا ہے۔ آگے؟ آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔

پوگنٹے: پھر وہ میرے قدموں پر گر پڑی۔

کاشیگ: اچھا ۔۔۔۔ اچھا ۔۔۔۔

پوگنٹے: جی ہاں، وہ میرے قدموں پر گر پڑی۔ میں نے کہا کہ "بس بہت ہو چکا۔ یہ تمہیں زیب نہیں دیتا۔ اور یہ جو تم نے مجھے پیش کش کی ہے اسے میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ کیا خیال ہے تمہارا، میں اتنا گیا گزرا آدمی ہوں؟" اس نے جب میرا یہ رویہ دیکھا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ہنس کے کہنے لگی کہ "میں تو تمہیں آزما رہی تھی۔ یہ مت سمجھو کہ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سب سچ ہے؟ یہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔ بالکل مذاق تھا۔" پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔

مسز کاشیگ: مذاق؟ واقعی اس نے یہ کہا؟

پوگنٹے: لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے۔ وہ اسے مذاق کہہ رہی تھی۔ آنسو کچھ اور چغلی کھا رہے تھے۔ پھر وہ جلدی سے یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ "یہی بھول ہو رہی ہے۔"

Scanned with CamScanner

سکاتے: شکریہ مسٹر پوکٹے، اس قیمتی شہادت کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔

(پوکٹے گواہوں کے کٹہرے سے نکل آتا ہے۔ سکاتے ایک کاغذ کا پرزہ لے کر اس پر کچھ لکھنا شروع کرتا ہے اور بڑبڑاتا جاتا ہے۔ "مسٹر بلو روکڑے کا ہاتھ پکڑنے کا جو واقعہ ہے، اس سے دس دن پہلے۔۔۔")

کارنک: (ہاتھ کھڑا کر کے) ٹھہریے۔ اس مقدمے کے بارے میں میرے پاس بھی ایک راز ہے۔ میں اس راز سے پردہ اٹھانا چاہتا ہوں۔

سکاتے: مسٹر کارنک، گواہوں کے کٹہرے میں آئیے۔

(کارنک بڑے ڈرامائی انداز میں چل کر کٹہرے میں جاتا ہے۔ کاشیکر تیزی سے کان کرید رہا ہے۔)

سکاتے: مسٹر کارنک، اپنا بیان دیجیے۔ عدالت سے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

کارنک: (ڈرامائی انداز میں) مسٹر بالو روکڑے نے ملزمہ مس بینارے کے اور اپنے معاملے میں جو شہادت دی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔

بالو: (روہانسی آواز میں) آپ بھلا کیوں اس پھڈے میں ٹانگ اڑا رہے ہیں؟

کارنک: (ڈرامائی لہجے میں) بات یہ ہے کہ اتفاق سے میں موقعِ واردات پہ موجود تھا۔ اس موقعے پر جو ہوا اور جو کچھ کہا گیا اس کا میں عینی شاہد ہوں۔

کاشیکر: (کان کی تیلی کو صاف کرتے ہوئے) کس بات کا عینی شاہد؟ مہربانی فرما کر معاملے کو الجھائیے مت۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہیے۔

کارنک: جنابِ والا، اس زمانے میں تو زندگی خود ایک گتھی ہے۔ وہ جو ایک مغربی ڈراما نگار آئنسکو ہے اس نے۔۔۔

کاشیکر: (موگری ہلاتے ہوئے) موضوع سے بھٹکیے مت۔ متعلقہ مسئلے پر بات کیجیے۔

کارنک: میں نے تو آئنسکو کا حوالہ اس وجہ سے دیا تھا کہ بیچ میں الجھنوں اور پیچیدگیوں کا سوال آ گیا تھا۔

سکاتے: مسٹر کارنک، عدالت میں ملزمہ اور مسٹر روکڑے کے بارے میں جو بیان دیا گیا ہے اس میں آپ کیا ترمیم پیش کرنا چاہتے ہیں؟

کارنک: پرماتما گواہ ہے۔ اسے حاضر و ناظر جان کر میں یہ کہتا ہوں کہ مسٹر روکڑے سے ملزمہ کو تھپڑ نہیں مارا تھا۔

بالو: (روہانسی آواز میں) یہ جھوٹ ہے۔

کارنک: واقعہ کچھ اس طرح سے ہے کہ ملزمہ نے مسٹر بالو پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ میں نے

Scanned with CamScanner

اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا۔ میں ایک طرف اندھیرے میں چھپ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھوں تو سہی ہوتا کیا ہے۔ ملزمہ نے پوچھا، 'بالو، پھر تم نے کیا فیصلہ کیا؟' مسٹر روکڑے نے جواب دیا، 'میڈم کی اجازت کے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے مجبور مت کرو۔' اس پر ملزمہ بولی، 'میڈم کے انگوٹھے کے نیچے دب کر اور اپنی کتنی زندگی برباد کرو گے؟'' بالو نے جواب دیا، 'کیا کیا جائے۔ میں مجبور ہوں۔ قسمت میں یہی لکھا ہے۔ شادی کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔' ملزمہ بولی، 'ایک دفعہ پھر سوچ لو۔ میں تمہارے سارے اخراجات اٹھاؤں گی۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہو گی۔ کاشیکر جی اور ان کی پتنی سے بھی تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ تم خود مختار ہو گے۔'' بالو نے جواب دیا، 'مجھے خوف آتا ہے۔ اور تم سے اس حالت میں اگر میں نے شادی کی تو سب مجھ پہ کیچڑ اچھالیں گے۔ میرے خاندان میں اب تک کسی نے ایسا کام نہیں کیا ہے۔ مجھ پر تکیہ مت کرو۔ نہیں تو میں ساری بات میڈم کو بتا دوں گا۔' اس پر ملزمہ نے غصے میں آ کر۔۔۔

بالو: یہ جھوٹ ہے۔

کارنک: بالو کے منہ پر طمانچہ مارا۔

(بالو کا ہاتھ بے ساختہ اپنے رخسار کی طرف اٹھ جاتا ہے۔)

بالو: یہ جھوٹ ہے۔ سفید جھوٹ۔

(مسز کاشیکر بالو کو دلچسپ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔)

سکھاتمے: مسٹر کارنک، آپ کا شکریہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ملزمہ مسٹر روکڑے کو شادی کے لیے مجبور کر رہی تھی۔ آپ کے بیان سے جو اختلاف پیدا ہوا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ طمانچہ کس نے کس کو مارا۔

کارنک: یہ نقلی بیان نہیں ہے۔ جو آنکھوں سے دیکھا وہ میں نے بتا دیا ہے۔

سکھاتمے: مسٹر کارنک، آپ کا بیان ہم نے سن لیا۔

(کٹہرے سے باہر آنے کا اشارہ کرتا ہے۔)

کارنک: مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔

کاشیکر: اگر کوئی ایسی بات ہے جس کا اس مقدمے سے تعلق ہے تو سن لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر مسئلے کو الجھانے کی کوشش مت کیجیے۔

کارنک: جناب والا۔

کاشیکر: (ہتھوڑی بجاتے ہوئے) آرڈر! تم اپنے آپ کو کیا سمجھ رہے ہو؟ وکیل سمجھ رہے ہو؟ تم گواہ ہو۔ تو جس طرح اور گواہ عدالت کو حضور والا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اسی طرح تم بھی کرو۔

کارنک: حضور والا۔

کاشیکر: ٹھیک۔ یہ بات ہوئی نا۔ اب اپنا بیان دو۔ لیکن مسئلے کو الجھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جو بات ہو سیدھی اور صاف ہو۔
بالو: (بڑی بے چارگی سے) میڈم!
مسز کاشیکر: خبردار جو مجھ سے کوئی کلام کیا!
بالو: لیکن میڈم!
(مسز کاشیکر منہ دوسری طرف کر لیتی ہے۔ بالو بیچارے کی حالت بہت پتلی نظر آتی ہے۔)
کارنک: حضورِ والا، میں اتفاق سے ملزمہ کے ایک کزن سے واقفیت رکھتا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اتفاق سے ایک کرکٹ میچ کے دوران جو جم خانے میں ہو رہا تھا، میری اس سے شناسائی ہو گئی۔ ہمارا ایک مشترکہ دوست بٹلرز الیون کی طرف سے کھیل رہا تھا۔ میرے دوست کا دوست ملزمہ کا کزن نکلا۔ میرے دوست نے مجھے یہی بتایا تھا۔ میرا دوست ملزمہ کو جانتا ہے۔ اسے اس کے معاملات کا پتا ہے۔ تو حضرت یہ بات ہے۔
کاشیکر: ہوں۔ ویسے تمھیں پتا ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو؟ یہ عدالت ہے۔ تم پر عدالت کا احترام واجب ہے۔
کارنک: (مؤدب ہو کر) جی حضورِ والا۔ تو ملزمہ کے کزن سے میری حال ہی میں ملاقات ہوئی ہے۔ باتوں باتوں میں اس کا ذکر بھی نکل آیا۔ مجھے اس نے چند بہت اہم معلومات فراہم کی ہیں۔
سکھاتمے: مثلاً؟
کارنک: مثلاً یہ کہ ملزمہ نے ایک مرتبہ خودکشی کی کوشش کی تھی۔
سکھاتمے: (چہرہ خوشی سے دمکنے لگتا ہے) یہ ہے کہنے کی بات! نمک ٹوتھیا کی شیشی رکھنے کی لم اب سمجھ میں آتی ہے۔
کارنک: اس باب میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو واقعہ گزرا ہے وہ میں بتا سکتا ہوں۔ میری اطلاع یہ ہے کہ محبت میں ناکامی کے سبب ملزمہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اس وقت وہ پندرہ کے سن میں تھی۔ اسے اپنے ماموں سے عشق ہو گیا۔ اس میں ناکامی ہوئی۔
مسز کاشیکر: (چونک کر) ماموں سے؟ اپنے ماموں سے؟
سکھاتمے: جنابِ والا، ماموں، یعنی ماں کا بھائی! کتنی اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے۔
کاشیکر: دوسرے لفظوں میں سیاہ کاری کی آخری حد۔ آخری نہیں تو آخری سے ایک قدم پیچھے سمجھ لیجیے۔ خوب! سکھاتمے جی، بہت خوب!
سکھاتمے: جنابِ والا، خوب آپ کس خیال سے کہہ رہے ہیں؟ ملزمہ کی موجودہ بدچلنی تو ہم پر واضح

تھی جی۔ اب پتا چل رہا ہے کہ اس کا تو ماضی بھی پاپ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو گئی ہے۔

(بیچاری اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتی ہے۔ مسز کاشیکر اسے زبردستی دھکیل کر پھر کٹہرے میں کھڑا کر دیتی ہے۔)

مسز کاشیکر: کہاں جاؤ گی؟ دروازہ تو بند ہے۔ بیٹھ جاؤ۔

کارنک: حضورِ والا، مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔

(ڈرامائی انداز میں کاشیکر کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہے اور اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے۔)

کاشیکر: (چونک جیسے کچھ یاد آ گیا ہو، میز پر ہتھا مار کر) مسٹر سکھاتمے، اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ ذرہ برابر شک کی گنجائش نہیں ہے۔

سکھاتمے: جنابِ والا، کس بات میں؟

کاشیکر: بتاتا ہوں سکھاتمے جی۔ میں عدالت کی روایت کو بالائے طاق رکھتا ہوں اور ایک نہایت اہم شہادت پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سکھاتمے: (سوالیہ) جنابِ والا؟

کاشیکر: سکھاتمے جی، اس مقدمے کی زبردست سماجی اہمیت ہے۔ یہ کوئی ہنسی دل لگی نہیں ہے۔ میں عدالت کے آداب کو ایک طرف رکھتا ہوں۔ مجھے ایک شہادت پیش کرنی ہے۔ سکھاتمے جی، مجھ سے اجازت طلب کیجیے۔ کہہ سے درخواست کیجیے۔ ہاں، کیجیے درخواست۔

سکھاتمے: جنابِ والا، مقدمے کی اہمیت کے پیشِ نظر میں آپ سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ عدالت کی روایت کو ایک طرف رکھ کر فاضل جج کو گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے ہونے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔

کاشیکر: درخواست منظور کی گئی۔ (اٹھ کر کٹہرے میں جا کھڑا ہوتا ہے) مجھ پر جرح کی جائے۔ ہاں شروع کیجیے۔ (بیان دینے کے لیے بے چین ہے۔ پیشانی پر تیوری بھی ہوئی ہیں) اس میں ذرہ برابر مشکل نہیں ہے۔

سکھاتمے: (وکیلوں کے انداز میں) مسٹر کاشیکر، آپ کا پیشہ؟

کاشیکر: سماجی کارکن۔

سکھاتمے: کیا آپ ملزمہ کو جانتے ہیں؟

کاشیکر: خوب جانتا ہوں۔ سماج کے چہرے پر پاپ کا دھبا، گناہ کا داغ۔ یہ جو کنواری لڑکیاں ہیں اور جن کی اتنی عمریں ہو گئی ہیں، ان سب کے بارے میں میری یہی رائے ہے۔

Scanned with CamScanner

سکھاتمے: (ابھی کچھ زیادہ ہی وکیلانہ ہو جاتا ہے) مسٹر کاشیکر آپ اسی صورت میں اظہار رائے کر سکتے ہیں جب آپ سے استفسار کیا جائے۔

کاشیکر: رائے تو بہرحال رائے ہے۔ اس کے اظہار کے لیے میں کسی اجازت کا انتظار نہیں کروں گا۔

پونکشے: شاباش!

سکھاتمے: اچھا مسٹر کاشیکر آپ کو انتظار کی زحمت نہیں دی جائے گی۔ بتائیے کہ ملزمہ پر جو الزام عائد کیا گیا ہے اس کے سلسلے میں کوئی ضروری شہادت پیش کر سکتے ہیں؟

کاشیکر: جناب، میں اسی کی خاطر تو کٹہرے میں آ کر کھڑا ہوا ہوں۔

سکھاتمے: پھر بیان دیا جائے۔

کاشیکر: (بینارے کو دیکھتے ہوئے) مجھے بمبئی کی ایک معروف رہنما شخصیت ناناصاحب شونڈے کے یہاں جانے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ ہمارے درمیان رشتہ یہ ہے کہ ہم دونوں سوشل ورک کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ شونڈے ہی ایجوکیشن سوسائٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ ان کی عظمت مجھ سے کسی قدر ــــ جیسے کہ دوسری طرح کی ہے۔ خیر وہ بات یہاں زیرِ بحث نہیں۔ لیکن ابھی پچھلے دنوں ایسا ہوا کہ میں ان کے یہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک مسئلے پر بات کرنی تھی۔ رات کے کوئی نو بجے ہوں گے۔ مجھے برابر کے کمرے سے کسی کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔

(بینارے چونکتی ہے۔)

ایک تو ناناصاحب کی آواز تھی۔ لیکن دوسری آواز بھی کچھ مانوس ہی معلوم ہوتی تھی۔

مسز کاشیکر: کس کی آواز تھی؟

کاشیکر: فاضل وکیل سے استدعا ہے کہ اس خاتون کو تنبیہ کی جائے۔ گواہ کے بیان میں مداخلت نہیں ہونی چاہیے۔ اس سے پہلے کہ میں اندازہ لگا سکتا کہ یہ کس کی آواز ہے، وہ آواز آنا ہی بند ہو گئی۔ تھوڑی دیر میں ناناصاحب اندر سے برآمد ہوئے۔ باتوں باتوں میں میں نے پوچھ لیا کہ یہ جناب کی کس سے بات ہو رہی تھی۔ بولے، "یار، ایک اسکول ٹیچر تھی۔ ایجوکیشن سوسائٹی والے ہائی اسکول میں پڑھاتی ہے۔ اس کے خلاف ایک انکوائری چل رہی ہے کہتی ہے یہ انکوائری ختم کرا دو۔ جوان خاتون ہے۔ صاف انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔ کہہ دیا ہے کہ پھر کسی وقت مجھ سے آ کر ملو۔" مجھے کرید ہوئی کہ یہ کون عورت ہے۔ ناناصاحب نے مجھے نہیں بتایا۔ لیکن مجھے ابھی یہ احساس ہوا ہے کہ وہ کوئی اجنبی عورت نہیں تھی۔۔۔ یہی خاتون ہے۔ یعنی کہ مس بینارے۔ میں ایک سو ایک فی صدی یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہی خاتون تھی۔ آواز بالکل اسی کی تھی۔

مسز کاشیکر: ہائے میں مر جاؤں!

کاشیکر: سکھاتے جی، آپ پوچھ سکتے ہیں کہ آخر کس بنیاد پر میں اتنے یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ آج ناناصاحب کی سالگرہ تھی۔ میں صبح ہی صبح ایک ہار لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت ناناصاحب کسی سے بہت غصے میں فون پر بات کر رہے تھے۔ "شادی سے پہلے حمل؟ یہ گناہ ہے۔ اور ایسی حالت میں وہ عورت کلاسیں پڑھائے، یہ تو بہت ہی خراب اخلاق بات ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ اس کی چھٹی کر دی جائے۔" پھر آخر میں کہا کہ "آرڈر جاری کیجیے۔ آج ہی دستخط کرا لیجیے۔"

(بینارے سناٹے میں آجاتی ہے۔)

اب بتائیے کہ آپ کا دھیان کس طرف جائے گا۔ میں کہتا ہوں یہ مس بینارے ہے۔ اور کوئی نہیں ہے۔

سامنت: اچھا؟ یہ تو بہت ستم کی بات ہے۔ اس کی ملازمت ختم ہو رہی ہے۔

سکھاتے: یہ تو ہونا ہی تھا۔ جیسے کو تیسا۔ جیسا بوؤ گے ویسا کاٹو گے۔ زندگی کا یہی اصول ہے۔

(بالو نوٹ بک کھول کر اس میں نقل کرتا ہے۔)

لیکن مسٹر کاشیکر، آپ نے یہ کیسے طے کر لیا کہ یہ وہی عورت ہے؟ یہ کہ وہ واقعی مس بینارے تھی؟

کاشیکر: میرے عزیز بھلے آپ بچہ سمجھتے ہیں؟ اتنی آسان بات اور میری سمجھ میں نہ آئے۔ میں پچھلے چالیس سال سے سماج کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہے۔ مجھے تو اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ میرا قیاس ٹھیک ہے۔ وہ سو فیصد مس بینارے تھی۔ اور سو باتوں کی ایک بات، ایک ہی دن تو درمیان میں ہے۔ کل کا انتظار کیجیے کہ نوکری سے سبکدوشی کا آرڈر ملتا ہے یا نہیں ملتا۔ تو مجھے بس اتنا ہی کہنا تھا۔

(گواہوں کے کٹہرے سے نکل کر جج کی کرسی پر جا بیٹھتا ہے۔)

وکیلِ استغاثہ اپنی کارروائی جاری رکھیں۔

(بینارے کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی شیشی ہے۔ وہ اسے منہ میں انڈیلنے کو ہے کہ کارنک لپک کر آتا ہے اور شیشی پر ہاتھ مارتا ہے۔ وہ گر کر لڑھکتی ہوئی پونکشے کے پیروں کے قریب جا پہنچتی ہے۔)

پونکشے: (شیشی اٹھا کر دیکھتا ہے۔ میز پر رکھتے ہوئے) ٹک ٹوئنٹی!

(سامنت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ کاشیکر شیشی کو دیکھتا ہے اور اسے اپنے قبضے میں لے لیتا ہے۔)

کاشیکر: وکیلِ استغاثہ اپنی کارروائی جاری رکھیں۔

Scanned with CamScanner

سکھاتمے: اس آخری اور اہم ترین شہادت کے ساتھ استغاثے کی کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی ہے۔

(سکھاتمے واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھتا ہے۔)

کاشیکر: (جج والے لہجے میں) ملزمہ کا وکیل۔

(سکھاتمے اٹھ کر اس اسٹول پر جا بیٹھتا ہے جو وکیلِ صفائی کے لیے مخصوص ہے، اور سر نیہوڑھا لیتا ہے۔)

اپنے گواہوں کو بلائیے۔

سکھاتمے: (اٹھ کر جھکے ہوئے انداز میں سر خم کرتے ہوئے) جنابِ والا، حکم وصول پایا۔ ہمارا پہلا گواہ ہے پروفیسر داملے۔

پالوو (حاجب کی طرح آواز لگاتے ہوئے) داملے حاضر ہے؟ پروفیسر داملے! (کاشیکر سے) پروفیسر داملے غیر حاضر ہے۔

کاشیکر: (سکھاتمے سے) دوسرے گواہ کو پیش کیا جائے۔

سکھاتمے: ہمارا دوسرا گواہ ہے ناناصاحب شینڈگے۔

کاشیکر: (کان کریدتے ہوئے) غیر حاضر — وہ بھلا یہاں کیسے آسکتے تھے؟ اگلے گواہ کو پیش کیا جائے۔

سکھاتمے: اس گروپ کا ایک ممبر ری، مسٹر راوتے...

کاشیکر: وہ بھی غیر حاضر ہے۔ ملزمہ کی طرف سے یہی گواہ ہیں؟ ان میں سے کوئی بھی حاضر نہیں ہے۔

سکھاتمے: جنابِ والا میں استغاثے کے گواہوں پر جرح کرنا چاہتا ہوں۔

کاشیکر: درخواست نامنظور کی جاتی ہے۔ آپ اپنی نشست پر تشریف رکھیں۔

(سکھاتمے اپنی نشست پر جا بیٹھتا ہے۔)

کاشیکر: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں، تو وکیلِ استغاثہ کو چاہیے کہ اپنے مقدمے کی پیروی کرے۔ وقت ضائع نہ کیا جائے۔

(سکھاتمے اپنی پچھلی نشست پر مستعدی سے آبیٹھتا ہے۔ پھرتی سے کھڑا ہوتا ہے۔)

کاشیکر: اختصار سے کام لیا جائے۔

سکھاتمے: (وکیلِ استغاثہ کی حیثیت سے) جنابِ والا مس بینارے کے خلاف الزام کی نوعیت بہت سنگین ہے۔ اس عورت نے جو کہ ملزمہ ہے ماتا کے پاک دامن کو جو آسمانوں سے زیادہ پاکیزہ ہوتا ہے داغدار کر دیا ہے۔ اس صورت میں قانون جتنی سخت سزا اس کے لیے تجویز کرے وہ متناسبتاً نرم ہو گی۔ ملزمہ کا چال چلن نہایت مکروہ ہے۔ اخلاقی دیوالیہ پن کی مثال ہے۔ اتنا ہی

نہیں۔ اس کے فعل نے ساری سماجی اور اخلاقی قدروں پر بھی سیاہی مل دی ہے۔ ملزمہ سماج کی فصل نسبر کی دشمن ہے۔ اگر ایسے سماج دشمن رجحانات پر روک ٹوک نہ کی گئی تو یہ ملک اور اس کی تہذیب تباہ ہو جائے گی۔ اس لیے میری گزارش ہے کہ عدالت کسی قسم کی نرمی برتے بغیر اس جرم کا سختی کے ساتھ نوٹس لے۔ ملزمہ پر طفل کشی کا الزام ہے۔ لیکن ملزمہ نے اس سے بھی بڑھ کر ایک جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ میرا مطلب ہے شادی کیے بغیر ماں بننے کا جرم۔ شادی کیے بغیر ماں بن جانے کو ہمارے دھرم اور ہماری روایات نے ہمیشہ ایک گھناؤنا جرم تصور کیا ہے۔ علاوہ ازیں، ملزمہ اس ناجائز بچے کو پرورش کرنے کی نیت رکھتی ہے۔ اگر اس کی یہ خواہش پروان چڑھی تو ہمارے پورے سماج کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اخلاقی قدر جیسی کوئی چیز تو باقی ہی نہیں رہے گی۔ جنابِ والا، طفل کشی ایک گھناؤنا جرم ہے۔ مگر ناجائز بچے کی پرورش اس سے بڑھ کر گھناؤنا جرم ہے۔ اگر اس جرم کی حوصلہ افزائی کی گئی تو شادی کے ادارے کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں رہ جائے گی۔ پھر تو بدچلنی کا دور دورہ ہوگا۔ ہم نے جو روایت کے سائے میں پروان چڑھتے ہوئے ایک سماج کا خواب دیکھا تھا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے خاک میں مل جائے گا۔ ملزمہ نے تو ہماری روایت کو، ہمارے دھرم کو، ہمارے کلچر کو، ہماری عزتِ نفس کو ڈائنامائٹ کرنے کی ٹھان لی ہے۔ جنابِ والا کا یہ مقدس فریضہ ہے، اور ہر سمجھدار اور صاحبِ فکر شہری کا بھی، کہ اس ناپاک سازش کو ناکام بنایا جائے۔ اس بنا پر کہ ملزمہ عورت ہے، کوئی رعایت نہ برتی جائے۔ عورت پر یہ بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ سماج کی اعلیٰ قدروں کو پروان چڑھائے۔ روایت نے جو اصول وضع کیا ہے وہ یہ ہے کہ عورت خودمختاری کی اہل نہیں ہے۔ میری عدالت سے یہ درخواست ہے کہ ملزمہ کے ساتھ کسی قسم کی نرمی نہ برتے بلکہ اسے اس کے جرم کی سخت سے سخت سزا دے۔ اس گزارش کے ساتھ میں استغاثے کی طرف سے اپنے دلائل ختم کرتا ہوں۔

کاشیکر۔ خوب! وکیلِ صفائی۔

(سکھاتمے وکیلِ صفائی کا روپ دھارتے ہوئے اپنی نشست بدلتا ہے اور سر نیہوڑا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔)

سکھاتمے: (ڈھیلے قدموں کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ جعلی مزاحیہ لہجے میں) جنابِ والا مجھے اس سے انکار نہیں کہ جرم بہت سنگین ہے۔ لیکن آپ یہ بھی تو غور فرمائیں کہ آخر بندہ بشر ہے، بھول چوک کا پتلا ہے۔ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ اس عالم میں اچھا اچھا بہک جاتا ہے۔ بس ملزمہ سے جو جرم سرزد ہوا ہے اور ہو رہا ہے اس پر ہمدردانہ غور کیا جائے۔ رحم، جنابِ والا رحم! میں انسانیت کے نام پر رحم کی اپیل کرتا ہوں۔

(جج کی میز کے قریب آجاتا ہے۔ بینارے ساکت کھڑی ہے۔)

Scanned with CamScanner

کاشیکر: اچھا، اب مس بینارے کی باری ہے۔

(بینارے ساکت کھڑی ہے۔)

قیدی بینارے، کیا فیصلہ صادر ہونے سے پہلے تم اس الزام کے بارے میں جو تم پر لگایا گیا ہے کچھ کہنا چاہو گی؟ (گھڑی سامنے رکھتے ہوئے) دس سیکنڈ تک انتظار کیا جائے گا۔

(بینارے اسی طرح بے حس و حرکت کھڑی ہے جیسے پہلے کھڑی تھی۔ پس منظر سے موسیقی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ روشنی کی کیفیت بدلتی ہے۔ عدالت کا پورا منظر freeze ہو جاتا ہے۔ اور ساکت بینارے سیدھی ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے۔)

بینارے: جی ہاں، مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ کتنے برس ہو گئے کہ میرے منہ سے ایک بات بھی نہیں نکلی۔ موقعے آئے اور نکل گئے۔ کتنے طوفان میرے اندر اُمڈتے رہے، اُمڈ اُمڈ کر حلق تک آئے۔ اور میرے دل میں ایک نالہ اٹھا، موت کی طرح کا نالہ۔ لیکن ہر مرتبہ میں نے اپنے ہونٹ سی لیے۔ میں نے سوچا کہ سمجھے گا کون۔ کون سمجھ سکتا ہے۔ جب لفظوں کی مضطرب لہریں اٹھتی ہیں اور میرے سلے ہوئے ہونٹوں سے ٹکراتی ہیں تو مجھے اپنے ارد گرد لوگ کتنے مورکھ، کتنے احمق، کتنے سادے دکھائی پڑتے ہیں۔ وہ شخص بھی جسے میں اپنا جانتی ہوں۔ ایسے لمحوں میں میں سوچتی ہوں کہ میں ہنسوں، اتنا ہنسوں کہ پھٹ پڑوں۔ ان سب پر، کسی پر، بس ہنسوں اور ہنستی چلی جاؤں اور میں رویا کرتی۔ سوچتی کہ اتنا چیخ چیخ کر روؤں کہ میری انتڑیاں نکل پڑیں، میرا جگر پھٹ جائے۔ میری زندگی میرے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔ (لمبا سانس لے کر) لیکن جب ہم جان مار نہیں سکتے تو پھر ہمیں اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ جینے کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ پھر پتا چلتا ہے کہ مسرت کے معنی کیا ہیں۔ ہر ساعت، ہر گھڑی کتنی نئی کتنی تحیر خیز نظر آتی ہے۔ خود اپنا آپ، اپنا وجود نیا نیا معلوم ہونے لگتا ہے۔ آسمان، پرندے، بادل، سوکھے پیڑ کی ٹہنی جو کتنی آسانی سے خم کھا جاتی ہے، دریچے پر لہراتا پردہ، چاروں طرف چھائی خاموشی، دور سے آتی آوازیں، انتہا یہ ہے کہ ہسپتال میں دواؤں کی جو تیز بو ہوتی ہے اس سے بھی، ہر چیز سے زندگی اُبلتی معلوم ہوتی ہے۔ لگتا ہے کہ زندگی آپ کے لیے گنگنا رہی ہے، گیت گا رہی ہے۔ جو خودکشی ناکام ہو جائے اس میں بہت مسرت ہوتی ہے۔ جینے کے درد سے بھی زیادہ اس میں مسرت ہوتی ہے۔ (گہری آہ بھرتی ہے) آپ اپنی دانست میں اپنی زندگی کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں، مگر پھر پتا چلتا ہے کہ قسمت نے آپ کو بچا لیا۔ آپ سے بچا بچا کر رکھیں، بعد میں پتا چلتا ہے کہ وہ تو اس قابل تھی کہ اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ کتنی مضحکہ خیز بات ہے! آپ اپنی زندگی کی حفاظت کرتے ہیں، سنبھال کر رکھتے ہیں، اور آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا تو اچھا تھا۔ آپ اسے اپنے حساب ٹھکانے لگا دیتے ہیں، مگر پھر یہ سوچ کر آپ کو کتنی راحت ملتی ہے کہ زندگی بچ گئی ہے۔ مگر تسکین کسی

صورت نہیں ہوتی۔ بار بار وہی چکر (جیسے کلاس پڑھا رہی ہو) زندگی یہ ہوتی ہے، زندگی وہ ہوتی ہے۔ زندگی کی مثال ایسی ہے۔ زندگی کا یہ رنگ ہے اور وہ رنگ ہے۔ زندگی ایک کتاب ہے جس کے سارے ورق پھٹ چکے ہیں۔ زندگی وہ زہریلی ناگن ہے جو اپنے آپ ہی کو ڈس لیتی ہے۔ زندگی دغا ہے، فریب ہے۔ زندگی دارو ہے۔ زندگی پتھر ڈھونے کا نام ہے۔ زندگی ایسی حقیقت ہے جو بے حقیقت ہے۔ یا بے حقیقت ہے مگر اس کے باوجود اس کی بہت حقیقت ہے۔ (اچانک عدالت والے منظر میں) جناب والا، زندگی بہت بھیانک شے ہے۔ زندگی اس کی مستحق نہیں ہے کہ اسے زندگی ملے۔ زندگی کے خلاف انکوائری ہونی چاہیے۔ اسے برخاست کر دیا جائے۔ مگر کیوں؟ آخر کیوں؟ کیا مجھ سے اپنے کام میں کوتاہی ہوئی؟ میں نے تو بچوں کو پڑھانے میں اپنی ساری جان لڑا دی ہے۔ مجھے اس کام سے عشق ہے۔ میں نے انہیں بڑی محنت سے پڑھایا لکھایا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ زندگی کوئی سیدھی سی شے نہیں ہے۔ لوگ بہت ظالم ہوتے ہیں۔ خود تمہارا اپنا خون، پے جگر کے ٹکڑے نہیں جانتے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ زندگی میں صرف ایک چیز ہے جو ہم ہے، سب پر مقدم ہے۔۔ جسم۔ آپ اس سے بے شک انکار کر دیں، مگر وہ تو ہے۔ جذبات ایسی چیز ہیں جن کے بارے میں لوگ منہ دبی باتیں کرتے ہیں۔ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح واضح تھی۔ میں اس حقیقت کو پی رہی تھی۔ میرے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ لیکن آپ کو ایک بات بتاؤں۔ میں نے ان نوخیز نازک روحوں کو ان میں سے کوئی بات نہیں بتائی۔ میں نے وہ سارا زہر خود پیا۔ اس کا کوئی قطرہ ان کے حلق میں نہیں اترنے دیا۔ میں نے انہیں حسن کا، جمال کا سبق پڑھایا۔ میں نے انہیں پاکیزگی کی تعلیم دی۔ میرا دل روتا رہتا تھا، مگر میں انہیں گدگداتی تھی۔ میرے اندر یاس کا ڈیرا تھا، مگر میں انہیں آس دلاتی تھی۔ امید کا درس دیتی تھی۔ وہ مجھے میری ملازمت سے کیوں محروم کرنا چاہتے ہیں؟ میرے لیے یہی تو ایک راحت رہ گئی تھی۔ میری بھی زندگی میرا اپنا معاملہ ہے۔ اپنے بارے میں فیصلہ میں خود کروں گی۔ ہر شخص کو خود ہی اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ یہ کسی دوسرے کا کام نہیں ہے۔ مجھے آپ لوگ؟ ہر فرد کا اپنا کوئی میلان ہوتا ہے، کوئی طور ہوتا ہے، کوئی مقصدِ حیات ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔

(اچانک اس پر وہ کلاس روم والا موڈ طاری ہو جاتا ہے جو سکول میں ہوتا ہے۔)

چپ! ہاں خاموش! یہ کیا شور مچا رکھا ہے؟

(کٹہرے سے نکل آتی ہے اور یوں ٹہلنے لگتی ہے جیسے کلاس میں ہو۔)

ٹھیک ہو کر بیٹھو، چپ چاپ!

(ہر چہرے پہ نظر ڈالتی ہے جو بدستور لرزاں ہے۔)

Scanned with CamScanner

بیچارے، بچے! یہ سب کون لوگ ہیں؟

(ایک ایک چہرے پر روشنی پڑتی ہے۔ سب خوں خوار خاموش اور آسیب مثال نظر آتے ہیں۔)

یہ ہیں بیسویں صدی کے مہذب لوگوں کی فانی باقیات۔ ذرا ان کی صورتیں تو دیکھو۔ کتنی خوں خوار ہیں یہ صورتیں۔ ہونٹوں پر خوب صورت قسم کے فرسودہ جملے ہیں۔ اور ان کی توندیں۔ ان میں ناآسودہ خواہشات بھری پڑی ہیں۔

(اسکول میں پیریڈ ختم ہونے پر بجنے والی گھنٹی کی آواز آتی ہے۔ بچوں کے ہنسنے کھیلنے کا شور دور سے آتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہو جاتی ہے اور ان آوازوں کو یکسوئی سے سنتی ہے جیسے ان میں غرق ہو گئی ہو۔ پھر یہ شور پیچھے سرکتے ہوئے مدھم ہوتا جاتا ہے۔ خاموشی۔ وہ اپنے ارد گرد دیکھتی ہے اور اچانک اس خاموشی سے خوف زدہ ہو جاتی ہے۔)

نہیں، نہیں، مجھے تنہا مت چھوڑو۔ ان لوگوں سے مجھے خوف آتا ہے۔

(خوف کے عالم میں پھر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیتی ہے اور کانپنے لگتی ہے۔)

یہ صحیح ہے۔ مجھ سے ایک گناہ سرزد ہوا ہے۔ میں نے پاپ کیا ہے۔ مجھے اپنی ماں کے بھائی سے عشق ہو گیا تھا۔ لیکن اس سخت پابندیوں والے گھر میں میری اٹھتی جوانی کے دنوں میں ایک وہی تو شخص تھا جس کا قرب مجھے میسر آیا تھا۔ روز وہ میرے جوبن کی تعریف کرتا۔ وہ عجب کیفیت تھی۔ جیسے کسی دوسرے میں تحلیل ہو رہی ہوں۔ جیسے اس کے ساتھ یک جان ہونے سے زندگی کو ایک معنی مل رہے ہوں۔ اب مجھے اس وقت کیا پتا تھا کہ وہ دوسرا اگر تمھارا ماموں ہے تو پھر یہ گناہ ہے۔ اس وقت مشکل سے میرا چودہ کا سن ہو گا۔ مجھے تو اس وقت یہ بھی پتا نہیں تھا کہ گناہ کیا ہوتا ہے۔ میں اپنی ماں کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس وقت مجھے یہ پتا ہی نہیں تھا۔

(چھوٹی بچی کی طرح سسکیاں بھرتی ہے۔)

میں نے ضد کی کہ میں اس سے شادی کروں گی۔ میں نے جو پیارا سا خوبصورت سا خواب دیکھا ہے اسے بسر کروں۔ دوسرے لوگ جیسے کھلم کھلا زندگی بسر کرتے ہیں ویسے میں بھی بسر کروں۔ لیکن سب ہی اس بات کے خلاف تھے۔ میری ماں بھی۔ اور وہ شخص دُم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں غصے سے کھول اٹھی۔ اندر ایسا اُبال اٹھ رہا تھا کہ سب کے سامنے اس کا منہ نوچ لوں، اس کے چہرے پر تھوکوں۔ لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں تھا۔ جو سوچ رہی تھی اس کا اُلٹ کیا۔ گھر کے ایک چھجے سے نیچے چھلانگ لگا دی کہ کسی طور موت آ جائے۔ لیکن موت نہیں آئی۔ میرا جسم زندہ رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے جذبات بالکل مر گئے ہیں، لیکن نہیں مرے تھے۔ میں پھر محبت میں گرفتار ہو گئی۔ اب

Scanned with CamScanner

میری بچی عمر تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ تجربہ اس سے مختلف ہوگا۔ یہ محبت اندھی نہیں ہے۔ دانا بینا محبت ہے۔ یہ ایک غیر معمولی دماغ سے محبت کا تجربہ ہے۔ یہ محبت ہے ہی نہیں، یہ تو پرستش ہے۔ لیکن پھر ویسی ہی غلطی ہوئی۔ میں نے پرستش کی قربان گاہ پر اپنا جسم بھینٹ چڑھا دیا۔ اور میرے دانشور دیوتا نے میری بھینٹ قبول کرلی اور اپنی راہ چلا گیا۔ اسے میرے ذہن کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ میری پرستش کی۔ ان چیزوں کی اسے پروا ہی نہیں تھی۔ (وحشی ہو رہی) وہ دیوتا نہیں تھا۔ آدمی تھا جس کے نزدیک جسم ہی سب کچھ تھا۔ اور جو کچھ تھا جسم ہی کے لیے تھا۔ پھر وہی کمبخت جسم! (چلا کر) یہ جسم دغاباز ہے! (درد سے ملاتے ہوئے) مجھے نفرت ہے اس جسم سے۔ میں اس جسم سے بیزار ہوں۔ لیکن آخر میں یہی لے دے کے ہمارے پاس رہ جاتا ہے۔ اس کے سوا اور ہے کیا؟ تیرے پاس یہی ایک چیز ہے۔ تیرے دم دم کا ساتھی ہے۔ تیرے بغیر وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ اور اس سے انکار کرکے تو کہاں جائے گی؟ تو اے عورت، تو ناشکر گزار مت بن! اس جسم ہی کی بدولت تو تجھے ایک حسین ساعت میسر آئی تھی۔ لذت سے سرشار ساعت، ایسی ساعت جو آسمان کو چھو رہی تھی۔ تو کیا اس ساعت کو بھول گئی ہے؟ وہ تجھے لے اڑی تھی، بلندیوں پر لے گئی تھی، ان بلندیوں پر جو جنت کے ہم پایہ تھیں۔ کیا تو اس سے انکار کرے گی؟ وہ اب تیرے اندر اس ساعت کا گواہ کسمسا رہا ہے۔ ایک ننھی کلی جو بہت جلد ایک ہنستی کھیلتی ہمکتی ننھی سی جان کا روپ لے لے گی۔ میرا بیٹا۔ میرا پورا وجود۔ اب میں اپنے جسم کو اس کی خاطر چاہتی ہوں۔ صرف اس کی خاطر! (آنکھیں بند کرکے درد سے بڑبڑاتی ہے) اس کی کوئی ماں ہونی چاہیے۔ کوئی باپ ہونا چاہیے جسے وہ اپنا باپ کہہ سکے۔ اس کا کوئی گھر ہونا چاہیے جہاں اس کی دیکھ بھال ہو۔ اسے ایک نام ہونا چاہیے۔

(اندھیرا۔ پھر روشنی۔ گھڑی کی ٹک ٹک ٹک ٹک۔ بینارے اب پھر پہلے کی طرح ساکت کھڑی ہے۔ سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہیں۔)

کاشیکر: (ہاتھ میں گھڑی لیے نیچے لاتے ہوئے) وقت پورا ہو گیا۔ ملزم کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ ہوتا بھی تو اس کا فائدہ کیا تھا۔ اس کے جرم کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب فیصلہ صادر کرنے کا وقت ہے۔ بالو، میری وگ کہاں ہے؟

(بالو صدری بیگ کھولتا ہے اور وگ اس کے حوالے کرتا ہے۔ کاشیکر وگ پہن کر پورے وقار کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔)

کاشیکر: قیدی مس بینارے، فیصلہ توجہ اور یک سوئی سے سماعت کیا جائے۔ تم نے جن جرائم کا ارتکاب کیا ہے وہ بہت سنگین ہیں۔ ان سے درگزر نہیں کیا جا سکتا۔ تمہارے گناہ کا کفارہ ادا ہونا چاہیے۔ غیر ذمہ دارانہ روش کو لگام دینے کی ضرورت ہے۔ سماجی رسم و رواج بہرحال مقدم ہیں۔

Scanned with CamScanner

شادی کا ادارہ ہمارے سماجی استحکام کی ضمانت ہے۔ ممتا کو مقدس اور پاکیزہ رہنا چاہیے۔ تم نے ان سب کو جس طرح تباہ و برباد کرنے کی کوشش کی تھی اس کا عدالت نے سختی سے نوٹس لیا ہے۔ اس عدالت کی یہ پختہ رائے ہے کہ تمہارا طرزِ عمل ایسا ہے کہ رحم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد تم نے نخوت کا مظاہرہ کیا۔ اس نخوت کو کسی صورت معاف نہیں کیا جا سکتا۔ مجرموں اور گنہگاروں کو اپنی اوقات معلوم ہونی چاہیے۔ تم نے اپنی اوقات سے بڑھ کر روش دکھائی ہے۔ عدالت تمہارے بر خود غلط رویے پر اپنی برہمی کا اظہار کرتی ہے۔ علاوہ ازیں، آنے والی نسلوں کا مستقبل تمہارے سپرد کیا گیا تھا۔ یہ بڑی خوفناک بات ہے۔ تم نے اپنے چلن میں جس طرح کی اخلاقیات کا مظاہرہ کیا ہے اسی قسم کی اخلاقیات تم کل کے نوجوانوں میں پھیلانے کا منصوبہ بنا رہی تھیں۔ عدالت کو اس میں رتی بھر بھی شک نہیں ہے۔ پس تمہارے غلط چلن سے آج ہی کا نہیں بلکہ آنے والے زمانے کا سماج بھی خطرے میں تھا۔ شکر ہے کہ بروقت خطرے کا سدباب ہو گیا۔ نہ تو تمہیں اور نہ کسی اور کو آئندہ ایسی حرکت کے ارتکاب کی جرأت ہونی چاہیے۔ تمہارے گناہ کا کوئی نشان باقی نہیں رہنا چاہیے تاکہ آنے والی نسلیں اس سے متاثر نہ ہو سکیں۔ اس لیے عدالت یہ فیصلہ صادر کرتی ہے کہ تم تو زندہ رہو گی لیکن تمہاری کوکھ میں جو بچہ ہے اسے ضائع کر دیا جائے۔

بینارے: (تڑپ کر) نہیں، نہیں، نہیں! میں تم لوگوں کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔۔۔ نہیں ہونے دوں گی۔۔۔

(سب یوں ساکت بیٹھے ہیں جیسے بت ہوں۔ بینارے سسکیاں بھرتی ہوئی سی سٹول پر آہستگی سے جو کٹہرے صفائی کے لیے مخصوص ہے۔ لگتا ہے جیسے وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں ہو۔ پھر ایک اذیت کی کیفیت میں نڈھال ہو کر اپنا سر میز پر رکھ دیتی ہے اور بالکل ساکت ہو جاتی ہے۔ سسکیوں کی دبی دبی آواز آتی ہے۔

خاموشی۔ اب ہال میں چھایا ہوا اندھیرا ہو چکا ہے۔ ایک شور سنائی دیتا ہے جیسے کوئی دروازے پر ہو۔ سب چونک کر دروازے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دروازہ آہستگی سے تھوڑا تھوڑا کر کے کھلتا ہے۔ کھلنے کے ساتھ ہی روشنی کی ایک دھاری اندر آتی ہے۔ ساتھ ہی دو تین چہرے دکھائی دیتے ہیں۔)

پہلا چہرہ: (ہال میں بیٹھے ہوؤں کو ایک ایک کر کے تجسس سے دیکھتا ہے) کھیل کیا شروع ہو گیا؟ زندہ عدالت؟

(سب چونک پڑتے ہیں، اس احساس کے ساتھ کہ اس وقت کھیل شروع ہونا تھا۔ سامنت بجلی جلاتا ہے۔ ہر شخص جلدی سے نارمل ہو جاتا ہے۔)

سامنت: (اٹھ کر آگے جاتے ہوئے) نہیں، نہیں۔ ابھی کھیل شروع نہیں ہوا ہے۔ مگر شروع

Scanned with CamScanner

ہونے والا ہے۔ مہربانی کرکے ذرا باہر بیٹھ کر انتظار کریں۔ بس پانچ منٹ کے لیے باہر آجائیے۔ آئیے میرے ساتھ۔

(سبیں لے کر باہر نکل جاتا ہے۔)

کارنک: ہاں واقعی، یہ تو بہت دیر ہوگئی۔

مسز کاشیکر: حد ہو گئی۔ مجھے تو وقت کا پتا ہی نہ چلا۔

پونکشے: کیا وقت ہوا ہے؟ یہ تو بالکل، اندھیرا ہو گیا۔

کاشیکر: بالو، شو کے ٹائم کی ذمے داری تو تمھاری ہے۔ تم اس سارے وقت کیا کرتے رہے؟ پاگل بنا ہے!

سکھاتمے: وہ تو ہونا ہی تھا۔ لیکن ہماری اچھی خاصی تفریح ہو گئی۔ لگ رہا تھا ہم سچ مچ کوئی مقدمہ لڑ رہے ہیں۔

کاشیکر: چلو اٹھو۔ جھٹ پٹ تیار ہو جاؤ۔ ہاں، سب تیار ہو جائیں۔

پونکشے: میں ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔

(وہ بینارے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسے دیکھ کر سب دم بخود رہ جاتے ہیں۔ خاموشی اور بہت سنجیدہ صورتوں کے ساتھ بینارے کے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں جو بالکل بُت بنی ہوئی ہے۔)

مسز کاشیکر: (اپنے بالوں میں گوندھے ہوئے گجرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ارے، لگتا ہے کہ اس نے بات دل کو لگالی۔ بڑی حساس بھی ہے!

کاشیکر: مجھے بتا رہی ہو۔ اس نے تو دل پہ کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔ آخر بات بھی تو۔۔۔

سکھاتمے: ارے بس دل لگی تھی۔ کھیل کھیل رہے تھے۔ اس سے زیادہ تو اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

پونکشے: صرف کھیل!

کارنک: بینارے، اٹھو۔ شو کا ٹائم ہو چلا ہے۔ شو تو ہونا ہی چاہیے۔

مسز کاشیکر: (بینارے کو جھنجھوڑ کر) بینارے، اٹھو! شو وقت پہ شروع ہونا چاہیے۔ چلو اٹھو بھی! ارے وہ تو سب جھوٹ موٹ تھا۔ اس میں بھلا بھی کون سی بات تھی۔

(سامنت داخل ہوتا ہے۔)

پونکشے: سامنت جی، کچھ چائے کا انتظام ہونا چاہیے۔ بہت مہربانی ہوگی۔ خاتون کو چائے کی ضرورت ہے۔

سامنت: جی ضرور۔

Scanned with CamScanner

(کاشیکر ہنستے ہوئے اپنی وِگ اتارتا ہے۔ سامنے میز پر رکھی ہوئی ٹک ٹونٹی کی شیشی پر نظر جاتی ہے۔ تھوڑی دیر تک اسے تکتا رہتا ہے۔ پھر شیشی سے نظر ہٹا کر دوسروں کو دیکھتا ہے۔)

کاشیکر: اٹھیں بھئی، بہت کھیل لیے۔ اب کام سے لگو۔

(سب اٹھ کر خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ بینارے سٹیج پر بُت سی کھڑی ہے۔ سامنے دروازے میں کرپا اسے تک رہا ہے۔ کچھ سٹپٹایا ہوا، کچھ گھبرایا گھبرایا اس کے قریب آتا ہے اور بہت خاموشی سے بھرے کپڑے سے بنے ہوئے اس توتے کو اٹھاتا ہے جو سب سے پہلے سامان سے نکال کر اس نے یہاں رکھ دیا تھا۔ وہ واپس دروازے کی طرف جانے لگتا ہے۔ لیکن پھر ضبط نہیں کر پاتا اور بینارے سے ذرا فاصلے پر جا کر ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کرے کیا۔ دبی سی آواز میں کہتا ہے: مس--- مگر بینارے پر کوئی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ اب وہ اور سٹپٹا جاتا ہے۔ اور کچھ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تو وہ نہایت ادب، احترام اور محبت بھری کیفیت کے ساتھ ذرا قریب جا کر توتا اس کے سامنے رکھ دیتا ہے اور نکل جاتا ہے۔

بینارے کو ایک خفیف سی جھرجھری آتی ہے، مگر پھر اسی طرح ساکت ہو جاتی ہے۔ مرا چمکتا توتا اس کے سامنے رکھا ہے۔ کہیں دور سے، کسی ان دیکھے مقام سے، اسے بچی کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ گاتی گنگناتی آواز)

توتے سے کہا گوریا نے
کیوں آنکھیں تیری لال ہوئیں
گوریا نے توتے سے کہا
اے میتر مرے کیا تجھ سے کہوں
اک گھونسلا تھا پیارا سا مرا
اک ظالم اس کو لے بھاگا
تب توتا رویا اور بولا
افسوس، ہماری گوریا
کوئے بھائی، اک بات سنو
جو تم نے دیکھا ہم سے کہو
کوا بولا میں نہیں دیکھا
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں

جس کا دکھ جو وہ ہی جانے
تب توتا رویا اور بولا
افسوس، بچاری گوریا
دکھ درد کی ماری گوریا

(صرف بندر کے چہرے پر روشنی ہے۔ باقی اسٹیج تاریکی میں ہے۔)

**

Scanned with CamScanner

آج

خزاں ۱۹۹۴

منتخب ہندی کہانیوں پر مشتمل خصوصی شمارہ ہوگا

Scanned with CamScanner

آج

سالانہ خریداری

پاکستان

چار شماروں کی قیمت: ۲۰۰ روپے

آٹھ شماروں کی قیمت: ۳۵۰ روپے

بینک ڈرافٹ کے ذریعے رقم بھیجنے کے لیے پتا

B-140, Sector 11-B,
North Karachi Township, Karachi 75850

امریکا، کینیڈا، یوروپ اور مشرق وسطیٰ

چار شماروں کی قیمت: ۲۵ امریکی ڈالر

آٹھ شماروں کی قیمت: ۴۵ امریکی ڈالر

رقم بھیجنے کے لیے پتا

Dr Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street,
Madison, Wisconsin 53705, USA

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب

گابریل گارسیا مارکیز

[illegible]

[illegible]

منتخب کہانیاں

[illegible]

[illegible]

مارکیز کی شخصیت اور حالاتِ زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: ۳۰۰ روپے

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

قیمت: پچھتر روپے

آج کی کتابیں
بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار:

مکتبہ دانیال صدر، کراچی
ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز صدر کراچی
کلاسیک شاہراہ قائد اعظم لاہور
پاکستان بکس، ۱۰ [illegible]